5

رابطہ ادبِ اسلامی (عالمی) کا

سہ ماہی اردو ترجمان

کاروانِ اَدب

بانی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مدیر مسئول

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

مرکزی دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی)

سہ ماہی کاروانِ ادب اسلامی

﴿مجلس مشاورت﴾

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی، لکھنؤ — مولانا سید محمد واضح رشید ندوی، لکھنؤ

پروفیسر محمد اجتباء ندوی، دہلی — پروفیسر محمد راشد ندوی، علی گڑھ

مولانا حافظ فضل الرحیم صاحب — پروفیسر ظہور احمد اظہر

ڈاکٹر محمود الحسن عارف — مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

﴿مدیر مسئول﴾

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم شعبۂ برصغیر)

مجلس ادارت

پروفیسر محسن عثمانی، C.I.E.F.L. حیدرآباد

ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی ندوی، اے، ایم، یو، علی گڑھ

مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ

ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ

﴿معاون انتظامی﴾

اقبال احمد ندوی

﴿معاون طباعت﴾

انیس احمد ندوی

﴿کمپوزنگ﴾

محمد نظام الدین ندوی

طباعت: کاکوری آفسیٹ پریس۔ لکھنؤ

زرِ تعاون

قیمت فی شمارہ :......... ۴۰/روپے، اس شمارہ کی قیمت ۱۲۰/روپے

سالانہ برائے ہندوستان:...................... ایک سو پچاس روپے

پاکستان و بنگلہ دیش:...................... ۳۰۰/روپے یا دس امریکی ڈالر

ان کے علاوہ دیگر ممالک :...................... چار سو روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں: RABITAT-AL-ADAB-AL-ISLAMI (INDIA)

صدر دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳ ندوۃ العلماء لکھنؤ

فہرست مضامین

جلد ۱۲، ۱۳		جنوری تا ستمبر ۲۰۰۶ء		شمارہ ۴، ۱۔۲

عناوین		صفحہ نمبر
منزل بہ منزل	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۵

مقالات

ادب اسلامی "تخیل اور محرکات"	مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۸
مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم اور اسلامی نشأۃ ثانیہ	مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری	۱۴

شعر و ادب

غزل	نثار عباسی	۳۴
غزل	تابش مہدی	۳۵

رفتارِ ادب

سکریٹری رپورٹ غازیپور سمینار (نومبر ۲۰۰۵ء)	مولانا واضح رشید ندوی	۳۷
رپورٹ مذاکرۂ علمی (نومبر ۲۰۰۵ء)	مولانا صدرالحسن ندوی	۴۹

منتخب مقالات مذاکرۂ علمی (۲۳)

اردو زبان و ادب کی تشکیل میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا حصہ

منعقدہ باب العلوم، کلکتہ

بتاریخ : ۱۲۔۱۳ر فروری ۲۰۰۵ء

خطبۂ استقبالیہ	قاری اسماعیل ظفر	۵۸
اردو زبان و ادب پر اسلامی اثرات	مولانا واضح رشید ندوی	۶۳
اردو زبان و ادب پر عربی کے اثرات	ڈاکٹر نسیم اختر ندوی	۹۵

اردو زبان وادب کی تشکیل میں صحافت کا حصہ	عارف عزیز	۱۰۲
اردو لسانیات اور المبین، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمات کا جائزہ	پروفیسر عبد الباری	۱۰۸
اردو کے سوانحی ادب کی تشکیل میں پرانے چراغ کا حصہ	مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۱۱۷
اردو زبان وادب کی تشکیل میں غازیپور کا حصہ	مولانا عزیز الحسن صدیقی	۱۳۵
اردو زبان وادب کی تشکیل میں شمالی یوپی کا حصہ	مولانا عبد اللہ مغیثی	۱۷۱
اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں خطۂ اودھ کا حصہ	مولانا اقبال احمد ندوی	۱۹۵
بنگال میں اردو زبان وادب کا ارتقاء	سید علی	۲۰۸
اردو زبان وادب کی تشکیل میں ارض بنگالہ کا حصہ	مولانا صباح اسماعیل ندوی	۲۱۸
بنگال وآسام میں اردو زبان وادب کی تشکیل	مولانا سید محمود حسنی ندوی	۲۲۸
خطۂ جھارکھنڈ میں اردو زبان وادب کا ارتقاء	مولانا شریف احسن مظہری	۲۴۶
بھوپال میں اردو	مولانا سید مشتاق علی ندوی	۲۵۷
اردو زبان وادب کی تشکیل میں سلطنت خداداد کا حصہ	مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی	۲۶۴
اردو زبان وادب کی تشکیل میں دکن کا حصہ	مولانا عبد الباسط ندوی	۲۶۸
اردو زبان وادب کی تشکیل میں اورنگ آباد دکن کا حصہ	پروفیسر عبد الوہاب جذب	۲۷۸
مرہٹواڑہ اور اردو	مولانا محمد ریاض الدین فاروقی	۲۹۳
مرہٹواڑہ کی ادبی اور لسانی خدمات	مولانا محمد معز الدین فاروقی	۳۰۲
اردو زبان وادب کی تشکیل میں نیپال کے مختلف علاقوں کا حصہ	مولانا محمد فرمان ندوی نیپالی	۳۱۷
ہندو نیپال کے سرحدی اضلاع میں اردو جرائد کی فکری وادبی قدر وقیمت کا جائزہ	ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی	۳۳۵
اردو زبان وادب کی تشکیل میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا حصہ	عبد الماجد ندوی مظفر نگری	۳۹۷

(مولانا) سید محمد رابع حسنی ندوی

منزل بہ منزل

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا صدیوں میں پھیلا ہوا شاندار دور رہا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اہل علم حضرات نے ملک کے سماجی اور اخلاقی پہلو میں اپنی رہنمائی اور تعلیم و تربیت کے ذریعہ بڑا اثر ڈالا، ملک میں ایک طرف تو حکومت کی زمام کار مسلم حکمرانوں کے پاس تھی، اور وہ سیاسی اور حکومتی ذرائع سے ملک پر اثر ڈالتے تھے، دوسری طرف بلاد عربیہ اور ترکستان و خراسان سے علماء اور بزرگان دین کی ایک تعداد اپنے علاقوں کے سیاسی و غیر سیاسی حالات کی ناسازگاری کے باعث مختلف وقتوں میں ہندوستان آتی رہی، ان میں جذبۂ دعوت و تربیت جس کے وہ حامل تھے ہندوستان کی غیر مسلم آبادی کے سامنے دین حق کا تعارف کرانے اور اسلامی ہمدردی و مدارات کا مظاہرہ کرنے کا جو جذبہ تھا اس کے اثر سے اس ملک کی غیر مسلم آبادی مسلمانوں سے اور اسلام سے مانوس ہوتی چلی گئی۔ مسلم حکمراں عام طور پر ترکستان،

خراسان اور منگولیا کی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے، اور یہ علاقے عام طور پر فارسی زبان کو اختیار کیے ہوئے تھے، اس طور پر کہ ہندوستان کی علمی و سیاسی زبان فارسی رہی، لیکن عوام سے ارتباط کے تقاضے سے مقامی زبانوں سے اس کا امتزاج ہوتا رہا، اور اردو زبان وجود میں آگئی، دوسرے عربی و فارسی اور مقامی بھاشا کے الفاظ اور زبان کے ضوابط پر مشتمل تشکیل پائی۔

ہندوستان ایک وسیع ملک تھا، اس کی وسیع تر حکومت آسام سے افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی، اور جنوبی ہندوستان کا بھی بڑا جز اسی میں شامل تھا، یہ علاقے مقامی طور پر مختلف رابطوں پر مشتمل تھے۔ مشترکہ زبان حکومت کے اثر سے فارسی تھی، عوامی سطح پر حالات کے تقاضہ سے اردو کی تشکیل ہوئی، اور اس سے ایک حد تک مشترک کام لیا جانے لگا، اور ایک خاص حد تک اردو ہندوستان کے مختلف حصوں میں استعمال ہونے لگی۔

مختلف علاقوں میں اس کی ترویج اور اس سے فائدہ اٹھانے کا کام اپنے اپنے ڈھنگ پر ہوا، اردو کا رواج آہستہ آہستہ بڑھنے کے ساتھ اردو فارسی کی قائم مقامی کرنے لگی، اور بتدریج اردو نے فارسی کی جگہ مشترکہ ملکی زبان کی حیثیت سے اختیار کرلی، اور اس میں علمی کام بھی بتدریج کیا جانے لگا، اور حکومت کے کاموں میں بھی اس کو بتدریج استعمال کیا جانے لگا۔ اس طریقہ سے وہ مسلمانوں کے اقتدار کے آخری حصہ میں ملک کی باقاعدہ زبان بن گئی، جس میں انتظامی اور علمی وادبی تینوں طرح کے کام انجام دیئے جانے لگے، اور اس نے ایک اہم زبان کا مقام اختیار کرلیا اور بتدریج

اس میں بڑا علمی وادبی سرمایہ بھی اکٹھا ہوگیا۔

اردو کے وجود میں آنے اور ترقی کرنے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا حصہ رہا، اوراس کی بنیاد پراس کی خصوصیات میں تنوع بھی پیدا ہوا، اوراس کوترقی دینے والوں نے اپنے اپنے علاقے کی اچھی نمائندگی کی۔

رابطہ ادب اسلامی نے کلکتہ میں فروری ۲۰۰۵ء میں منعقد کئے جانے والے سیمینار میں اسی کو موضوع بنایا اور شرکاء سیمینار کو" اردو زبان وادب کی تشکیل میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا حصہ" عنوان دیا، اور الحمدللہ سمینار میں شرکاء نے اپنی اچھی کاوش پیش کی۔اس میں جو مضامین پیش کئے گئے ان کا ایک انتخاب ہمارے اس تازہ شمارہ میں دیا جارہا ہے جو امید ہے کہ قارئین کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

رابطہ ادب اسلامی الحمدللہ ۲۵ سال سے دنیا کے مختلف حصوں میں ادب کے اسلامی تصور کے دائرہ میں مفید سیمینار منعقد کرتا رہا ہے، جس کے ذریعہ علمی وادبی کاوشیں بھی سامنے لائی جاتی ہیں، اوراس طرح اسلامی ادب کی جو صدا ۱۹۸۱ء کے عالمی سیمینار کے موقع پر عالمی سطح پر بلند کی گئی تھی وہ الحمدللہ عالمی سطح پر اپنا اثر دکھارہی ہے، متعدد عرب وغیر عرب مسلم ممالک میں ملکی سطح پر دفتر بھی قائم ہوچکے ہیں جو اپنے اپنے علاقہ میں اسلامی ادب کے تقاضوں کی طرف توجہ کررہے ہیں۔اوراپنے وسائل کے لحاظ سے خدمت انجام دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور قوت عطا فرمائے۔آمین۔

☆☆☆☆☆

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی
(ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء)

ادب اسلامی ”تخیل اور محرکات“

ادب اسلامی کا تصور اپنے وجود کے لحاظ سے کوئی جدید تصور نہیں ہے البتہ ذہنوں میں یہ تصور اپنے صحیح خط وخال کے لحاظ سے زیادہ واضح نہیں ہوسکا، چنانچہ بعض حضرات ادب اسلامی کا مطلب صرف ایک تبلیغی قسم کا ادب سمجھتے ہیں اور بعض حضرات ادب اسلامی سے صرف تحریک اسلامی ادب مراد لیتے ہیں۔اسی لئے بعض حضرات کے ذہنوں میں ادب اسلامی کے متعلق تنگ دلی اور قدامت پرستی کا تصور ہے اور بعض حضرات اس کو جزوی اور جماعتی قسم کا اسلامی ادب سمجھتے ہیں۔

ادب اسلامی کے متعلق ایک خیال یہ بھی پیدا ہوتا رہا کہ اس میں اسلام کی نسبت اسی طرح کی ہے جیسی ان اصطلاحات کے ساتھ ہو جاتی ہے جو مسلمانوں کے

قومی دائرہ کے ساتھ مخصوص ہیں اور صرف قوم سے وابستگی کے معنیٰ رکھتی ہیں۔

لیکن ادب اسلامی کا جو تصور ہمارے اس پلیٹ فارم سے پیش کیا جارہا ہے وہ ان مذکورہ بالا مطالب سے وسیع و بلند ہے، وہ محدود جماعتی یا قومی دائرہ میں یا ایک تنگ دائرہ میں بند نہیں ہے۔البتہ وہ ایسا ادب ہے جس کی اپنی قدریں ہیں اور اپنا مزاج ہے۔وہ ان قدروں اور اس مزاج کا پابند ہے۔لہٰذا ان ہی قدروں اور مزاج کے پیمانوں سے اس کو ناپا جائیگا۔اور ان ہی کے مطابق اس کا تنقیدی عمل ہوگا۔

یہ مزاج اور قدریں ہم کو اولاً اسلام کی تعلیمات سے ملی ہیں اور ان تعلیمات کے مطابق جو ادبی تخلیقات ہماری چودہ سو سالہ تاریخ میں وجود میں آئی ہیں ان سے ہم کو حاصل ہوئی ہیں۔اس طویل ادبی ورثہ میں تقریباً وہ تمام اصناف ادبیہ ہم کو مل جاتی ہیں جن کا جیتی جاگتی اور مختلف پہلوؤں پر مشتمل زندگی سے تعلق ہے۔اور اس طور پر ہم کو ادب اسلامی کو متنوع پہلو رکھنے والی زندگی کا تصویر کے طور پر دیکھنے اور پرکھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔

ادب اسلامی کا سب سے اول اور سب سے بڑا رہبر قرآن مجید ہے۔پھر یہ ادب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں صاف طریقہ سے جھلکتا ہوا ملتا ہے اس میں اس کے متنوع قسم کے نمونے ہم کو نظر آتے ہیں۔ادب اسلامی کے اقسام انسانی زندگی کے اقسام کی طرح ہیں، لیکن وہ اپنی قدروں اور اپنے بنے ہوئے مذاق کے ساتھ مربوط ہے۔خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب میں تنوع ہے، جو آپ کی زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کی ترجمانی کرتا ہے۔آپ کی حیات طیبہ میں بحیثیت رسول اور انتہائی متدین فرد کے مختلف پہلو ملتے ہیں تو بحیثیت انسان کے بھی

متعدد پہلو ملتے ہیں جن میں ان پہلوؤں کے تعلق سے انسانی مزاج کے نقوش صاف ابھرے نظر آتے ہیں۔اور چونکہ آپ کے کلام میں بلاغت اور ادبی طاقت بدرجہ اتم تھی اس لئے آپ کی زبان فیض ترجمان ان تمام پہلوؤں کی ادبی عکاسی بخوبی کرتی ہے۔اور اس طرح آپ کی زندگی کے حالات واحساسات کی ترجمانی خود آپ کے کلام سے بخوبی ہوتی ہے۔یہ ایک سرمایہ ادبی ہے جس کا جائزہ لینے سے بے شمار ادبی شہ پارے ہم کو ملتے ہیں اور ان ہی سے وہ اوّلین قدریں اور مزاج ہم کو معلوم ہوتا ہے جو ادب کے اسلامی تصور کا دستور اور رہنما قرار پاتا ہے۔حالات اور احساسات کی جو ادبی تصویریں آپ کے کلام سے ابھری ہیں ان کی صرف ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے جو باوجود عربی سے اردو میں ترجمہ ہونے کے اپنی طاقت اور چمک سے محروم نہیں ہوئی ہے۔

غزوۂ حنین میں مسلمانوں کو جو مال غنیمت حاصل ہوا تھا وہ خاصا تھا۔اس کی تقسیم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد ایسے پہلوؤں کی رعایت فرمائی جو اسلام کی دعوتی اور حربی مصلحتوں پر مبنی تھے۔مثلاً اہل مکہ اور ان کے قریب کے قبائل جو پورے عرب میں سب سے زیادہ بااثر اور مسلمانوں کے دشمنوں میں زیادہ سخت دشمن بنے ہوئے تھے۔مسلسل شکستوں کے اثر سے اب ایسی منزل پر پہونچ گئے تھے کہ اسلام کی طاقت کے سامنے جھکنے لگے تھے۔اس موقع سے ان کی مالی دلداری ایک اچھی مصلحت تھی۔چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے ان اہم اشخاص کو جن کو مانوس اور اسلام سے قریب کیا جاسکتا تھا۔مال غنیمت میں اس سے عطیے عطا فرمائے اور اس طرح ان کی دلداری کی۔حضرات انصار جو اہل مدینہ تھے اور اسلام کے لئے ہر

طرح کی قربانی دے رہے تھے۔ اس موقع پر مال غنیمت میں سے کچھ زیادہ نہ پاسکے، ان کو بشری بنیاد پر یہ احساس ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سابق ہم وطنوں کے ساتھ زیادہ ہمدردی کی اور اپنے نئے ساتھیوں یعنی انصار کو نظر انداز کیا۔ آپ کو اس احساس کی خبر ملی تو آپ نے حضرات انصار کو جمع فرمایا اور ان کے سامنے ایک مؤثر تقریر فرمائی۔ یہ تقریر ادبی طاقت کی پوری نظیر ہے کیونکہ اس کا موضوع جذبات سے تعلق رکھتا تھا اور خود آپ کے جذبہ واحساس میں بھی حرکت پیدا ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا:

''حضرات انصار وہ کیا چرچا ہے جو تم لوگوں کے بارے میں مجھ کو پہونچا ہے، وہ کیا گرانی ہے جو تمہارے دلوں نے محسوس کی۔ میں جب تمہارے پاس آیا تو کیا تم بھٹکے ہوئے اور گمراہ نہ تھے، پھر خدا نے میرے ذریعہ تم کو صحیح راہ عطا کی۔ اور کیا تم محتاج اور تنگ دست نہ تھے پھر خدا نے تم کو میرے ذریعہ غنی بنایا۔ اور کیا تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن نہ تھے؟ تو خدا نے میرے ذریعہ تمہارے دلوں میں آپس کا تعلق پیدا کیا۔ انصار نے کہا اللہ اور اس کے رسول حقیقتاً بڑے محسن اور صاحب فضل ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کیا تم مجھے جواب نہیں دیتے اے حضرات انصار: انہوں نے کہا ہم آپ کو کیا جواب دیں اے اللہ کے رسول! احسان وفضل تو اللہ اور اس کے رسول ہی کا ہے۔ آپ نے فرمایا! کیوں نہیں؟ بخدا تم اگر چاہو تو کہہ سکتے ہو اور سچ کہو گے اور میں تمہاری تصدیق

بھی کروں گا، کہ آپ ہمارے پاس آئے تو اس حال میں تھے کہ جھٹلائے گئے تھے۔ ہم نے آپ کی تصدیق کی اور تعاون و مدد سے محروم تھے تو ہم نے آپ کی نصرت کی اور اپنی جگہ سے نکالے ہوئے تھے، ہم نے آپ کو جگہ دی اور محتاج و پریشان حال تھے، ہم نے آپ کی ہمدردی کی۔ آپ نے فرمایا کہ اے حضرات انصار! تم کو مجھ سے دنیا کے ایک حقیر فائدہ کی خاطر شکایت ہوئی ہے۔ دنیا کا یہ حقیر فائدہ جس کے ذریعہ میں نے کچھ لوگوں کو مانوس کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ وہ اسلام قبول کرلیں اور تم کو میں نے تمہارے اسلام کے سپرد کیا ہے۔ اے حضرات انصار! کیا تم اس پر خوش نہیں کہ دیگر لوگ اپنے ساتھ بھیڑ، بکری اور اونٹ لے جائیں اور تم اپنے گھروں کو اللہ کا رسول لے کر جاؤ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد کی جان ہے، تم جو دولت لے کر لوٹو گے وہ اس دولت سے بہتر ہے جس کو وہ لے کر لوٹیں گے، اگر ہجرت کا عمل مقدر نہ ہوتا تو میں انصار ہی میں کا ایک فرد ہوتا۔ اور اگر لوگ ایک گھاٹی اور وادی میں سے گذر رہے ہوں اور دوسرے لوگ کسی اور گھاٹی اور وادی سے، تو میں انصار ہی کی گھاٹی اور وادی سے گذروں گا۔

انصار جسم سے وابستہ لباس کی طرح ہیں اور دیگر لوگ اوپر کے اضافی لباس کی طرح ہیں۔ اے اللہ رحم فرما انصار پر، انصار کی

اولاد پر اور انصار کی اولاد کی اولاد پر۔ راوی کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا فرمانا تھا کہ لوگ رونے لگے حتیٰ کہ ان کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہوگئیں اور سب نے کہا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم اپنے حصہ میں لے جائیں گے۔ ہم اس تقسیم اور اس قسمت پر راضی ہیں"۔ (ابوذر غفاری۔ بخاری)

اس طرح کی اور بھی مثالیں ہیں، جن میں آپ کا کلام ادبی اثر و طاقت سے بھرپور ہے اور وہ زندگی کے مختلف انسانی پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے اس طرح کی مثالیں آپ کے بعد صحابۂ کرام اور دیگر متعدد حضرات کے کلام میں ادب کی اسلامی قدروں اور مزاج کے ساتھ نمایاں ملتی ہیں۔

ادب اسلامی کے اس طرح کے نمونے برابر پڑھے جاتے رہے ہیں، لیکن اس تصور کے ساتھ کم ہی پڑھے گئے۔ یہ ادب کے ممتاز اور معیاری نمونے ہیں۔ مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ ادب کا جو غیر مفید اور بے بہا طرز بن گیا تھا۔ یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ ادب کے لئے یہی نمائندہ طرز ہے اور ادب کو اگر شائستہ دائرہ میں لایا گیا تو گویا وہ اپنی ادبی خصوصیات سے محروم ہو جائے گا۔

☆☆☆☆☆

☆☆☆

محمد خالد ندوی غازیپوری

مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم
اور
اسلامی نشأۃ ثانیہ

تحقیق وتصنیف، علم وادب کسی ایک ذات میں مشکل سے جمع ہوتے ہیں، برصغیر پاک وہند میں علامہ شبلی نعمانی اس گروہ کمیاب کے نمائندہ ہیں، وہ اعلی درجہ کے عالم اور بلند پایہ محقق ہی نہ تھے ایک نغز گو شاعر اور ژرف بیں نقاد بھی تھے۔

دارالمصنفین اعظم گڑھ کو یہ روایت ورثہ میں ملی اور سید سلیمان ندوی اور شاہ معین الدین سے ہوتی ہوئی سید صباح الدین عبدالرحمٰن تک پہونچی، آج وہ ہمارے درمیان نہیں رہے لیکن علم وادب، تاریخ وتحقیق، تحریر وصحافت اور تصنیف وتالیف کے ایوانوں میں ان کے نگارشات کی تنویر سے روشنی حاصل کی جاتی رہے گی، وہ اپنے ذاتی اور انفرادی دائرے سے نکل کر ایک ایسے علمی اور تحقیقی مرکز کے نمائندے

بن چکے تھے جس نے برصغیر ہی نہیں بلکہ ایشیا میں مسلمانوں اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں اور نہضت و بیداری میں تاریخ ساز کردار ادا کیا، اور اسلام پر مکمل اعتماد بحال کرنے اور مسلم نوجوانوں کے دل سے احساس کمتری کے زنگ کو کھرچ کر نکال دینے میں اہم رول ادا کیا۔ بلاشبہ اس ادارے کے ترجمان اور نقیب مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم تھے جنہوں نے اس تاریخ ساز ادارے کی چوکھٹ پر زندگی کی ترپین بہاریں گزاریں اور انیس سال تک سربراہی کرتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد کی اور اپنے پیچھے جدید منہاج علم وفکر کی ایک ایسی تحریک چھوڑ گئے جو ثقافت، تمدن اور تہذیبی روایات کے سائنٹفک شعور کا آئینہ دار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دبستان شبلی کے جملہ خصائص ان کی ایک ذات میں جمع ہو گئے تھے۔ جناب معصومی صاحب نے ان کے ناگہانی حادثۂ وفات پر اشعار کے آبگینوں کی شکل میں خراج عقیدت کی جو سلسبیل پیش کی ہے وہ تاثراتی ادب کا ایک حصہ ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

فروغ چہرۂ تحقیق کیوں نہ ماند پڑے
کہ یک بیک ہوئے رحلت گزیں صباح الدین
وہ باغ دسنہ کا سرو سبز پوش و بلند
ربیب سید[۱] والا، حبیب شاہ[۲] معین
وہ بزم ہائے گذشتہ کا محرم اسرار
نگہ میں جس کی بہم صد نگار خانہ حسیں
وجود اس کا تھا دارالمصنفین شعار
نمود اسکی معارف نمائے صدق و یقیں

[۱] علامہ سید سلیمان ندویؒ [۲] شاہ معین الدین ندویؒ

وہ جس کی شیوہ بیانی اور جستجو کے طفیل
بسی رہیں گی نظر میں محافل پیشیں
وہ جس کے خامۂ گل ریز کی روانی سے
ورق ورق ہیں فروزاں صحائف رنگیں
برنگ خاص یگانہ وہ پیکر اخلاص
رہ وفا کا مسافر بشیوۂ تمکیں
فراز گومتی رکشا سے اس کا گر پڑنا
اجل کا تھا وہ بہانہ جو بن گیا سنگیں
عزیز اس کو تھی دارالمصنفین کی خاک
وہ بعد مرگ بھی ہے اس کی خاک ہی کا مکیں
سدا بہار ہیں سب اس کی حد میں یارب
مقام اس کا شہیدوں کی ہو بہشت بریں

وطن مالوف:۔ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا وطن دسنہ تھا جو صوبہ بہار کا ایک مردم خیز قصبہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں کی سرزمین سے وہ نامور ہستیاں اٹھیں جنہوں نے علم وادب، فکروفن، تحقیق وتصنیف کے ایوانوں کو نئے انداز سے ترتیب دینے میں عظیم خدمت انجام دی جن میں علامہ سید سلیمان ندوی، پروفیسر نجیب اشرف ندویؔ، سید شہاب الدین دسنوی، سعیدالحق، مولانا ظفر احمد ندویؔ اور ڈاکٹر وصی احمد انصاری (پاکستان کے مشہور سرجن) قابل ذکر ہیں۔

موصوف اس قدیم قصبہ میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دیسنہ کے قدیم مکتب میں حاصل کی۔ ۱۹۲۵ء میں میٹرک امتحان پاس کیا۔ ۱۹۲۷ء میں مظفر پور سے ایف۔اے کرنے کے بعد پٹنہ آئے اور ۱۹۲۹ء میں پٹنہ کالج سے بی۔اے کیا۔ بعدازاں مدرسہ شمس الہدیٰ میں داخل ہوئے لیکن بیماری کے طویل سلسلہ کی وجہ سے تعلیم مکمل نہ کر سکے اور واپس دیسنہ چلے گئے۔ صحت یابی کے بعد وہ علی گڑھ گئے اور مسلم یونیورسٹی سے بی۔ٹی کی سند حاصل کی۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی علمی اور تحقیقی زندگی کا آغاز دارالمصنفین سے ہوتا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے فیض صحبت اور برکات تربیت سے ان میں علمی و تحقیقی ذوق اور انشا پردازی کا شوق پیدا ہوا۔ اس شوق کو مہمیز کر کے صحت مندانہ کردار کا آئینہ دار بنانے میں علامہ سید سلیمان ندوی زلف تحقیق و انشاء کی کس طرح مشاطگی کرتے رہے، خود صباح الدین عبدالرحمٰن کی زبانی ملاحظہ فرمائیں:

> ''ایک مرتبہ علامہ نے ایک مضمون لکھنے کی غرض سے مجھے چند کتابیں دیں اور کہا کہ ان کے مطالعہ کے بعد اس پہلو پر مضمون تیار کرو، میں ڈبل ایم۔اے کر چکا تھا، چنانچہ نوجوانی کے نشہ میں اور یونیورسٹی کی تعلیم کی دھونس جمانے کی خاطر بڑی محنت سے مضمون تیار کیا۔ علامہ نے جب اس پر نظرثانی کی تو پورا مضمون بدلا ہوا تھا، مجھے دیکھ کر بڑی شرم آئی، اس موقع پر علامہ نے کہا کہ چھوٹے سے چھوٹے جملے اور کم سے کم الفاظ سے زیادہ سے زیادہ

معانی اور خیال پیش کرنے کی کوشش کرو، گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا نام "علم" ہے"۔

ادب وتاریخ سے مولانا کو زمانۂ طالب علمی سے لگاؤ تھا، دارالمصنفین کے ماحول نے اس طبعی میلان کو اور زیادہ تقویت دی، اس ادارے میں انہوں نے تاریخی موضوعات کو اپنے تتبع وتحقیق اور تصنیف وتالیف کا ہدف بنایا۔ برصغیر میں اسلامی عہد کی تاریخ ان کا خاص موضوع تھا۔ اس دور سے متعلق مرحوم کا مطالعہ بہت ہی وسیع اور غائر تھا، لہذا اس عہد زریں کے بارے میں ان کی چند بیش بہا تصانیف شائع ہوئیں، مثلاً بزم مملوکیہ، بزم تیموریہ، بزم صوفیہ، ہندوستان کے عہد مغلیہ کی ایک جھلک، ہندوستان کے عہد وسطی کا فوجی نظام، رزم نامہ، مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، جیسی معرکۃ الآرا اور شاہکار کتابیں شامل ہیں، جو اسلامی زمانے کی سیاسی ثقافتی، علمی وادبی، احوال وآثار کا بڑا واضح اور جاندار نقشہ پیش کرتی ہیں (فکرونظر ۵۲۔ از ڈاکٹر محمود الرحمان)

ان کتابوں کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو بظاہر یہ مختلف موضوعات پر مشتمل کتابیں ہیں۔ لیکن مصنف کے ذہن وفکر کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان ساری کتابوں کا موضوع صرف ایک اور صرف ایک ہے، اور وہ ہے اسلام اور مسلمانوں کے تمدن کی آفاق گیر وسعت اور تاریخی دلائل کی روشنی میں اس حقیقت کا اثبات۔

مغرب نے علمی میدانوں میں ہمارے خلاف جو متعدد محاذ تیار کئے تھے ان میں ایک سب سے زیادہ خطرناک محاذ ایسا بھی تھا جس سے ہمارے تاریخی اور تمدنی حقائق کو مسخ کرنے کا سلسلہ بڑی تیزی سے جاری تھا، دشواری یہ تھی کہ اس محاذ پر تنہا

اہل مغرب ہی نہیں بلکہ ہندو بھی ان کے حلیف بن گئے تھے اور ہمارے تمدن اور طرز حیات کے بارے میں تاریخ کے نام پر یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اسلام اور مسلمانوں کا ارتقاء عالم انسانی کے حق میں عدل، مساوات، اخوت وشائستگی اور وسیع النظری کی اعلیٰ روایات کے ساتھ نہیں بلکہ ظلم وحشت اور بربریت کے ساتھ ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ ہمارا ذہن اور ہمارا عقیدہ اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کی بھیانک تصویر دیکھ کر اور اپنی تاریخ پر شرمسار ہو کر یہود ونصاریٰ کے سامنے معذرت خواہانہ انداز میں سرنگوں ہو جائے اور وہ ضمیر واعتقاد اور اسلاف کے علمی ورثہ پر ہمارا اعتماد سلب کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور دنیا کو علمی اور سائنسی بنیادوں پر چیلنج کرنے والی سب سے بڑی قوم فکری محاذ پر پسپا ہو کر اپنے امتیازات کھو بیٹھے۔ یہ تھا وہ محاذ جس کو سامنے رکھ کر اسلام کی قدروں کو مستحکم کرنے کی خاطر اس کی نشاۃ ثانیہ کا سامان فراہم کرنا ضروری تھا، چنانچہ مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی ساری کتابیں اس ذہنی پس منظر کے ساتھ وجود میں آئیں اور اپنے تحقیقی منہاج اور منفرد اسلوب کی بناء پر مقبول ہوئیں۔ ان مؤلفات کے مضامین ومشمولات پر دوست ودشمن دونوں متوجہ ہوئے، یہ ان کے اخلاص کا بانکپن اور ان کی علمیت کی فتح تھی۔

اس سلسلہ کی پہلی کتاب بزم تیموریہ تھی جو دو ضخیم جلدوں میں سامنے آئی اور پہلی بار یہ حقیقت مبرہن ہو کر نمایاں ہوئی کہ تیموری سلاطین صرف علم پرور ہی نہ تھے بلکہ زبان وادب کے بھی محسن تھے اور ان کے عہد کو بجا طور پر علمی وادبی اعتبار سے زریں عہد کہا جا سکتا ہے۔ کتاب کے تحقیقی مقام ومرتبہ کا اندازہ صرف اس بات سے کیا

جاسکتا ہے کہ ایک ہندوستانی ڈاکٹر کو محض اس کے فارسی ترجمے پر تہران سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ ایک خط میں مصنف کو اس تصنیف کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

''جو تصویر تم نے کھینچی ہے وہ نہایت عمدہ ہے اور مصنف کے کمالات تعریف کے مستحق ہیں''۔

مکتوب سید سلیمان ندوی بنام سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۳ر دسمبر ۱۹۴۸

ایک ہی سال کے بعد دوسری کتاب بزم صوفیہ کے نام سے وجود میں آتی ہے جو اپنی علمی سطح کے اعتبار سے تذکرہ و تاریخ سے صرف بلند ہی نہیں بلکہ مواد و تحقیق کے اعتبار سے مسلم تمدن کے مختلف موضوعات پر کام کرنے کے لئے اہم حوالے کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔

تاریخ و تمدن کے مطالعہ کے سفر میں ایک طالب علم کو جو طبقہ اپنے اثر و نفوذ، اپنے فلسفہ و فکر اور اپنے علمی کردار کے اعتبار سے نہایت ممتاز مقام پر نظر آتا ہے وہ بلاشبہ صوفیہ کا طبقہ ہے جس کا قابل ذکر علمی جائزہ یا تو پروفیسر نکلسن نے لیا۔ یا پھر سید صباح الدین عبدالرحمٰن اور خلیق احمد نظامی نے، اسی بزم صوفیہ کی بدولت ملفوظات کے ادب کی ہمہ جہت قدر و قیمت کا صحیح اندازہ ہوا اور ملفوظات کی علمی، افادی اور تاریخی حیثیت کا تعین بھی ہوا۔ اس باب میں بعض مؤرخین کے تسامحات پر بھی فکر انگیز بحث ملتی ہے، نیز مجموعی طور پر صوفیہ کے اسلامی کردار کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے بزم صوفیہ لکھنے کی جو غرض و غایت بیان کی اس کی

ابتداءتمہید میں وہ یوں کرتے ہیں:

''صحابۂ کرام، تابعین اور تبع تابعین کی طرح صلحاء اور اخیار امت کی زندگی بھی مسلمانوں کے لئے نمونہ ہے اس لئے دارالمصنفین کے سلسلہ سیر الصحابہ اور تابعین کے بعد سیرت صوفیہ کی بھی ضرورت تھی، یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔راقم سطور تاریخ ہند کا ادنی طالب علم ہے اس لئے اس کتاب میں یہ بھی مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خانقاہ کے بوریہ نشینوں نے اپنے عہد کے مسلمانوں کے مذہب، اخلاق، معاشرت اور سیاست کو کس طرح سنوارا، تاریخ ہند کے مطالعہ میں عموماً مسلمان حکمرانوں کے افعال وکردار سے اس زمانے کے مسلمانوں کے اخلاق وسیرت وکردار کا اندازہ لگایا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ ہندوستان میں صلحاء اور مشائخ ہی نے اسلام کی معنوی شوکت وعظمت قائم کی، اس لئے ان کے حالات وتعلیمات کو ہندوستان کے عہد کی تاریخ سمجھنا چاہئے''۔

مولانا محمد میاں صدیقی بزم صوفیہ سے متأثر ہو کر لکھتے ہیں:

''حقیقت ایک اور صرف ایک ہے، اور وہ یہ کہ دنیا میں سب سے مؤثر آلۂ کشش نمونۂ عمل ہے، کتابوں کے اوراق اوران کے بے جان حروف کو متحرک اور سرگرم عمل حقیقتوں پر غالب آتے

بہت کم دیکھا گیا ہے، یہی وجہ تھی کہ بالخصوص برصغیر پاک وہند میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کا سب سے بڑا ذریعہ صوفیاء کرام ہی ہیں۔ یہی وہ محرک تھا جس نے برصغیر کے معروف صاحب قلم اور تاریخ داں جناب صباح الدین عبدالرحمان کو برصغیر کے صوفیہ کا تذکرہ لکھنے پر آمادہ کیا''۔

بقول مولانا عبدالماجد دریابادی علیہ الرحمۃ:

''ذاتی سرگزشتوں کی داستان کسی کی بھی ہو دلچسپ ہوتی ہے چہ جائیکہ ان بزرگوں کی سرگزشت جو انسانیت کے پتلے، تسلیم ورضا کے بندے ومحبوبیت کے مجسمے تھے، دلآیزی ان کے تذکروں میں نہ ہوگی تو کہاں ہوگی ''ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات سیجعل لھم الرحمان ودا ''اور پھر جب کہ داستان گو خود داستاں سرائی سے واقف اور اس فن میں منجھا ہوا ہو''۔

بزم صوفیہ میں جن بزرگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ اپنے رتبے اور خدمت اسلام کے لئے بلا شبہ بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ان کی تعداد انیس ہے جن کا ذکر پانچ سوبیس صفحات پر مشتمل ہے بزم صوفیہ کی خوبی یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے نہ صرف یہ کہ اس قسم کا کوئی تأثر نہیں پیدا ہوتا کہ صوفیہ عام طور پر شریعت کے عالم نہیں ہوتے تھے یا علماء ظاہر کی طرح شریعت کی اتباع نہیں کرتے تھے، بلکہ کافی حد تک اس کی نفی ہوتی ہے۔خواجہ معین الدین چشتی کے ملفوظات جو دلیل العارفین کے نام سے شائع

ہوئے ہیں، صاحب بزم صوفیہ نے یہ ملفوظ بطور سند نقل کیا ہے جس سے تصوف کی ماہیت وکیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

''تصوف نہ علم ہے نہ رسم بلکہ مشائخ۔ رحمہم اللہ۔ کا ایک خاص اخلاق ہے صوری حیثیت سے اس اخلاق کی تکمیل یہ ہے کہ سالک اپنے ہر کردار میں شریعت کا پابند ہو جب اس سے کوئی بات خلاف شریعت نہ سرزد ہوگی تو وہ دوسرے مقام پر پہونچے گا، جس کا نام طریقت ہے اور جب اس میں ثابت قدم رہے گا تو معرفت کا درجہ حاصل کرے گا اور جب اس پر بھی پختہ ہو جائے گا تو حقیقت کا مرتبہ پائے گا''۔

ایک بار خواجہ نظام الدین اولیا خلافت سے پہلے ایک مسجد میں بیٹھے کسی شرعی مسئلہ پر غور وفکر کر رہے تھے، وہاں ایک مجذوب بھی تھا وہ کہنے لگا یا مولانا نظام الدین! علم بڑا حجاب ہے خواجہ نظام الدین کے دل میں یہ بات کھٹکی کہ علم حجاب تو ہو سکتا ہے لیکن بڑا حجاب کیسے ہو سکتا ہے، خواجہ اپنے مرشد بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں پہونچے اور ان سے مجذوب کی یہ بات نقل کی، بابا فرید الدینؒ نے فرمایا حجاب دو قسم کا ہوتا ہے ایک ظلمانی دوسرا نورانی، گناہ اور برائیاں ظلمانی حجاب ہیں جو شخص ان سے توبہ کرے گا اس کے گناہ معاف کردئے جائیں گے لیکن علم ایک نورانی حجاب ہے جس کو نہ ہر شخص عبور کر سکتا ہے اور نہ اس کے کنارے سے اٹھ سکتا ہے جس وقت تک شرعی علوم میں دستگاہ نہ ہوگی خدا کی معرفت، محبت اور قربت نہیں حاصل ہو سکتی ہے۔

بابا فرید الدین گنج شکر نے ایک موقع پر اپنے مریدوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''جب ایک آدمی تین باتوں سے اجتناب کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے تین چیزیں اٹھالیتا ہے:۔

اول جو شخص زکوۃ نہیں دیتا تو اللہ تعالیٰ اس کے مال سے برکت اٹھالیتا ہے۔ دوسرے جو شخص قربانی نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس سے سکون وعافیت چھین لیتا ہے۔ تیسرے جو شخص نماز نہیں پڑھتا اللہ تعالیٰ مرنے کے وقت اس سے ایمان کو جدا کر دیتا ہے''۔

اس کتاب کا مطالعہ قاری کو یہ تأثر دیتا ہے کہ صوفیہ کی زندگی صبر وقناعت اور توکل کا مرقع تھی وہ اس علم وعمل کے جامع تھے جو ایک مومن صادق کا مقصود حقیقی ہونا چاہئے، انہوں نے اپنی ذات سے زیادہ دوسروں پر توجہ دی خود مشکل اور مصیبت میں ہوتے ہوئے دوسروں کی ضرورتیں پوری کیں، تبلیغ دین اور خدمت خلق کو اپنا شعار بنایا۔

یقیناً بزم صوفیہ سیرت وسوانح کے ذخیروں ہی میں نہیں اردو ادب میں بھی ایک گراں قدر اضافہ ہے اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ میں جن کلیدی عناصر کی ضرورت ہو سکتی ہے، برصغیر کے خصوصی حالات کے پیش نظر ان کی طرف اس کتاب سے رہنمائی بھی ہوتی ہے۔

فاضل مصنف نے اپنے گہربار قلم سے صوفیہ کی حقیقی خدمات کی پیکر تراشی ہی نہیں کی بلکہ اس ضمن میں سلاطین کا کیا رول رہا، اسلام کی خدمت میں وہ کس حد تک

پیش پیش رہے اس موضوع پر ان کی معرکۃ الآراء کتاب ''ہندوستان کے سلاطین علماء ومشائخ کے تعلقات پر ایک نظر'' ہے یہ کتاب اسلامی ہند کے مذہبی، ذہنی، فکری اور ضمناً سماجی اور ثقافتی حالات سے متعارف کراتی ہے۔ واضح رہے کہ یہ دور قریباً ساڑھے چھ سو سال پر محیط ہے، جو تیرہویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر انیسویں صدی عیسوی کے نصف اول تک پھیلا ہوا ہے اور اس عرصہ میں ۴۸؍ بادشاہ سلطنت ہند کے تخت پر متمکن ہوئے۔

فاضل مصنف نے جس مذہبی ماحول اور علمی فضا میں اس نازک موضوع پر قلم اٹھایا اس کا تقاضا تھا کہ میسر مواد کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور اس مواد کا تجزیہ کر کے ان حقائق کو ثابت کیا جائے جن سے چشم پوشی کی گئی ہے۔ لہذا فاضل مصنف نے تجزیہ کرتے وقت عام طور پر بے لاگ محاکمہ کیا اور تاریخی حقائق سے چشم پوشی یا حالات کا غلط رخ اپنانے سے جو غلط فہمیاں اہل علم کے ہاں پیدا ہو چکی تھیں، انہیں دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور اس کتاب کے ذریعے یہ حقیقت بڑی حد تک ثابت کر دی گئی ہے کہ مسلمان حکمراں، علماء اور مشائخ نے برصغیر میں دین اسلام اور انسانیت کی خدمت کی بلند پایہ مثالیں قائم کیں۔ اسی طرح ایک حقیقت پسند مؤرخ کی طرح ان انسانی کوتاہیوں اور لغزشوں کا اعتراف کیا جو بعض حکمرانوں سے سرزد ہوئیں، لیکن مجموعی طور پر انہوں نے اسلام کی انسانی خدمت اور مسلمانوں کی رواداری کو ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مختصر یہ کہ ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک

نظر اردو ادب میں ایک عمدہ اضافہ ہے، جس کے مطالعہ سے برصغیر میں اسلام کی نشو ونما اور معاشرے کے تین بڑے طبقوں کے باہمی تعلقات کھل کر سامنے آتے ہیں، جن کی بدولت اس خطہ میں اسلام کو فروغ ملا اور جن کی مساعی سے مسلمانوں کا تشخص قائم رہا اور آج تک قائم ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمان صاحب نے جہاں ہندوستان میں اسلامی تاریخ کے مختلف گوشوں کو واشگاف انداز میں پیش کیا ہے، اس پر محاکمہ کیا ہے، اس کے دوررس اثرات ونتائج کو بڑے قرینے اور سلیقے سے پیش کیا ہے اور اسلامی کردار کی روشن مثالیں لائے ہیں، وہیں انہوں نے ادبی اور فکری مضامین کے ذریعہ اسلامی معاشرہ کے قالب وروح کے مابین حسن انسجام اور اس کے تقاضوں کو بھی بیان کیا ہے، ماہنامہ معارف کے وہ مدیر بھی تھے جس کو صحافتی اور فکری افق پر علامہ سید سلیمان ندوی اور ان کے جانشینوں نے چندے آفتاب وچندے ماہتاب بنادیا تھا۔ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اس رسالہ کی فکری روح اور ادبی قالب کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کو بڑے اچھوتے اور دلکش انداز میں نبھایا۔ ان کے شذرات حالات حاضرہ کی تصویر ہوتے، ملی مسائل پر بحث ہوتی، معاشرے میں بہت سے اٹھتے ہوئے سوالات کی نشاندہی ہوتی۔ نامساعد حالات اور ماحول کی برہمی کی صورت میں حالات کے مقابلہ کے لئے پامردی، استقامت، حوصلہ مندی، شجاعت، طالع آزمائی، جانبازی، جوانمردی کی دعوت ہوتی۔ ان کی تحریروں میں اقبال کی بلند نظری، شبلی کی روشن ضمیری، علامہ سید سلیمان ندوی کی علمی متانت اور فکری رفعت کی چاندنی چھٹکی

ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہی وہ شخصیتیں ہیں جن سے براہ راست وہ متأثر ہوئے۔ لہذا ان کا فکری ارتقاء ان بزرگوں کے اسلامی افکار ونظریات کا رہین منت ہے۔ ان کا اسلوب انتہائی سادہ رواں الفاظ مختصر لیکن معانی سے پر ہوتے ہیں۔ اس میں ادب کی چاشنی اور فکر کی حلاوت ورفعت پورے آب وتاب سے جلوہ گر نظر آتی ہے۔

علامہ اقبال پر ان کے صاحب زادۂ نامدار جاوید اقبال نے زندہ رود تین جلدوں میں لکھی، زندہ رود جلد اول پر تقریظ کا آغاز دیکھیں اور سید صباح الدین عبد الرحمان کی مؤثر ادبیت پر سر دھنیں۔

علامہ محمد اقبال کے جاوید نامہ میں جو مختلف کردار ہیں ان میں ایک زندہ رود بھی ہے جو خود علامہ ہیں۔ ان کی اس سوانح حیات کا یہ نام رکھ کر ان کے لائق فرزند نے ان ہی کی طرح اپنی جدت ذہن کا ثبوت دیا ہے۔ زندہ رود کے معنی مسلسل بہتی ہوئی حیات آفریں ندی بتائے گئے ہیں۔ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اچکتی، اٹکتی، لچکتی، سرکتی، اچھلتی، پھسلتی اور بڑے پیچ کھا کر تاریخی، سیاسی اور معاشرتی واقعات کے تودوں کو چیرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

آگے دیکھئے علامہ کے شعری پیکر کا نثری روپ سید صباح الدین عبد الرحمان صاحب نے کس مؤثر انداز اور خوش سلیقگی سے پیش کیا ہے۔ رقمطراز ہیں:

> ”وہ اس وجودی تصوف سے بیزار ہو گئے جس کی حکمت ملکوتی اور علم لاہوتی میں حرم کے درد کا درماں نہیں اور جس کی تعلیم میں ذکر نیم شبی، مراقبے اور سرور ہیں مگر اس سے دل پا نگاہ مسلمان

نہیں بنی، یا اس وجودی فلسفے سے بے رغبتی ظاہر کی جس سے اسلاف کا جذب دروں حاصل ہوتا ہو نہ جس سے زمرۂ لایحزنوں میں شریک ہونے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ جس میں خرد کی گتھیاں سلجھا کر صاحب جنوں ہونے کا جذبہ پیدا ہوتا ہو یا جس میں مئے، لاالــہ الا ھو، پی کر من وتو کی تفریق مٹ جاتی ہو یا جس سے وہ فقر حاصل ہوتا ہے جس کے ہزاروں مقام میں روح قرآنی بے پردہ نظر آتی ہے''۔(اقبال ابوص ۱۰۹۔۱۱۰)

اقتباس بالا میں مبصر نے ضرب کلیم اور بال جبریل کے بالترتیب مندرجہ ذیل اشعار کا نثری روپ اوران کی تحلیل کی ہے جس سے ان کی اقبال کے فکروفن کے ساتھ گہری ہم آہنگی کی شہادت ملتی ہے جس کو ان کی فکری تشکیل کا اہم عنصر قرار دیا جا سکتا ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں۔

یہ حکمت ملکوتی، یہ علم لاہوتی
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکر نیم شبی، ترے مراقبے یہ سرور
تری خودی کے نگہ باں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

☆☆☆☆☆

عطا اسلاف کا ذوق جنوں کر
شریک زمرۂ لایحزنوں کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

☆☆☆☆☆

مٹادیا مرے ساقی نے عالم من و تو
پلا کے مجھے مئے لاالــــــہ الا ھــو

☆☆☆☆☆

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی

آگے رقمطراز ہیں:

''علامہ محمد اقبال اس لحاظ سے خوش نصیب باپ ہیں کہ ان کے لائق فرزند نے سوانح عمری لکھ کر نہ صرف ان کی روح کوخوش کیا بلکہ ان کو ایک بیش بہا اور دل نواز تحفہ پیش کیا۔ یہ وہی جاوید اقبال ہیں جن کو مخاطب کر کے ان کے والد بزرگوار نے کہا تھا۔

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر
میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

یہ تینوں (زندہ رود) کی جلدیں لکھ کر اس کے مصنف نے دل فطرت شناس کا ثبوت دیا ہے اور اپنے والد بزرگوار کی زندگی

ئے سکوت لالہ وگل سے ہم کلام ہو کر اوران کے خیالات کی شاخ اوران کے افکار کی غزل کے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر دیا ہے''۔

(اقبالیات ص ۵۵)

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن حقیقت میں اقبال کے بہت معترف تھے۔ انہوں نے جو کچھ ماہر القادری کے تعلق سے علامہ اقبال سے انکی ارادت مندی کا تذکرہ کیا ہے اس جگ بیتی میں آپ بیتی ہی کا عکس جمیل ہے۔وہ رقمطراز ہیں:

''اقبال کے بہت معترف تھے کہتے کہ میرؔ کی شاعری آہ ہے، سودا کی واہ، تو اقبال کی سمع راہ ہے۔رومیؔ نے مسلمانوں کو ولی اللہ بنانے کی کوشش کی تو اقبالؔ نے کافر کو مسلمان بنایا''۔

اقبال کی وفات پر ایک غم ناک غزل بھی لکھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کارواں خواب میں تھا بانگ درا سے پہلے
ساز میں سوز بھی تھا تری نوا سے پہلے

اللہ اللہ ترا قافلہ نطق و کلام
بال جبریل کے سائے میں ہوا گرم خرام

صرف مشرق ہی نہیں مغرب کو بھی پیغام دئے
نگہ و فکر پر اسرار خودی فاش کئے

تو کبھی شعلہ رقصاں کبھی رفتار نسیم

موج کوثر ترے اشعار کہیں ضرب کلیم

ترے شعروں میں کہیں معرکۂ بدر و حنین
کہیں ایمان براہیم کہیں عزم حسین
ترا سرمایۂ دانش تھا فقط عشق رسول

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نہ صرف علامہ محمد اقبال کے مداح و معترف تھے بلکہ وہ ان کے پیغام کو عام کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی بھی تاکید کرتے تھے۔خود رقمطراز ہیں:

''اس شاعر مشرق پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، آئندہ بھی لکھا جائے گا اور جتنا بھی لکھا جائے گا کمی محسوس ہوگی مگر انہوں نے جو پیغام دیا تھا اس پر عمل ہوا بھی کہ نہیں، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے خواب گراں سے بیدار ہوں۔وہ ناموس ازل کے امین جبرئیل و اسرافیل کے صیاد، ظاہر و باطن کی خلافت کے سزاوار، زہر کا تریاق، مہر و مہ و انجم کے حاکم، خودنگر، خودگر، خودگیر، بانگ درا، بال جبریل اور ضرب کلیم بن کر رہیں۔ اگر ان کے پیام پر عمل نہ ہو تو اس اجتماع کے دھوم دھام تزک و احتشام کے اندر ان کی روح منڈلاتی ہوئی کہہ رہی ہوگی۔

خون دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

اس فکر و تخیل کے ساتھ صباح الدین عبدالرحمٰن شمع حیات کو فروزاں کئے رہے،

اشہب خانہ کو مہمیز کرتے رہے، دل و دماغ کی توانائیاں نچوڑتے رہے، اسلام کی باد بہاری کی تمنا لئے نخل آرزو کو بڑھتا، پھیلتا، پھلتا اور پھولتا دیکھنے کے لئے وہ زندہ رہے اور زندگی کے ساتھ رواں دواں رہے۔ اپنی پیرانہ سالی ضعف و نقاہت کے باوجود طویل اسفار کرتے، ایک دفعہ پاکستان تشریف لے گئے۔ فاران کلب انٹرنیشنل کے سرگرم اور اسلام نواز صدر جناب عبدالرحمٰن چھابرا نے ایک بہت ہی منتخب مجمع کے سامنے اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی ایک تقریر کرائی۔ اس موضوع پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

ظہیرالدین محمد بابر کا بیان ہے کہ مجھ سے بڑے بڑے بہادرانہ کارنامے انجام پائے لیکن میری نظر میں میری سب سے بڑی بہادری یہ تھی کہ ایک روز لڑائی میں شکست کھا کر جنگل میں سو گیا تھا، آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ایک بڑا سانپ میرے سینہ پر کنڈلی مارے میرے منھ پر پھنکار مار رہا ہے، یہ دیکھ کر میرے ہوش و حواس جاتے رہے لیکن یکا یک سنبھلا اور جب اس نے پھنکار مارنے کے لئے منھ بڑھایا تو میں نے اپنے اوپر نیچے دانتوں سے اس کا سر دبالیا اور تیزی سے کھڑے ہو کر اس کو ایک طرف جھٹک کر پھینک دیا پھر اپنی تلوار سے اس کو ٹکڑے کر دیا۔ یہ واقعہ سنا کر موصوف نے یہ سامعین کو بتایا۔ آہ!

''مستشرقین مسلمانوں کے سینے پر کنڈلی مار کر پھنکار رہے ہیں اس سانپ کو اس طرح مارنا ہے جس طرح بابر نے مارا تھا۔ مگر ایسی بہادری تو مسلمان اپنی تن آسانی اور غفلت شعاری کی وجہ سے

شاید نہ دکھا سکیں ،لیکن ہمارے مسلمان پارٹ ٹائم مسلمان بننے کے بجائے فل ٹائم مسلمان بن کر زندگی بسر کریں تو مستشرقین کے تمام وار خالی جائیں''۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مستشرقین کی دسیسہ کاریوں سے خوب واقف تھے۔اسی لئے دار المصنفین میں بین الاقوامی سمینار اسی موضوع پر کرایا جو بہت کامیاب ہوا۔اس سے نئی نسل کو مستشرقین کی زہرناکی کا اندازہ ہوا۔ان کے علم وتحقیق کا طلسم ٹوٹا جس کے مفید اثرات ونتائج برآمد ہوئے۔کاش وہ ہمارے درمیان اور زندہ رہے ہوتے لیکن ؎

ازل ہی سے یہ قدرت نے اجل کو کام سونپا ہے
چمن سے پھول چننا اور ویرانے میں رکھ دینا

لہٰذا تعمیری ادب کے نیستاں میں وہ خامۂ عنبریں جو سرچشمۂ نور ونکہت بن کر خشک موضوعات کو سدا بہار گلستانوں میں تبدیل کرتا تھا اوران کی آبیاری میں مدۃ العمر زندہ رہا۔۱۰؍نومبر ۱۹۸۷ء کو فراز گومتی لکھنؤ سے گذرتے ہوئے حادثۂ جانکاہ کا شکار ہوگیا اور ہمیشہ کے لئے یہ بہار زندگی خزاں دیدۂ چمن کی نذر ہوگئی۔مالک شہود وغیوب اس شاخ گل ریز،عطر بیز،بہار خیز کو بہار جاوداں میں سرسبز وشاداب رکھے۔آمین

آسماں تری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہ بانی کرے

☆☆☆☆☆
☆☆☆

غزل

تابش مہدی

کھلونوں سے بہلتا جارہا ہے
ارے انساں! تو کیا ہوگیا ہے

سفینہ جب کسی کا ڈوبتا ہے
مدد وہ صرف تجھ سے چاہتا ہے

جسے صبر و قناعت ہے میسر
اسے دنیا میں سب کچھ مل گیا ہے

نیا انسان مال و زر کے بدلے
متاع دین و دانش بیچتا ہے

مرے ہمدرد نقادو بتاؤ
تمہارے ہاتھ میں بھی آئنا ہے

ہمیں فردوس کا رستا بتا کر
امیر کارواں سویا ہوا ہے

یہ دل حاضر ہے اس کی قدر کیجئے
بھلا ہے یا برا ہے آپ کا ہے

یہ سب فیض نظر ہے تیرا ورنہ
کسی کو کب کوئی گرداننا ہے

عبادت سے اسے کیا مل سکے گا
تمناؤں میں جو الجھا ہوا ہے

ہمارے عہد کا ہر شخص تابشؔ
نئے سانچے میں ڈھلنا چاہتا ہے

غزل

نثار عباسی..

شکستہ جام ہیں ٹوٹے ہوئے ایاغ ہیں ہم
ہمارا کیا کہ بھڑکتے ہوئے چراغ ہیں ہم

ہمارے دم سے ہی روشنی ہے جادۂ الفت
رہِ وفا میں جلائے ہوئے چراغ ہیں ہم

حوادث غم دوراں سے داغ داغ ہے دل
وہ گل کھلائے غموں نے کہ باغ باغ ہیں ہم

خود اپنے آپ کو انساں نہ پاسکا اب تک
بس ایک ہستی موہوم کا سراغ ہیں ہم

جمال علم ہے کوئی، نہ کوئی حسن عمل
نثار دامن ہستی پہ ایک داغ ہیں ہم

مولانا سید محمد واضح رشید ندوی
دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

سکریٹری رپورٹ

اردو زبان وادب کے ارتقاء میں علماء کی خدمات

پیش کردہ سیمینار رابطہ ادب اسلامی غازیپور
بتاریخ ۲۲-۲۳؍شوال ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۵-۲۶؍نومبر ۲۰۰۵ء

الحمدلله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد المرسلين محمد خاتم النبيين، وعلىٰ آله وصحبه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين أما بعد!

حضرات! سب سے پہلے ہم رابطہ ادب اسلامی کے اس سیمینار میں آپ حضرات کا استقبال کرتے ہیں، اور آپ کے شکرگذار ہیں کہ آپ نے ہماری دعوت قبول فرما کر ہندوستان کے بڑے مرکزی شہروں سے الگ تھلگ اس شہر غازیپور کو اپنی آمد سے شرف بخشا، اور زحمت سفر برداشت کی۔ آپ کا سفر یقیناً کلفت کا باعث ہوا ہوگا، ہم اس پر آپ کے ممنون ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ رابطہ ادب اسلامی سے

آپ کا تعلق گہرا اور عمیق ہے، اور اس کے کام اور پیغام سے آپ کو فکر و دلچسپی ہے، نیز اس سیمینار کے لئے اس کے اختیار کردہ موضوع سے آپ کو مناسبت اور وابستگی ہے، اور اردو زبان و ادب کا جو خاص امتیاز ہے اس پر آپ کا یقین پختہ اور اعتقاد راسخ ہے۔ اور جس کو بھی بشمول عربی زبان دوسری زبانوں سے واقفیت ہے وہ اردو زبان کی اس خصوصیت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس کی پیدائش اور نشو ونما صلحاء امت، علماء دین، دعوت و اصلاح اور تعلیم و تربیت کا کام کرنے والے داعیوں کی گود میں ہوئی، ان ہی کے زیر سایہ یہ پلی بڑھی اور برگ و بار لائی، ان حضرات کا زبان و ادب کا رخ متعین کرنے اور اس کو ترقی دینے میں اہم کردار رہا ہے، اور اس سلسلہ میں ان کے پائیدار و انمٹ نقوش و آثار ہیں جن کا اعتراف تاریخ ادب اور نقد ادب کے محققین و ماہرین کرتے ہیں۔

حضرات! ہم نے اس سیمینار کے لئے ''اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں علماء کی خدمات'' کا موضوع منتخب کیا، اس موضوع نے موجودہ دور میں بڑی اہمیت حاصل کرلی ہے، کیونکہ اس کا یہ پہلو جو اس زبان کی نشو ونما کے آغاز سے مسلسل جاری و ساری ہے ادھر کچھ عرصہ سے کمزور اور ہلکا ہونا شروع ہوگیا ہے، اس لئے اس دور میں ادب پر ان شعراء و ادباء کا اثر بڑھتا جارہا ہے جن کی آنکھیں مغربی تہذیب کی چمک دمک نے خیرہ کررکھی ہیں، اور یورپی لٹریچر کے رجحانات و میلانات اور مادی فوائد کی کشش نے ان کے ذہن و دماغ متاثر کیا ہے، خاص طور سے ان ادباء و شعراء کے یہاں جنہیں قومیت و وطنیت اور اشتراکیت و دہریت اور ترقی پسندی کے جذبات نے مغلوب کررکھا ہے، کیونکہ انہوں نے ان اسکولوں، کالجوں اور عصری دانشگاہوں میں تعلیم پائی ہے جن کا نظام تعلیم مغربی نظام تعلیم کے تابع ہے۔ اردو زبان سامراج کے

دور میں اور اشتراکیت کے غلبہ کے دور میں اس آزمائش سے گذر چکی ہے، جس میں اخلاقی قدریں، دینی تعلیمات اور مقدس مذہبی مقامات نام نہاد روشن خیال ادباء و شعراء کے طنز و استہزاء کا نشانہ بنا کرتے تھے، لیکن ان کی الحادی تحریک، مادہ پرستانہ مشن اور دین و مذہب کا مذاق اڑانے کا اسلام پسند اور دینی تعلیمات و احکام کے پابند ادباء نے بھرپور مقابلہ کیا، اور افسانہ و ناول نگاری اور شاعری کی مختلف اصناف میں ادب عالی کا نمونہ پیش کیا۔

معاصر ادبی دنیا میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ ادب کا دین و مذہب اور اخلاق و روحانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ خیال ان لوگوں کا ہے جو ارسطو کے افکار و خیالات پر مبنی مغربی دبستان فکر سے متأثر ہیں اور اس کے خوشہ چیں ہیں۔ عربی ادب میں یہ خیال قدامہ بن جعفر اور ان جیسے دیگر ادباء کے ذریعہ سے عام ہوا، پھر اس کو موجودہ یورپی لٹریچر سے متأثر حضرات نے اپنایا، جن کے یہاں دین کا مذاق، اخلاقی تعلیمات کی مخالفت اور فحاشی و بے حیائی ادب کی علامت سمجھی جاتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ادب کے حاملین اور دیندار لوگوں میں کشمکش ہوئی اور دونوں کی راہیں جداگانہ قرار پائیں، اور پھر دیندار لوگوں نے اس کے اثر سے ادب ہی کو قابل رد اور حقیر و ہیچ سمجھا اور اس سے غفلت و لاپرواہی برتی۔

اس سیمینار کے لئے موجودہ موضوع کا انتخاب افراط و تفریط کے حامل ان دونوں پہلوؤں کو جمع کرنے اور اپنی میراث اور اسلاف کی کاوشوں کی بنیاد پر ان میں اعتدال و توازن قائم کرنے کی ایک کوشش ہے، اور ہمیں امید ہے کہ انشاء اللہ ہمارا یہ مذاکرۂ علمی اس مطلوبہ مقصد کے لئے نقطۂ آغاز ثابت ہوگا۔ و باللہ التوفیق۔

حضرات! ماضی میں ادب کا دائرہ محدود تھا، کیونکہ ادب یا تو زبانی پیش کیا جاتا

تھا یا اگر مطبوعہ ہوتا تو محدود پیمانہ پر۔ لیکن وسائل نقل وحمل، اور پرنٹ والکٹرانک میڈیا نے ادب کو عالمی اور زیادہ مؤثر بنا دیا ہے، چنانچہ ادب کا تعلق عصری میڈیا سے بہت گہرا ہے جو براہ راست وسائل نقل وحمل سے وابستہ اوراس کا رہین منت ہے، اور میڈیا نے دلوں پر اثر انداز ہونے کے لئے ادب کا سہارا لے رکھا ہے۔

ایسی صورت میں اگر ادب کی باگ ڈور فکر سلیم اور صحیح جذبہ کے حامل افراد کے ہاتھوں سے نکل جاتی ہے تو یہ تباہ کن اور مہلک ہتھیاروں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوگا، کیونکہ عام تباہی والے ہتھیار محدود علاقوں اور محدود طبقات ہی کو نشانہ بناتے اور نقصان پہونچاتے ہیں، لیکن ادب میڈیا کے توسط سے پوری دنیا کو نقصان پہونچا سکتا ہے۔ اس کا مشاہدہ ہم اس دور میں جرائم اور تخریبی میلانات ورجحانات میں اضافہ کی صورت میں برابر کر رہے ہیں، اس کے نتیجہ میں پوری انسانیت عظیم خطرہ سے دوچار ہے، اوراس ادبی معرکہ آرائی کا سب سے بڑا شکار اخلاقی قدریں ہیں۔ یہ انقلابات جو ہماری دنیا میں آئے دن پیش آرہے ہیں ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم اپنی قوت مجتمع کر کے اور اپنے اثرات کو کام میں لا کر ان کا مقابلہ کریں اور پوری طرح لیس ہو کر میدان میں اتریں۔

ہمارے رابطہ ادب اسلامی کے سامنے اہم مسئلہ موضوع اور پھر مقام انعقاد کے انتخاب کا مسئلہ ہوتا ہے، چنانچہ یہ مذاکرۂ علمی مدرسہ دینیہ کے مہتمم اور سربراہ اعلیٰ مولانا عزیز الحسن صاحب صدیقی کی دعوت پر آج شہر غازیپور میں منعقد ہو رہا ہے، مولانا موصوف خود بھی اس موضوع کے تقاضوں سے واقف بلکہ اس کے نمائندے اور داعی ہیں، آپ مشہور عالم دین، ادیب وشاعر اور بیباک صحافی ہیں، آپ کی پوری زندگی تعلیم و

تربیت کی نشر واشاعت اور دعوت وارشاد میں گذری ہے، آپ جنگ آزادی کی تحریک میں بھی شریک رہے ہیں، قلم آپ کا سیال اور طبیعت آپ کی فیاض ہے۔

پھر اس مقام (غازیپور) کا علم وادب اور دعوت و جہاد میں بھی خاص کردار رہا ہے، چنانچہ یہاں سے مجاہدین کے قافلے گذرے، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے قدم اس سرزمین پر پڑے، ان کے قافلہ میں شامل جوان جہاد وآزادی ملک کی تحریک میں شریک ہوئے۔اور اسی شہر میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ (بعد میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) کے بانی سر سید احمد خاں نے یہاں اپنے قیام کے دوران مدارس قائم کیے، چنانچہ ۱۸۶۳ء میں یہاں انہوں نے مجلس علوم قائم کی، اور دوسری علمی وادبی مجلسیں اور علمی تجربہ گاہیں قائم کیں، نیز مغربی علوم کو ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنے کا خاکہ بنایا۔ (مشاہیر غازیپور از مولانا عزیز الحسن صدیقی) اور اسی شہر میں دوران قیام انہوں نے ''تاریخ فیروز شاہی'' لکھی، اور ایک مجلّہ جاری کیا۔ اور یہیں سے اپنی کتاب "تبيين الكلام في تفسير التوراة و الإنجيل على ملة الإسلام" ۱۸۶۲ء میں شائع کی۔

سر سید احمد خاں نے اپنی تعلیمی مہم کے دوران دوسرے اور بھی مدرسے قائم کیے، جیسے مدرسہ چشمۂ رحمت، نیز غازیپور میں اپنے قیام کے دوران ہی انہوں نے ''تزک جہانگیری'' لکھی، جس کا پہلا حصہ غازیپور میں ہی طبع ہوا۔ اسی طرح غازیپور کا ندوۃ العلماء کی فکر کا استقبال کرنے میں بھی نمایاں حصہ رہا ہے، چنانچہ ۱۸۹۴ء میں جب ندوۃ العلماء کا وفد غازیپور پہونچا تو اہالیان شہر غازیپور نے اس کا پُر جوش استقبال کیا۔ اور شہر کے امراء واعیان نے ندوۃ العلماء کی پوری مدد اور حمایت کی، اور اس کے لئے سرمایہ

فراہم کیا۔حتی کہ شہر کی ایک سر کردہ شخصیت محمد وکیل شریف غازیپوری نے کے لئے اپنی عالیشان کوٹھی خالی کر کے دوسرے مکان میں رہائش اختیار کی۔

تاریخ میں آتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے قبل غازیپور میں عربی و فارسی علوم کے ۲۲ مدرسے قائم تھے، اور ابتدائی علوم اور قرآن کریم کی تعلیم کے ۵۳ مکاتب تھے۔

اس خطۂ سرزمین نے متعدد بڑے ادباء وشعراء کو بھی جنم دیا، اور اردو زبان کی ترویج وترقی اور اس کے عروج وارتقاء میں غازیپور نے نمایاں کردار ادا کیا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلی اردو انگلش ڈکشنری غازیپور میں ہی لکھی گئی، یہ ڈکشنری ۱۷۹۰ء میں طبع ہوئی۔ڈاکٹر شبیر علی غازیپور میں اردو زبان وادب کے ارتقاء سے متعلق اپنے مقالے میں لکھتے ہیں کہ غازیپور میں اردو شاعری کی تاریخ سترہویں صدی عیسوی سے ملتی ہے۔جب کہ اردو زبان اس دور میں اپنے ابتدائی مرحلہ میں تھی۔

محترم حضرات! رابطہ ادب اسلامی کے ذمہ داران مذاکرۂ علمی کے لئے ہمیشہ کسی نئے اور دلچسپ موضوع کا انتخاب کرتے ہیں، نیز ان کی کوشش ہوتی ہے کہ فنی واصلاحی، دعوتی اور فکری پہلوؤں کے مابین ربط پیدا کریں، اس میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ایک پہلو دوسرے پہلو پر غالب نہ آجائے، یا کوئی پہلو دب کر نہ رہ جائے، اور یہ بات رابطہ ادب اسلامی کی طرف سے منعقد ہونے والے گذشتہ مذاکرات علمی کے موضوعات پر ایک نظر ڈالنے سے بہت واضح اور صاف طریقہ پر سامنے آتی ہے، چنانچہ اب تک رابطہ کے ۲۲ سیمینار منعقد ہو چکے ہیں اور یہ ۲۳ رواں سیمینار ہے، اب تک کے سیمیناروں کے موضوعات حسب ذیل ہیں:

۱	ادبیات اسلامی	لکھنؤ	۱۹۸۶ء

۲	اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات	جےپور	۱۹۸۷ء
۳	حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے اثرات اردو زبان وادب پر	لکھنؤ	۱۹۸۷ء
۴	نعتیہ شاعری: تاریخی وعلمی جائزہ وخصوصیات	اورنگ آباد	۱۹۸۸ء
۵	تحریک آزادی واصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصہ	حیدرآباد	۱۹۸۹ء
۶	حمد ومناجات ودعاء	رائے بریلی	۱۹۹۰ء
۷	دعوتی واصلاحی ادب	بھوپال	۱۹۹۱ء
۸	خطوط اور تأثراتی خاکوں کا ادب	لکھنؤ	۱۹۹۲ء
۹	مشرقی اقوام کی زبان وادب میں اسلامی رجحانات	بنگلہ دیش	۱۹۹۴ء
۱۰	حدیث شریف کی ادبی وفنی خصوصیات	بنارس	۱۹۹۴ء
۱۱	ادب میں سفرناموں کی اہمیت	اورنگ آباد	۱۹۹۵ء
۱۲	سوانحی ادب وتذکرہ نویسی	اعظم گڑھ	۱۹۹۵ء
۱۳	ملفوظات ومواعظ ادب کے آئینہ میں	حیدرآباد	۱۹۹۶ء
۱۴	اسلامی نشأۃ ثانیہ میں ادب کا حصہ	پٹنہ	۱۹۹۷ء
۱۵	تاریخ نویسی کا جائزہ ادب کے تناظر میں	پونہ	۱۹۹۸ء
۱۶	اسلامی ادب میں قصہ نگاری	بنگلور	۱۹۹۹ء
۱۷	بچوں کا ادب	بھٹکل	۲۰۰۰ء
۱۸	اسلامی ادب کی نمائندہ شخصیات	لکھنؤ	۲۰۰۲
۱۹	انسانی کردارسازی میں اخلاقی واسلامی ادب کی خدمات	بھوپال	۰۳
۲۰	اردو شاعری میں ملی احساسات کی ترجمانی	رائے بریلی	۲۰۰۳
۲۱	تراجم قرآن کا جائزہ: زبان وادب اور فکر کی ترجمانی	اجراڑہ میرٹھ	۲۰۰۴

۲۲ اردو زبان و ادب کی تشکیل میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا حصہ — کلکتہ — ۲۰۰۵ء

رابطہ ادب اسلامی کے اب تک کے ہونے والے سبھی سیمیناروں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور اہل علم ودانش ادباء نے انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا، اس طرح ان سیمیناروں نے ادبی وعلمی سرمایہ میں ایسے مضامین ومقالات کا اضافہ کیا جن کا علمی حلقوں میں ایک وزن اور قدر وقیمت ہے، اور ہم امید کرتے ہیں کہ اس سیمینار میں بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں اور زبانوں سے تعلق رکھنے والے اسکالرس شریک ہوں گے اور اپنے وقیع مقالات میں ہندوستان میں لسانی اور ادبی تبادلہ اور زبان وادب کے ارتقاء میں علماء کی خدمات پر روشنی ڈالیں گے۔ اردو زبان سارے ہندوستان کی عوامی زبان بن چکی ہے اگرچہ شمالی ہند میں دیگر علاقوں کی بنسبت زیادہ مقبول اور رائج ہے، لیکن جنوبی اور مغربی ہند کے مسلمان بھی یہ زبان سمجھتے اور اس میں اپنا مافی الضمیر ادا کرتے ہیں، اور یہ لسانی اور معنوی امتزاج اس زبان کی شناخت بن گئی ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ یہ ہندوستان کی سرحدوں سے تجاوز کرکے ممالک عربیہ اور یورپ تک پہونچ گئی ہے، چنانچہ عرب یا یوروپین ممالک میں جب ہم ایک بڑی تعداد کو یہ زبان بولتے ہوئے سنتے ہیں جہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں ہندی الاصل اور ہندوستانی لوگوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے تو ہمیں اس پر ذرا بھی حیرت نہیں ہوتی۔

حضرات! رابطہ ادب اسلامی ایک عالمی تنظیم ہے، جس کا بنیادی مقصد آرٹ اور اخلاق، مذہب اور ادب، علم اور ادب، فکر اور خیال، اور ان تمام شعبوں میں کام کرنے والوں کے درمیان ربط اور تعلق پیدا کرنا ہے، اس کا مقصد لطف اندوزی، ذہنی تعیش، سستی

تفریح، رعنائی خیال اور زور بیان و خوبی عبارت تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا مقصد اس سے بہت بلند اور اعلیٰ وارفع ہے اور وہ ہے انسانی زندگی کی تعمیر و تشکیل، اخلاق کی اصلاح و درستگی، اور انسان کی صلاحیتوں کو دوسرے انسانوں اور انسانیت کی فلاح و بہبود میں صرف کرنا، اور زبان و قلم کو ان کی آلائشوں اور خرابیوں سے پاک کرنا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ زبان و قلم کے غلط استعمال سے ہر دور میں انسانوں پر مصیبتیں اور پریشانیاں آئی ہیں، کیونکہ پیشہ ور ادیبوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ادب نام ہے محض اندرونی خیالات و جذبات کو دوسروں کے سامنے پیش کر دینے کا۔ خواہ اس کا اثر قلب اور معاشرہ پر اچھا خراب کچھ بھی پڑے۔

ادب کا مقصد، اس کی غرض و غایت اور اس کے راستہ کی تعیین و وضاحت کے اسی مقصد سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس رابطہ کی بنیاد ڈالی تھی، کیونکہ ادب ایک دو دھاری تلوار ہے، اس سے خیر کا بھی کام لیا جا سکتا ہے اور شر کا بھی۔ یہ انسانی اخلاق و کردار کی تعمیر کا بہترین وسیلہ ہے، اور لوگوں کو انسانی اخلاق کی بیخ کنی کی ڈگر سے ہٹا کر تعمیر و تشکیل اور اصلاح و درستگی کی شاہراہ پر ڈالنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے، اور قوت گویائی اور اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی کی صلاحیت و طاقت اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مدح کے طور پر ذکر فرمایا ہے، ﴿ خلق الإنسان، علمه البيان ﴾ (سورہ رحمٰن: ۳-۴) اور حدیث میں اس کی اثر انگیزی اور خوبی کی بناء پر اسے جادو سے تعبیر کیا گیا ہے ﴿ و إن من البيان لسحراً ﴾۔ اور اگر ہم موجودہ ماحول اور اس میں در آنے والی خرابی، بگاڑ اور اخلاقی انارکی کا جائزہ لیں تو صاف معلوم ہوگا کہ اس قدر پستی، بگاڑ اور انتہائی خرابی کا اولین ذمہ دار یہی ادبی صلاحیت کا غلط استعمال ہے، اس لئے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اس صلاحیت اور طاقت کو جس

کے دائرۂ کار اور اثر انگیزی کو موجودہ ذرائع ابلاغ نے بہت وسیع کردیا ہے اس کے فطری رخ کی طرف واپس لایا جائے اور اس سے انسانی زندگی کی تعمیر و تشکیل اور اس کی عزت و حرمت بحال کرنے کا کام لیا جائے۔

مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے اس رابطہ کا قیام ۱۹۸۵ء میں عمل میں آیا، اس کے لئے دار العلوم ندوۃ العلماء میں ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی گئی، جس میں ہندو بیرون ہند سے اور خاص طور پر عالم عربی کے مختلف گوشوں سے چوٹی کے علماء، ادباء اور شعراء حضرات بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔اس کے دو مرکزی دفتر ہیں، ایک عالم عرب کے لئے ریاض سعودی عرب میں اور دوسرا برصغیر اور ممالک مشرقیہ کے لئے لکھنؤ میں۔ پھر ان دونوں کی ان کے علاقوں میں مختلف شاخیں اور فروع قائم ہوئیں، اور ہر فرع سیمیناروں اور کانفرنسوں کے انعقاد، کتابوں اور ماہنامے اور سہ ماہی مجلّات و رسائل کی نشر و اشاعت اور اسلامی ادب پر مضامین و مقالات کے ذریعہ ادبی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے، اور افسانے، ناول، تنقید، ادبی تاریخ اور دلکش ادبی انتخابات پر مشتمل متعدد کتابیں دونوں علاقوں سے منظر عام پر آچکی ہیں۔

ریاض سے " مجلة الأدب الإسلامي " اور مراکش سے " المشكاة " نامی سہ ماہی رسالے عربی میں نکل رہے ہیں، اسی طرح بنگلہ دیش سے " الحق " اور " منار الشرق " کے نام سے بنگالی اور عربی میں اور استنبول ترکی سے ترکی زبان میں بھی رسالے نکل رہے ہیں۔ نیز قاہرہ، عمان، مدینہ منورہ، استنبول، لندن، نیویارک اور ڈربن میں متعدد سیمینار اور کانفرنسیں ادب کے موضوع پر ہو چکی ہیں۔

ہندوستان کے مرکزی دفتر کے تحت اور اس کی نگرانی میں دہلی، حیدر آباد، اورنگ آباد، بھوپال، بھٹکل اور بنگلور اور پونہ اور رانچی و کلکتہ میں شاخیں قائم ہیں اور کام کررہی

ہیں، اوران تمام شہروں میں مختلف سیمینار منعقد ہو چکے ہیں۔

ہندوستان کا مرکزی دفتر ''کاروان ادب'' کے نام سے اردو میں ایک سہ ماہی رسالہ نکالتا ہے، اور اس نے متعدد ادبی اور تنقیدی کتابیں بھی اردو اور عربی دونوں زبانوں میں شائع کی ہیں، ابھی تازہ شائع ہونے والی کتابوں میں دو قابل ذکر ہیں، ان میں سے ایک عربی میں راقم سطور کی " المسحة الأدبية في كتابات الشيخ أبي الحسن علي الحسني الندوي " اور دوسری اردو میں ڈاکٹر محمد عطاء الرحمٰن صدیقی ندوی کی ''اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

رابطہ ادب اسلامی کی ایک شاخ پاکستان میں بھی کام کر رہی ہے، وہاں سے بھی ''قافلۂ ادب اسلامی'' کے نام سے اردو، عربی اور انگلش تینوں زبانوں میں ایک سہ ماہی رسالہ نکل رہا ہے، لاہور اور اسلام آباد میں متعدد سیمینار بھی ہو چکے ہیں، پچھلے سال اپریل ۲۰۰۴ء میں بانی رابطہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی حیات وخدمات کے عنوان سے ایک بین الاقوامی سیمینار اسلام آباد میں منعقد ہوا، اور اس سال پھر اپریل ۲۰۰۶ میں اسلام آباد میں ہی علامہ اقبال پر ایک بین الاقوامی سیمینار ہونے جا رہا ہے، اسی طرح بنگلہ دیش اور ملیشیا میں بھی کئی سیمینار ہوئے ہیں۔ اور ہمیں امید ہے کہ اب غازیپور میں بھی اس کی شاخ قائم ہو جائیگی، اور یہ سیمینار اس کے لئے نقطۂ آغاز ثابت ہوگا، نیز ہمارا ارادہ پٹنہ بہار میں بھی شاخ قائم کرنے کا ہے، اس طرح تقریباً پورے ہندوستان کی مختلف زبانوں کا احاطہ ہو جائے گا اور ایک زبان کا ادبی، علمی، فکری، اصلاحی اور دعوتی سرمایہ دوسری زبان میں منتقل کرنا آسان اور سہل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور مدد فرمائے۔

یہ ہے رابطہ ادب اسلامی کی کارگزاری کی مختصر روداد اور ادب اسلامی کی اہمیت و

افادیت لی ایک تصویر۔ اس سیمینار سے رابطہ کا تعارف اور اس کا دائرہ کار وسیع ہوگا اور اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں اس کو تقویت ملے گی اور ذہنی تشکیل، نفوس کی تربیت اور ادبی وفنی عمل کی اہمیت میں انشاء اللہ اضافہ ہوگا، اور انشاء اللہ ہم ''کلمۂ طیبہ'' کے حاملین کے مصداق ہوں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں فرمایا ہے ﴿ألم تر كيف ضرب الله مثلاً كلمة طيبة كشجرة طيبة ، أصلها ثابت و فرعها في السماء ، تؤتي أكلها كل حين بإذن ربها﴾۔ (سورہ ابراہیم: ۲۴-۲۵)

آخر میں ہم ایک بار پھر اجلاس کے تمام ذمہ داران، منتظمین اور معاونین کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے انتھک محنت کر کے سیمینار کے انعقاد کو آسان بنایا، اور ہم اپنے معزز مہمانوں کے بھی مشکور ہیں کہ انہوں نے سفر کی مشقت برداشت کر کے دور دراز سے یہاں تشریف لانے کی زحمت گوارہ کی اور اپنے زریں خیالات اور بیش قیمت مقالات سے استفادہ کا موقع عنایت کیا۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر مرحمت فرمائے اور جلسہ کو کامیاب کرے اور اسے خیر وسعادت کی راہ پر چلنے اور کلمۂ حق کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنائے، آمین۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين۔

اردو ترجمہ و تلخیص: اقبال احمد ندوی غازیپوری

☆☆☆☆☆
☆☆☆

مولانا ڈاکٹر صدر الحسن ندوی مدنی

عالمی رابطہ ادب اسلامی شعبۂ ممالک مشرقیہ کا
۲۳واں مذاکرۂ علمی رپورٹ
مدرسہ دینیہ غازیپور میں

عالمی رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر وممالک مشرقیہ کے ۲۳ویں سالانہ مذاکرۂ علمی کے افتتاحی اجلاس کا آغاز ''اردو زبان وادب کے ارتقاء میں علماء کی خدمات'' کے موضوع پر ساحل گنگا پر آباد تاریخی اہمیت کے حامل شہر غازیپور یوپی کی قدیم وپُرشکوہ عمارت ''ٹاؤن ہال'' میں مدرسہ دینیہ غازیپور کے زیر اہتمام صدر رابطہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی صدارت میں بتاریخ ۲۲ر شوال ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۵ر نومبر ۲۰۰۵ء بروز جمعہ صبح دس بج کر پندرہ منٹ پر ہوا۔ صدر اجلاس کے علاوہ مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی سکریٹری عالمی رابطہ ادب اسلامی (برصغیر)، مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ،

داعی اجلاس مولانا عزیز الحسن صدیقی مہتمم مدرسہ دینیہ غازیپور اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ شہ نشیں پر تشریف فرما تھے۔

مدرسہ دینیہ کے طالب علم پرویز عالم کی تلاوت کلام پاک سے جلسہ کا آغاز ہوا، اس کے بعد محمد منہاج الدین (طالب علم مدرسہ دینیہ) نے علامہ اقبال کی مشہور نظم پڑھی:

اے اہل نظر! ذوق نظر خوب ہے لیکن　جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو　جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

داعی اجلاس مولانا عزیز الحسن صدیقی نے خطبۂ استقبالیہ پیش فرمایا، جس میں مندوبین کرام کا استقبال اور غازی پور کی تاریخی حیثیت اور اس خطہ کے علماء کرام کی خدمات کا اجمالی خاکہ پیش کیا، اور اردو زبان وادب کے میدان میں ان کی علمی وتحقیقی کاوشوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔

خطبۂ استقبالیہ کے بعد سکریٹری عالمی رابطہ ادب اسلامی (شعبۂ برصغیر) مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی کی رپورٹ مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری نے نیابۃً پیش کی۔ سکریٹری رپورٹ عربی میں تھی، اس کا اردو ترجمہ مولانا اقبال احمد ندوی غازیپوری کے قلم سے تھا۔ سکریٹری رابطہ ادب اسلامی نے اپنی رپورٹ میں بہ بانگ دہل اس حقیقت کا اعلان کیا کہ:

''معاصر ادبی دنیا میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ ادب کا دین ومذہب اور اخلاق وروحانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ خیال ان لوگوں کا ہے جو ارسطو کے افکار وخیالات پر مبنی مغربی دبستان فکر سے متاثر ہیں اور اس کے خوشہ چیں ہیں۔ عربی ادب

میں یہ خیال قدامہ بن جعفر اور ان جیسے دیگر ادباء کے ذریعہ سے عام ہوا، پھر اس کو موجودہ یورپی لٹریچر سے متأثر حضرات نے اپنایا، جن کے یہاں دین کا مذاق، اخلاقی تعلیمات کی مخالفت اور فحاشی و بے حیائی ادب کی علامت سمجھی جاتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ادب کے حاملین اور دیندار لوگوں میں کشمکش ہوئی اور دونوں کی راہیں جداگانہ قرار پائیں، اور پھر دیندار لوگوں نے اس کے اثر سے ادب ہی کو قابل رد اور حقیر و ہیچ سمجھا اور اس سے غفلت و لاپرواہی برتی۔ اس سیمینار کے لئے موجودہ موضوع کا انتخاب افراط وتفریط کے حامل ان دونوں پہلوؤں کو جمع کرنے اور اپنی میراث اور اسلاف کی کاوشوں کی بنیاد پر ان میں اعتدال وتوازن قائم کرنے کی ایک کوشش ہے، اور ہمیں امید ہے کہ انشاء اللہ ہمارا یہ مذاکرۂ علمی اس مطلوبہ مقصد کے لئے نقطۂ آغاز ثابت ہوگا۔ و باللہ التوفیق۔"

سکریٹری صاحب نے اپنی رپورٹ میں اس حقیقت کا بھی اظہار کیا کہ اب تک ہندوستان کے مختلف بڑے مرکزی شہروں میں رابطہ ادب اسلامی کے ۲۲ سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، جو رابطہ ادب اسلامی کی مقبولیت اور اس کے دوررس اثرات کے تئیں صالح اقدار کے حامل ادباء کی کاوشوں کی اثر پذیری کی دلیل ہے۔ اور ادب کا مقصد، اس کی غرض وغایت اور اس کے راستہ کی تعیین و وضاحت کے مقصد ہی سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس رابطہ کی بنیاد ڈالی تھی، کیونکہ ادب ایک دو دھاری تلوار ہے، اس سے خیر کا بھی کام لیا جاسکتا ہے اور شر کا بھی۔ یہ انسانی اخلاق و کردار کی تعمیر کا بہترین وسیلہ بھی ہے، اور لوگوں کو انسانی اخلاق کی بیخ کنی کی ڈگر سے ہٹا کر تعمیر و تشکیل اور اصلاح و درستگی کی شاہراہ پر ڈالنے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی۔

سکریٹری رپورٹ کے بعد صدر اجلاس و صدر رابطہ ادب اسلامی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا خطبۂ صدارت مولانا اقبال احمد ندوی غازیپوری آفس سکریٹری رابطہ ادب اسلامی نے پڑھ کر سنایا۔ خطبۂ صدارت میں صدر رابطہ نے فرمایا:

''تہذیب جدید سے کسب فیض کرنے والے حضرات نے مغربی نظریات ادب سے متأثر ہوکر اردو ادب کو بھی نئے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی، جو اردو زبان وادب کی تاریخ کے آخری دور میں ہوئی، لیکن اردو زبان وادب کو شروع کرنے اور اس کو بین الاقوامی سطح کی زبان بنانے والوں کا اردو کی ترقی وعظمت میں جو حصہ ہے وہ جدید ذہن ودماغ کے حامل لوگوں کی کوششوں کے پیچھے چھپایا نہیں جاسکتا، وہ حصہ علماء دین کے فیض کا مرہون منت ہے۔''

''اور اب موجودہ عہد میں کم از کم ہندوستان میں اردو کے ارتقاء کا انحصار بڑی حد تک ان ہی جیسے علماء دین پر منحصر ہوکر رہ گیا ہے، اصلاً اب ان ہی کی کوششوں اور ان کے علمی وتعلیمی اداروں کے دائرہ ہی میں یہ کام انجام پا رہا ہے، اور ان کی کوششوں کے دائرہ کے باہر تو صورت حال نازک سے نازک تر ہوتی جارہی ہے، بلکہ کہنے والے تو یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ مدارس اگر نہ ہوں اور علماء کا سایہ اردو کو حاصل نہ ہو تو اردو کا بقا کم از کم ہندوستان میں قائم نہیں رہ سکے گا۔ اور یہ مختلف زبانوں سے مختلف خوبیاں اپنانے والی زبان اور نوع بنوع خوبیوں کا حامل اسلوب بیان جو اردو کی شکل میں اس برصغیر کو مسرور ومحظوظ کرتا رہا ہے، اس سے ہمارا ملک محروم ہوجائے گا۔''

خطبۂ صدارت کے بعد مولانا ضیاء الدین اصلاحی ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا، آپ نے فرمایا کہ بدقسمتی سے اردو شعر وادب پر کچھ ...

ایسے لوگوں کے اثرات غالب رہے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کرنا ایک قسم کی ''بے ادبی'' ہے۔آپ نے اردو زبان وادب کے میدان میں علماء کرام کی کاوشوں کو سراہا، اور شاہ عبد القادر، شاہ رفیع الدین، مولانا محمد حسین آزاد، علامہ شبلی نعمانی اور خواجہ الطاف حسین حالی کی کوششوں کو خراج تحسین پیش کیا۔اس موقع پر انہوں نے فرمایا کہ ''گل رعنا'' کے مقدمہ میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''اردو ادب کی قیادت ہمیشہ علماء کے ہاتھ میں رہی ہے ''۔اسی طرح اردو زبان و ادب کی ترویج واشاعت میں مدارس دینیہ کی گراں قدر خدمات کو کوئی انصاف پسند مؤرخ ومحقق کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔

مولانا عزیز الحسن صدیقی کے اظہار تشکر اور حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی کی دعا پر گیارہ بج کر چالیس منٹ پر یہ افتتاحی اجلاس اختتام پذیر ہوا، اور جمعہ کی وجہ سے ہر قسم کے پروگرام کو مغرب تک کے لئے ملتوی کردیا گیا۔

مقالات کی پہلی نشست:

۲۲رشوال مطابق ۲۵رنومبر کو بعد نماز مغرب چھ بجے مقالات کی پہلی نشست کا آغاز ہوا، اور ساڑھے آٹھ بجے تک یہ نشست جاری رہی۔اس کی صدارت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے فرمائی، اور نظامت کے فرائض مولانا سید ضیاء الحسن نے انجام دیئے۔اس نشست میں کل آٹھ مقالات پڑھے گئے، تفصیل اس طرح ہے:

(۱) مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی: مولانا عبد الماجد دریابادی اور صحافت (۲) ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی مدنی: شاعر نغز گو علامہ سید سلیمان ندوی (۳) ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی: اردو زبان وادب کے ارتقاء میں علامہ شبلی کا حصہ (۴) ڈاکٹر ابوسفیان

اصلاحی: اردو زبان وادب کے ارتقاء میں مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمات (۵) ڈاکٹر سمیع اختر ندوی: علامہ سید قطب کی خدمات عربی زبان وادب کے ارتقاء میں (۶) جناب آفاق فاخری: مولانا کرامت علی جونپوری کی خدمات اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت میں (۷) ڈاکٹر تابش مہدی: اردو زبان وادب کے ارتقاء میں خواجہ حسن نظامی کا حصہ اور (۸) مولانا ارشد سراج الدین مکی: خواجہ الطاف حسین حالی اردو کے اولین سیرت نگار۔

نشست کے اختتام پر صدر اجلاس مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے اپنے گرانقدر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اردو ادب ہو یا فارسی وعربی ادب، ہر زمانہ میں علماء ہی اصلاً ادب کے علمبردار رہے ہیں، اور ادب کے قافلہ کو آگے بڑھانے اور اس کو بامقصد بنانے میں علماء نے ہر دور میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے، اس لئے علماء کو ادب کے دائرہ سے نکالنا بڑی ناانصافی کی بات ہے، بلکہ بڑا ظلم ہے۔ آپ نے شیخ سعدی، عبدالرحمٰن جامی، مصطفٰی صادق رافعی، حسن البنا اور سید قطب شہید کا بطور خاص تذکرہ فرمایا اور علماء کی کاوشوں کو خراج تحسین پیش کیا۔

مقالات کی دوسری نشست:

۲۴ رشوال مطابق ۲۶ رنومبر کو صبح دس بجے مقالات کی دوسری نشست کا آغاز ہوا، اس نشست کی صدارت مولانا عزیز الحسن صدیقی نے کی، اور نظامت کے فرائض مولانا ڈاکٹر محمد صدر الحسن ندوی نے انجام دیئے۔ اس نشست میں بھی کل آٹھ مقالات پیش کئے گئے جو اس طرح ہیں:

(۱) مولانا محمد صادق ندوی: مولانا عبدالماجد دریابادی کتاب اردو کا ایک

درخشاں باب (۲) پروفیسر عبد الباری: مولانا ابراہیم آروی، راہ عمل کا ایک شیدائی محدث ومترجم (۳) مولانا ڈاکٹر عبد الرشید ندوی مدنی: خطبات میں مولانا آزاد کا دعوتی رنگ (۴) ڈاکٹر اقبال حسین ندوی: مولانا عبد السلام ندوی کا تنقیدی شعور (۵) مولانا شمس الدین ندوی: شعروشاعری اورادبی تنقید کے ارتقاء میں مولانا حالی کا حصہ (۶) مولانا اقبال احمد ندوی غازیپوری: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی علمی وادبی خدمات، اردو زبان وادب کے حوالہ سے (۷) ڈاکٹر شکیل احمد: اردو کی ترقی و تحفظ میں مدارس کا حصہ (۸) ڈاکٹر محمد عارف جنید ندوی: والیان ریاست بھوپال و علماء کرام کی علمی وادبی خدمات کا سرسری مطالعہ۔ صدر جلسہ مولانا عزیز الحسن صدیقی کے صدارتی کلمات پر یہ نشست اختتام پذیر ہوئی۔

مقالات کی تیسری نشست:

تیسری نشست کے معاً بعد دوسری نشست منعقد ہوئی، صدارت پروفیسر عبد الباری نے اور نظامت ڈاکٹر محمد عارف جنید ندوی نے کی، اس نشست میں کل پانچ مقالے پڑھے گئے:

(۱) جناب حسین امین صاحب : اردو کے ارتقاء میں مولانا عبد الماجد دریابادی کی صحافتی خدمات (۲) مولانا عمید الزماں کیرانوی: مولانا قاری محمد طیبؒ کی علمی خدمات (۳) مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی: مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی کی مسدس اور مثنویاں (۴) ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن: مولانا مناظر احسن گیلانی کی النبی الخاتم سیرت اور دلکش نثر نگاری کا اعلیٰ نمونہ (۵) ڈاکٹر اطہر حبیب ریحان خاں ندوی:

مولانا سید سلیمان ندوی کی ادبی خدمات ۔ صدر جلسہ کے صدارتی کلمات پر جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی نے بھی سیمینار کے لئے مقالے لکھے تھے، لیکن قلت وقت کی بنا پر پیش نہیں کئے جا سکے، پروگرام میں انہیں شامل کرلیا گیا۔

اس سیمینار میں موضوع سے متعلق مختلف عنوانات کے تحت کل اکیس مقالے پیش کئے گئے ۔ مقالات اپنی اہمیت وافادیت کے لحاظ سے حاصل مطالعہ تھے، ہر مقالہ نگار نے اپنے موضوع کے انتخاب میں اپنی ژرف نگاہی اور معارف نوازی اور علم گستری کا حق ادا کیا، تمام مقالات گوش دل سے سنے گئے، اور رابطہ کے قافلہ کو آگے بڑھانے میں کلیدی اہمیت کے حامل تھے۔

۲۵/اور ۲٦/نومبر کی درمیانی شب میں ایک نعتیہ مشاعرہ کا انعقاد بھی عمل میں آیا، جس کی صدارت کہنہ مشق شاعر جناب تابش مہدی کے حصہ میں آئی، اس پُر کیف مشاعرہ میں مقامی وبیرونی شعراء نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

اس سیمینار میں اعظم گڑھ، مئو، غازیپور، علی گڑھ، کلکتہ، دہلی، اورنگ آباد، بھوپال، لکھنؤ، رائے بریلی، پٹنہ، حیدرآباد اور دیگر مقامات سے تشریف لانے والے مندوبین نے مختلف علاقوں کی نمائندگی کی ۔ رابطہ ادب اسلامی کا یہ سیمینار اس کے دوسرے سیمیناروں کی طرح مندوبین کی تعداد، مقالات کے تنوع، مختلف الجہات موضوعات پر مقالات کی خواندگی اور اصحاب علم وتحقیق کے ورود مسعود سے بہت کامیاب رہا۔ آغاز سے اختتام تک تمام پروگرام بحسن وخوبی انجام پائے ۔لذت کام و

دہن اور آمد و رفت کے حسن انتظام اور لب ساحل گنگا کی فرودگاہ اس پر مستزاد۔ ان سب نے سفر کی کلفتوں اور پروانوں کی یورش کے درمیان ایسا خط فاصل قائم کیا کہ غربت کدہ میں بھی دولت کدہ کا لطف و قرار آیا۔

مدرسہ دینیہ غازیپور کے مہتمم مولانا عزیز الحسن صدیقی کے عزم جواں نے رابطہ کے اس اجلاس کو ایسا پُر لطف بنایا، اور ان کے معاونین نے دیدہ و دل اس طرح فرش راہ کئے کہ یہ اجلاس ایک تاریخی اجلاس بن گیا۔ خدا کرے کہ رابطہ کی یہ شمع فروزاں پورے آب و تاب کے ساتھ تا ابد باقی رہے۔ آمین

☆☆☆☆☆

☆☆☆

قاری محمد اسماعیل ظفر
(کلکتہ)

خطبۂ استقبالیہ

عالمی رابطہ ادب اسلامی، شعبۂ برصغیر ممالک مشرقیہ کے ۲۲واں سالانہ مذاکرۂ علمی میں ادارۂ انعقاد مدرسہ باب العلوم، کلکتہ۔۴۱ کی جانب سے بحیثیت ناظم اعلیٰ باب العلوم، صدر اسلامیہ ہائی اسکول اور صدر مجلس استقبالیہ ۲۲واں سالانہ اجلاس میں، میں ملک کے تمام گوشوں سے تشریف لانے والے معزز مندوبین کا اور تمام علاقائی و بیرونی مہمانان کا تہ دل سے استقبال کرتا ہوں۔

آج کا دن صوبۂ مغربی بنگال کے لئے بالعموم اور شہر کلکتہ کے لئے بالخصوص ایک یادگار دن ہے۔ ایک ایسا دن جو نہ صرف برسوں یاد رکھا جائے گا بلکہ صدیوں بھلایا نہیں جا سکے گا۔ آسمان علم وادب کے اتنے سارے جگمگاتے ستارے شہر کلکتہ میں کبھی بیک

وقت جمع نہیں ہوئے تھے۔ یہ رابطۂ ادب اسلامی کا کارواں ہے، جو اپنے ساتھ اتنے سارے پرنور چہرے کلکتہ لے آیا ہے۔ ہمارے پاس اپنے مہمانوں کے استقبال کے لئے انکے شایان شان اور عین مناسب الفاظ نہیں ہیں۔

کلکتہ ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے۔ برسوں یہ ہندوستان کی راجدھانی بھی رہا ہے اور اس نے علم وادب کے قافلوں کی نہ صرف بار بار ضیافت ومیزبانی کی ہے بلکہ علم وادب کے راستوں پر وہ سفر بھی کیا ہے جس کے اثرات ونقوش آج بھی زندہ وتابندہ ہیں۔ اس شہر کو نہ صرف حضرت سید احمد شہیدؒ کے قافلۂ حج کی میزبانی اور ان سے استفادے کی سعادت حاصل ہوئی ہے بلکہ یہ مولانا ابوالکلام آزاد جیسے جیالے دیدہ ور اور بے باک رہنما کی بے مثال خطیبانہ، داعیانہ، مجتہدانہ اور منصفانہ کاوشوں کا مرکز بھی رہا ہے۔ 'الہلال' اور 'البلاغ' جیسے جریدوں کا یہ مخرج آج ایک مرتبہ پھر سے اپنی قسمت پر نازاں وفرحاں ہے کہ اسے پھر سے وہی خوشی محسوس ہو رہی ہے جو اسے زمانہ آزاد میں محسوس ہوا کرتی تھی۔ آج ایک مرتبہ پھر یہاں سے وہی صدا گونجنے والی ہے جو باطل کے ایوان میں دراڑیں ڈال دے گی اور ہر طرف نعرۂ حق کی گونج سنائی دے گی۔

میں باب العلوم کے ذمہ دار کی حیثیت سے آپ سب کا بھرپور استقبال کرتے ہوئے یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ مدرسہ باب العلوم کوئی بہت بڑا ادارہ نہیں ہے، یہ چھوٹا مدرسہ ہے مگر اس کے عزائم بلند اور ارادے نیک ہیں۔ اس سے جڑے ہوئے افراد اس کا عظیم سرمایہ ہیں اور ان سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس مدرسہ پر مخدومی اور آقائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی خصوصی نظر کرم تھی۔ وہ اس مدرسہ سے والہانہ

محبت کرتے تھے، اس کے معاملات میں نیک مشوروں سے نوازتے تھے اور اس کے لئے دعائیں فرماتے تھے۔ میری آنکھیں انکی محبت کا ذکر کرتے ہوئے نم ہیں۔ یہ انکی محبت وتعلق ہی کا ثمرہ ہے کہ آج باب العلوم کو یہ اعزاز اور مقام حاصل ہوا ہے کہ وہ علم وادب کے اس مہتم بالشان کارواں کا خیر مقدم کررہا ہے اور عالمی رابطہ ادب اسلامی کے ۲۲واں سالانہ مذاکرۂ علمی کا اہتمام کررہا ہے۔

میں بہت فخر وانبساط کے ساتھ یہ بھی اعلان کرتا ہوں کہ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے بعد انکے صحیح جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب نے بھی اس مدرسہ کو اپنی محبتوں اور شفقتوں سے نوازا ہے۔ حضرت مولانا مدظلہ العالی اور ان کے تمام محبین و متعلقین کی عنایات صرف باب العلوم کے لئے ہی باعث اعزاز نہیں، پورے کلکتہ اور صوبہ مغربی بنگال کے لئے توقیر واکرام کا سبب ہیں۔ میں پورے صوبہ مغربی بنگال کی جانب سے آپ سب کا خیر مقدم کرتے ہوئے آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہمارے لئے بڑی قربانی دی ہے اور سفر کی بے شمار مشقتیں اٹھا کر یہاں تشریف لائے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارے گھر کے راستے میں کہکشائیں نہیں ہیں، آپ پتھروں پر چل کر یہاں تشریف لائے ہیں۔ مگر یہ آپ کی ذرہ نوازی اور قدردانی ہے کہ آپ ہر تکلیف اٹھا کر بھی یہاں آئے ہیں۔ ہم آپ کو اپنی آنکھوں پر بٹھاتے ہیں ،آپ کی راہوں میں اپنی پلکیں بچھاتے ہیں۔

جہاں تک بات اردو زبان وادب سے مغربی بنگال کے رشتے کی ہے تو یہ اس حقیقت کے باوجود کہ یہاں کی علاقائی زبان بنگالی ہے، انتہائی قدیم اور مضبوط ہے۔

۱۸ویں صدی کے آغاز بلکہ ۱۷ویں صدی کے وسط سے ہی اس رشتے کی کڑیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔ عبدالغفور نساخ، ابوالقاسم، محمد مظہرالحق شمس اور غالب ثانی علامہ رضا علی وحشت جیسے شعراء ہی نے یہاں کی زینت نہیں بڑھائی ہے، ہری ہردت نے ۱۸۲۲ء میں اردو کا سب سے پہلا ہفت روزہ اخبار ''جام جہاں نما'' جاری کر کے اور اس کے بعد کبیر الدین احمد بنگالی نے ۱۸۸۵ء میں اردو کا سب سے پہلا روزنامہ ''اردو گائیڈ'' جاری کر کے کلکتہ کو اردو زبان و ادب کی خدمات میں نمایاں مقام دلایا ہے۔ فورٹ ولیم کالج ایشیاٹک سوسائٹی اور مدرسہ عالیہ کے شہر کلکتہ نے کسی بھی دور میں اردو سے اپنا رشتہ کمزور ہونے نہیں دیا۔ یہاں ہر دور میں ایسے افراد نظر آتے ہیں، جنہوں نے اپنے خون جگر سے گلشن اردو کی آبیاری کی ہے اور اپنی جہد مسلسل سے ایسے ایسے شگوفے کھلائے ہیں جن پر اُردو بجا طور پر ناز اور فخر کر سکتی ہے۔ یہ اس شہر کی اردو سے والہانہ محبت ہی ہے جس نے ہر دور میں اردو زبان و ادب کے ماہرین کو اس شہر میں آنے پر مجبور کیا ہے۔ اردو کے بڑے شاعر اسد اللہ خاں غالب بھی یہاں آنے پر مجبور ہوئے اور رابطۂ ادب اسلامی کا قافلہ بھی اردو زبان و ادب کی محبت میں اپنے آپ کو یہاں پہونچنے سے روک نہیں سکا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ آپ بھی مدتوں غالب کی طرح یہ دہراتے رہیں گے ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

میں اپنے خطبہ کا اختتام اس اعتراف کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اس عظیم شہر میں آپ کی ضیافت و میزبانی کے لئے جو انتظام اور اہتمام کرنا چاہئے تھا وہ ہم نہیں

کر سکے ہیں۔ہم نے اس بات کی مقدور بھر کوشش کی ہے کہ آپ کو کوئی تنکا بھی نہ چبھے اور آپ کو معمولی ٹھیس بھی نہ لگے لیکن اس کے باوجود اگر ہم سے کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے تو ہمیں اس کے لئے معاف کریں اور یقین رکھیں کہ جو کانٹا بھی آپ کے پاؤں میں چبھے گا اس کا زخم ہمارے دل پر ابھرے گا۔میں ایک مرتبہ پھر سے آپ تمام لوگوں کا بھرپور استقبال کرتے ہوئے اور آپ کی کلکتہ آمد پر آپ سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين۔

☆☆☆☆☆
☆☆☆

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

اردو زبان پر اسلامی اثرات

اردو زبان دنیا کی دیگر زبانوں سے بہت سے امور میں مختلف ہے، جن میں پہلا اور بنیادی اختلاف یہ ہے کہ اردو زبان ایک جدید زبان ہے جس کی عمر ۳۰۰ سال سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ مغلوں کے آخری دور میں پنپی، پھلی پھولی اور ترقی یافتہ زبان بنی۔ یہ وہ دور تھا جب کہ ابھی اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، اوران کا کلچر ہی رائج و غالب کلچر تھا۔ دوسرا اختلاف یہ ہے کہ اس زبان نے اپنے لغوی اور فکری سرمایہ میں ترکی، فارسی، عربی، ہندی اور سنسکرت جیسی دیگر زبانوں سے کافی مدد لی ہے، اور ان زبانوں کے الفاظ حسب ضرورت اس میں منتقل ہوئے، اوران سب کے اختلاط و آمیزش سے اردو زبان عالم وجود میں آئی۔ اس کی کتابت میں فارسی رسم الخط اختیار کیا گیا۔ پھر دوسری زبانوں سے منتقل ہونے والے الفاظ اردو میں آکر ہندوستانی ماحول میں ڈھل گئے اور انہوں نے ہندوستانی لب ولہجہ اور اسلوب اختیار کرلیا اور ن پر یہاں

کا مقامی رنگ چڑھ گیا۔

اردو زبان مسلمانوں کے دور عروج وعہد قوت وسطوت میں اور اسلامی ماحول کی برتری وبالا دستی کی فضا میں پروان چڑھی، خاص طور پر شمالی ہند اور دکن کی اسلامی ریاستوں میں اس کو زیادہ برگ وبار حاصل ہوا، جس کے نتیجہ میں اس زبان پر اسلامی رنگ پختہ ہوا اور اس پر اسلامی ثقافت کی چھاپ پڑی ، اور اسلامی تعبیرات و اصطلاحات زبان کے بنیادی اجزاء قرار پائے۔

مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں'' میں اردو زبان کی پیدائش اور نشو ونما کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''ہندوستان کی اصل زبان سنسکرت ہے، اور ہندوؤں کے عقیدہ کے مطابق اس زبان میں ان کی چار آسمانی اور مقدس کتابیں ہیں، لیکن روزمرہ اور عام بول چال کی زبان دوسری ہے، جو ہندوستان کے بڑے حصے میں بولی جاتی ہے، اور اس کو بھاشا زبان کہتے ہیں۔ جب ہندوستان میں اسلام کی اشاعت ہوئی اور عرب وعجم سے یہاں مسلمانوں کی آمد ہوئی تو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی زبانوں کے اختلاط وآمیزش سے ایک نئی زبان پیدا ہوئی اور اس کو اردو کہا جاتا ہے۔ یہ زبان بتدریج ترقی کرتی رہی یہاں تک کہ شاہجہاں کے زمانہ میں یہ فصاحت وبلاغت کے اچھے معیار

پر پہونچ گئی۔ ابتداء میں دہلی اور اس کے اطراف کے لوگوں کا میلان فارسی شاعری کی طرف تھا اور اردو شاعری میں شعر گوئی کا رجحان نہیں تھا۔ بیجاپور کے ابراہیم عادل شاہ کو موسیقی اور ہندی زبان سے بہت گہرا تعلق تھا، اور اس نے ہندی زبان میں کچھ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، اس کے پاس اس کے زمانہ کے علوم و معارف کا بڑا حصہ جمع ہوگیا تھا، اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے تھے، یہ حالت ابراہیم عادل شاہ کے لڑکے محمد عادل شاہ اور پھر ان کے لڑکے علی عادل شاہ کے زمانہ تک قائم رہی، علی عادل شاہ کو اردو زبان سے بڑی دلچسپی تھی، اس لئے اس کے زمانہ میں لوگ اس زبان کی طرف زیادہ مائل ہوئے اور اس زبان میں اشعار کہنا شروع کیا''۔

اور محمد حسین آزاد ''آب حیات'' میں اردو کی ابتدائی تاریخ بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''ادھر تو یہ چونچال لڑکا (اردو) شعراء کے جلسوں میں اور امراء کے درباروں میں اپنی بچپنی کی شوخیوں سے سب کے دل بہلا رہا تھا، ادھر دانائے فرنگ جو کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا، اس نے دیکھا، نظر باز تاڑ گیا کہ لڑکا ہونہار ہے، مگر تربیت چاہتا ہے۔ تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے

ہیں اس کی زبان سیکھنی واجب ہے، چنانچہ ۱۷۹۹ء (۱۲۱۴ھ) میں میر شیر علی افسوس نے باغ اردو اور ۱۸۰۵ء (۱۲۲۰ھ) میں آرائش محفل لکھی، میر امن دہلوی نے ۱۸۰۲ء (۱۲۱۷ھ) میں باغ و بہار آراستہ کیا، اور انہی دنوں میں اخلاق محسنی کا ترجمہ لکھا۔ ساتھ ہی جان گلکرسٹ صاحب نے انگریزی میں قواعد اردو لکھی۔ .... اب عام فہم اردو ہوکر ناگری میں لکھی گئی، لیکن اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) میں قواعد اردو لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے۔"

آگے مزید لکھتے ہیں:

"عجیب لطف یہ ہے کہ زبان اردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا، یعنی ۱۸۰۷-۱۲۲۲ھ میں مولوی شاہ عبد القادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اردو میں، بعد اس کے مولوی اسماعیل صاحب نے بھی بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے لئے اردو میں لکھے"۔

" ۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اردو ہونے شروع ہوئے، چند سال کے بعد کل دفتروں میں اردو زبان ہوگئی۔ اسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی، ۱۸۳۶ء میں اردو کا اخبار

دلی میں جاری ہوا اور یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا ...... اور ۱۸۴۲ء سے دلی میں سوسائٹی قائم ہو کر ترجمے ہونے لگے۔"

(آب حیات صفحہ ۲۴-۲۵)

محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں:

"ان کی (یعنی مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی) اہم ترین کتاب تقویۃ الایمان ہے، جو انہوں نے اردو زبان میں اس وقت لکھی جب اس زبان کو ابھی گھٹنوں چلنا نہیں آتا تھا، حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں جب اردو نثر میں گنتی کی کتابیں تھیں ایک صاحب کمال نے اس میں کیا جادو بھر دیا ہے، اور اس کی مدد سے اپنے خیالات کو کتنی خوبی سے ادا کیا ہے"۔

(موج کوثر صفحہ ۳۸)

اردو زبان کا تخم پہلے اسلامی لشکر کی زمین میں بویا گیا، پھر اس کی نشو و نما دہلی اور دکن کے اسلامی شاہی درباروں میں ہوئی، پھر اس کو رائج و عام فہم اور مقبول بنانے میں مصلحین امت، علمائے ربانیین اور ان کے شاگردوں اور مریدوں نے حصہ لیا، اور اسلامی موضوعات پر نثر و نظم کی اولین کتابیں اسی زبان میں لکھی گئیں۔

اردو انسائیکلو میڈیا میں لفظ اردو کی تشریح میں تحریر ہے کہ ابتدائی کتابیں جو اردو زبان میں لکھی گئیں، ان میں معراج العاشقین، شرح مرغوب المطلوب، شرح تمہید ہمدانی اور قرآن شریف کے ترجمے کی کتابیں ہیں۔

اردو نثر کی طرح اردو شاعری بھی اہل دل صوفیہ اور بزرگان دین کی گود میں پلی بڑھی، چنانچہ اردو شاعری پر امیر خسرو، مرزا مظہر جان جاناں کے اثرات سے تاریخ ادب اردو سے واقفیت رکھنے والا انکار نہیں کرسکتا، حکیم مومن خاں مومن اور خواجہ میر درد کا کلام بھی درد و سوز اور رقت و گداز کا شاہکار ہے۔ یہ دونوں حضرات علماء و صوفیہ اور بزرگان دین کے عقیدت مند و ارادت کیش اور اسلامی جذبہ کے حامل شاعر تھے، خواجہ میر درد کئی کتابوں کے مصنف ہیں، اسرار الصلاۃ ان کا ایک رسالہ ہے جو پندرہ برس کے سن میں لکھا ہے، واردات درد نامی ایک دوسری کتاب ہے جس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں، نالۂ درد، آہ سرد، درد دل، سوز دل اور شمع محفل وغیرہ۔ اس کی شرح میں علم الکتاب جیسی کتاب تصنیف کی۔ ایک رسالہ مبحث غناء میں لکھا ہے، ایک دیوان فارسی میں ہے اور ایک ریختہ میں۔ یہ ساری کتابیں مطبوعہ ہیں۔ اور حکیم مومن خاں مومن جوانی میں سید احمد شہیدؒ کے مرید ہوئے اور آخر عمر تک عقائد میں انہی کے پیرو و متبع رہے، کلیات میں ایک مثنوی جہاد یہ ہے جو اس وقت لکھی تھی جب سید صاحبؒ سکھوں سے جہاد کر رہے تھے، علاوہ اس کے دو قطعۂ تاریخ ان کی امامت کے ہیں۔ شوق شہادت پر ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب		یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

اور اگر ہم مختلف ادوار میں حرف شناسی اور مکتب کی تعلیم سے لیکر دراسات علیا تک کے نصاب تعلیم کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اردو زبان اسلامی زبان ہے، اس لئے کہ بچہ جب الف با پڑھنا شروع کرتا ہے تو سب سے پہلا لفظ جو وہ سیکھتا ہے لفظ

اللہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنی کتاب میں پڑھتا ہے: الف سے اللہ۔ اسی طرح بچہ اپنی مادری زبان اردو کی تعلیم کے دوران اسلامی نظمیں، ترانے اور اسلامی اخلاق و کردار بھی سیکھتا ہے۔

نیز اردو کی وہ تمام تعبیرات وکلمات بھی جن سے غرور و طاقت، محبت وشفقت اور خیر وشر کا اظہار ہوتا ہے اسلامی الاصل ہیں، مثلاً تکبر کرنے والے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ فرعون ہے، کثرت مال پر ناز کرنے والے کو قارون کہتے ہیں، اسی طرح کسی میں شرارت وخباثت کا غلبہ ہو تو اسے ابلیس اور شیطان کہتے ہیں، کوئی پیٹو اور زیادہ کھانے والا ہو تو کہتے ہیں اس کا پیٹ جہنم ہے، یا وہ شیطان کے پیٹ سے کھاتا ہے، بھوک کی شدت بتلانی ہو تو کہا جاتا ہے: آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہیں، اس طرح اردو پڑھنے والا اور اردو بولنے والا اسلامی فضا اور اسلامی ماحول میں پروان چڑھتا ہے۔ حد سے زیادہ لمبائی بتلانے کے لئے شیطان کی آنت سے تعبیر کیا جاتا ہے، کسی کے حسن کردار وخوبی اخلاق کی تعریف مقصود ہو تو کہا جاتا ہے کہ وہ فرشتہ ہے، یا فرشتوں جیسا ہے یا اس کے اندر ملکوتی صفات پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح کچھ تعبیرات اسلامی ثقافت وکلچر سے تعلق رکھتی ہیں جنہیں مسلم اور غیر مسلم سبھی استعمال کرتے ہیں، مثلاً ماشاء اللہ، سبحان اللہ، الحمد للہ، اور انشاء اللہ وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ جب زبان وادب کا یہ مزاج ہو تو طبعی طور پر ادب کا رجحان بھی اسلامی ہوگا، اسی لئے اردو ادب میں فساد وبگاڑ اور اخلاقی انحراف کے عناصر کسی دوسری زبان کے مقابلہ میں کم پائے جاتے ہیں، اور اگر کسی دور میں اردو ادب میں انحراف آیا

تو ایسے ادباء اس کے مقابلہ پر اترے جن کا اپنا ایک وزن تھا، اور ادب کی دنیا میں جن کا طوطی بولتا تھا۔ اردو ادب برابر اسلام، اسلامی شعائر اور اسلامی شخصیات کے ادب و احترام کی اس خصوصیت پر قائم رہا، یہاں تک کہ فکری یلغار کا دور آیا اور اس میں مارکسی ادب کے غلبہ کے دور میں دین کے ساتھ استہزاء کا عنصر داخل ہوگیا، جب کہ خدا بیزار و ملحد بالشویک انقلاب کے نتیجہ میں ترقی پسند اور روشن خیال ادب وجود میں آیا، اور بعض نام نہاد مدعیان ادب مغربی ادباء کی گود میں جا گرے۔ لیکن یوروپین تہذیب کے اس سیل بے اماں اور طوفان تند و جولاں اور عام انسانی زندگی پر اس کے اثر انداز ہونے کے باوجود ادباء و شعراء نے اسلامی اقدار کے احترام کی ہمیشہ پاسداری کی اور شاعری کی مختلف اصناف میں اسلامی بلکہ عربی تعبیرات کا استعمال کرتے رہے، یہی حال نثر کا بھی تھا۔ علامہ شورش کاشمیری کا قسط وار ناول جو رسالہ ''چٹان'' لاہور میں شائع ہوا وہ اس پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے کہ اردو ادباء کی زندگیوں میں دین کا کتنا ادب و احترام پایا جاتا تھا۔

اردو ادب اور اسلام اور ملت اسلامیہ کی خدمت

اردو زبان و ادب کی طویل تاریخ میں ہمیں ایسے ادباء بھی ملتے ہیں جنہوں نے اپنے ادب و شعر کو دین اور ملت اسلامیہ کی خدمت کے لئے وقف کردیا تھا، یہی وطیرہ دیگر اصناف کلام تاریخ و ناول لکھنے والے ادباء کا بھی رہا۔ انہوں نے ان اصناف میں اپنی صلاحیتوں کا استعمال اسلام مخالف افکار و خیالات پر تنقید، اسلامی خصائص کو اجاگر کرنے، دلوں میں اسلامی غیرت ابھارنے اور اسلامی فکر پیدا کرنے اور اپنے

کمزور پہلوؤں یا قابل عبرت جگہوں کی نشان دہی کرنے کے لئے کیا، قابل عبرت مواقع پران کے قلم کی طاقت میں اضافہ ہوجاتا ہے، ان کی طبیعت میں ابال پیدا ہوتا ہے، اوران کا جذبہ چھلک چھلک پڑتا ہے۔ان کے قلم میں وہ تاثیر پائی جاتی ہے جوکسی جنگی قائد میں ہوتی ہے، جو پورے لشکرکوموت کی تاریک وادیوں میں کود پڑنے پرآمادہ کردیتا ہے، چنانچہ ادباء کے مضامین بھی اسی طرح پورے ماحول میں ایک آگ سی لگادیتے تھے، اور مسلم معاشرہ کوحرکت وعمل اور سختیاں برداشت کرنے پرآمادہ کردیتے تھے، جیسے شعراء کے اشعار دلوں میں اسلامی غیرت کی آگ بھڑکاتے تھے، اور مسلمانوں کوحرکت وعمل اوراصلاح احوال پرابھارتے تھے، اوران کے اندراسلام اور اسلامی تاریخ پراعتمادکوبحال کرتے تھے، اوردلوں میں اسلامی تہذیب وثقافت کی محبت اور مغربی تہذیب کی نفرت جاگزیں کرتے تھے، اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا ماتم کرتے تھے، جیسے خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، اکبرالہ آبادی، حفیظ جالندھری، شبلی نعمانی اورظفرعلی خاں وغیرہ۔ان شعراء کے اشعارآج بھی برابرقلوب کوگرماتے ہیں، دلوں کومہمیز لگاتے اورانہیں مست وبیخود بناتے ہیں، اوران میں عزم ویقین پیدا کرتے ہیں، جوبھی اردوادب کاجائزہ لےگا اس کے آئینہ میں مسلمانوں کی تاریخ کی جھلکیاں دیکھےگا،صرف برصغیرہی نہیں بلکہ پورے عالم کی تصویراس میں نظرآئےگی۔ وہ دیکھےگاکہ اردو کے مسلمان ادیب اورمسلمان شاعرکادل بےقرارو بےچین ہوجاتا ہے، جب ایرانی، ترکی یاعربی شخص پرکوئی افتاد پڑتی ہے، گویاوہ اسے اپنادردسمجھتا ہے، اوراس کی زبان ایسے موقع پرامت اسلامیہ کی زبان اوراس کی ترجمان بن جاتی ہے۔

اس حالت کی بہترین تصویر کشی اور اس امت سے پنے یا عالمی اسلامی مزاج کی شاندار عکاسی علامہ شبلی نعمانی کے وہ اشعار کرتے ہیں جو انہوں نے برطانوی حکومت کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے جب کہ اس حکومت کے بعض وزراء نے یہ دعوی کیا تھا کہ برطانوی سیاست ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں عادلانہ ہے تو پھر ہندوستانی مسلمان دوسرے ممالک میں پیش آنے والے واقعات سے کیوں دلچسپی لیتے اور ان پر واویلا مچاتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ہم کو پاس ہے احساس مسلم کا
مگر اس کا اثر جو کچھ ہے بس ہندوستاں تک ہے
مگر ہم کیا کریں اس کو کہ عالمگیری ملت
عراق و فارس و نجد و حجاز و قیرواں تک ہے
منافق ہے جو کہتا ہے کہ ''میں ٹرکی سے یکسو ہوں''
یہ وہ الفاظ ہیں جن کی جہانگیری زباں تک ہے
ہمارا جوش اسلامی انہیں باور نہیں کرتا
یہ انداز تغافل جلوہ گاہ امتحاں تک ہے

ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال اور ان کی بساط سیاست پلٹ جانے سے اردو ادباء و شعراء پر بہت زیادہ اثر پڑا۔ مغلیہ حکومت کا دار السلطنت اخیر دور میں مراٹھہ ،سکھ اور افغان قبائل کی ترک تازیوں کے نرغہ میں تھا، آخر دار السلطنت تاخت و تاراج ہوا، مسلمانوں کی عزتیں پامال کی گئیں، اور مکانات ومحلات اور کوچہ و بازار لوٹے گئے،

اور یہاں بھی وہ واقعات پیش آئے جو عباسی خلافت میں بصرہ اور بغداد میں پیش آئے تھے، اور جس طرح اُن واقعات نے عرب شعراء کے جذبات بھڑکائے تھے، اسی طرح ان واقعات نے اردو شعراء کے دلوں میں اشتعال پیدا کیا۔ اردو ادب کا طالب علم یہ سلگتا ہوا جذبہ اردو شاعر خواجہ میر درد کے کلام میں پاتا ہے جنہوں نے ان حادثات کو خونِ جگر سے بیان کیا ہے، اور یہ جذبہ ہمیں آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے کلام میں ملتا ہے جو اردو کے اولین باکمال شعراء میں تھے۔ اسی طرح ان کی جھلک ہمیں شاہ عبد العزیز دہلوی اور مرزا مظہر جان جاناں کی تحریروں میں ملتی ہے، اور یہ رسالے اور قصائد اپنے اندر ایک دائمی تاثیر رکھتے ہیں اور اسلامی حمیت پیدا کرتے ہیں۔

اردو ادب اور قومیت اسلامیہ

جو شخص اردو ادباء کی تحریروں اور شعراء کے ان اشعار کا مطالعہ کرے گا جو یورپ کے خلاف ترکی کی لڑائیوں کے دوران کہے گئے تو وہ محسوس کرے گا کہ یہ ادباء ترکی میں رہ رہے ہیں اور ترکی ہی ان کا وطن ہے، ترکی کی کامرانیوں اور فتح مندیوں پر ان کے چہرے کھل اٹھتے اور اس کی شکستوں اور ناکامیوں سے ان پر حزن و ملال کے بادل چھا جاتے ہیں، نیز وہ محسوس کرے گا کہ ہندوستانی مسلمان کا دل ہر اس واقعہ پر دھڑکتا ہے جو عالم اسلام کے کسی بھی حصہ میں رونما ہوتا ہے، اور خاص طور پر جب وہ حادثہ کسی عربی، ایرانی یا ترکی علاقہ میں پیش آتا ہے، تو اس کا حزن و ملال اور شدید ہو جاتا ہے اور اس کی بے چینی مزید بڑھ جاتی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی

جنگ بلقان وطرابلس سے متعلق علامہ شبلی نعمانی کی ایک نظم ملاحظہ ہو، کہتے ہیں:

مراکش جاچکا ، فارس گیا ، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تا کے یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

زوال دولت عثماں ، زوال شرع و ملت ہے
عزیزو! فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگ اذاں کب تک

کہیں اڑکر نہ دامان حرم کو بھی یہ چھو آئے
غبار کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیراں کب تک

ہندوستان کے مسلمان شعراء کا عربوں، ترکوں اور پوری دنیا کے مسلمانوں کے واقعات سے متاثر ہونا اور ان کے مسائل سے دلچسپی لینا ایک عام اور مشترک بات ہے جس میں اردو کے سارے شعراء شریک ہیں، اور یہ رجحان مختلف مواقع پر ظاہر ہوتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ مسلمان اردو شاعر کا دل ہمیشہ اپنے غیر ہندوستانی مسلم بھائیوں کے ساتھ وابستہ اور اسلامی جذبہ سے لبریز ہوتا ہے، چنانچہ شاعر اسلامی آثار و نقوش کی عظمت کے گن گاتا ہے، اور کسی بھی مسلمان ملک میں پیش آنے والے واقعات پر خون کے آنسو روتا ہے خواہ اس ملک کی زبان اور اس کا کلچر کچھ بھی ہو۔

علامہ اقبال

یہ عالمی اسلامی جذبہ اس کی طاقت ور ترین شکل میں اقبال کے کلام میں دیکھا جاسکتا ہے، جنھوں نے امت عربیہ کو خطاب کیا، مسئلۂ فلسطین کا درماں سوچا، اندلس پر آنسو بہائے، اور قرطبہ اور جامع قرطبہ کی زیارت کے موقع پر وہ دلکش نظم کہی جو ان کی عمدہ ترین نظموں میں شمار ہوتی ہے، نیز وہ اپنے اشعار میں جا بجا امام رازی، مولانا رومی، شیخ ابن عربی، حکیم ابو علی سینا اور امام غزالی جیسے دانشوران اسلام، مسلمان فلاسفہ اور مصلحین امت کے حوالے دیتے ہیں اور ان کی عظمت کے گن گاتے ہیں۔ اقبال

اپنے اندر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا بے پناہ جذبہ بھی رکھتے ہیں، جنہیں وہ رسول عربی کا لقب دیتے ہیں اور عربی کا لفظ بار بار لاتے ہیں اور اپنے کو مقامات مقدسہ کی زیارت کرتا ہوا اور وہاں کی فضاؤں میں پرواز کرتا ہوا تصور کرتے ہیں۔

اقبال اس بات کو کبھی فراموش نہیں کرتے کہ وہ اصلاً ہندوستانی بلکہ ہندو ہیں، اور اپنے اشعار میں اسے بیان کرتے ہیں۔قرطبہ سے متعلق اپنی نظم میں کہتے ہیں:

کافر ہندی ہوں میں ، دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلاۃ و درود ، لب پہ صلاۃ و درود
شوق مری لے میں ہے،شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ھو میرے رگ و پے میں ہے

اقبال اپنا اور مسجد کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تیری فضا دل فروز ، میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور، مجھ سے دلوں کی کشود
عرش معلیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کف خاک کی حد ہے سپہر کبود
پیکر نوری کو ہے سجدہ میسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز و گداز سجود

مغربی تہذیب پر تنقید

اگر چہ اقبال کی نشو ونما اور تعلیم و تربیت مغربی ماحول اور وہاں کی فضاؤں میں ہوئی تھی، اور انہوں نے مغربی علوم میں کمال پیدا کیا اور مغربی ثقافت و کلچر سے متاثر بھی ہوئے لیکن ان کی اسلامیت غالب آئی اور وہ مغرب کا حلقہ بگوش ہونے کے بجائے اس کے باغی ہوئے، اور مغربی تہذیب کو اپنی کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کی تنقید و بغاوت کا نقطۂ آغاز اور باعث اسلامی ملکوں کے تئیں یورپ کے ظالمانہ اور اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اس کی عداوت پر ان کا ردعمل تھا۔ اگر چہ اقبال کے دور میں مسلمانوں سے انگریزوں کے انتقام لینے کی آندھی تھم چکی تھی لیکن اقبال کے دل پر ہر اس واقعہ سے چوٹ لگتی تھی جو عالم عربی میں پیش آتا اور مغربی تہذیب کے اس خطرہ سے ان کا دل کڑھتا اور بے چین تھا جو اسلامی تہذیب کو لاحق تھا۔ کیونکہ اقبال نے فرنگی تہذیب کی بنیادی کمزوریوں، اس کے دبتے ہوئے پہلوؤں اور اس عنصری فساد اور بگاڑ کو دیکھ لیا تھا جو اس کی سرشت اور اس کی طینت میں موجود تھے۔

انہوں نے دیکھا کہ مغربی تہذیب سے متاثر ذہن مذہب اور اخلاقی و روحانی اقدار کے ساتھ کیسا معاملہ کرتا ہے، انہوں نے فساد قلب ونظر کو اس تہذیب کی روح کی ناپاکی کا ثمرہ بتایا ہے، جس نے اس سے قلب سلیم کی دولت چھین لی۔

فساد قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب
کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید
ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

آگے کہتے ہیں:

یہ عیش فراواں یہ حکومت یہ تجارت
دل سینۂ بے نور میں محروم تسلی
تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے
یہ وادئ ایمن نہیں شایان تجلی
ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیب جواں مرگ
شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

اکبر حسین الہ آبادی

اکبر حسین الہ آبادی (۱۸۴۶-۱۹۲۱ء) ان لوگوں میں تھے جنہوں نے ہندوستان میں انگریزوں کا دورعروج اور علوم جدیدہ کا غلبہ دیکھا تھا، جب کہ مغربی تہذیب کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا، اور ہندوستان میں مدرسۃ العلوم (حال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے بانی سر سید احمد خاں کی قیادت میں مغربی تہذیب اور اسلامی ثقافت کے درمیان تال میل پیدا کرنے کی زبردست تحریک چل رہی تھی۔اکبر الہ آبادی خود بھی سرکاری اسکولوں کے تعلیم یافتہ اور علوم جدیدہ سے واقف تھے۔ عدالتی عہدوں اور مناصب پر بھی فائز رہے، انگریزی حکومت نے انہیں خان بہادر کا لقب بھی دیا تھا۔اکبر اپنے دور کے اردو کے بڑے شعراء میں شمار ہوتے تھے،ان کے تین شعری مجموعے ادبی واسلامی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں اور مشہور ہیں، بڑے بڑے ادباء وشعراء ان کے کمال فن کے معترف ہیں،اور وہ اردو کی ظریفانہ

اصلاحی شاعری کے امام تسلیم کئے جاتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی نے مغربی تہذیب کو ترجیح دینے اور مغربی کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے کے رجحان کا سختی سے مقابلہ کیا، اور زندگی بھر مغربی تہذیب پر تنقید ان کی شاعری کا موضوع رہا۔ یہاں تک کہ اردو انسائیکلوپیڈیا نے یہ کہتے ہوئے ان پر تنقید کی کہ انہوں نے مغربی تہذیب پر تنقید کرنے میں مبالغہ سے کام لیا ہے، حتی کہ انہوں نے ہر اس اصلاحی عمل اور مفید کوشش کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے جس میں مغربی افکار کے سرایت کر جانے کا خدشہ بھی انہیں محسوس ہوا۔

مغربی تعلیم وتہذیب اور مغربی افکار وخیالات پر تنقید کے سلسلہ میں اکبر الہ آبادی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، کہتے ہیں:

مغربی روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے، وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

تہذیب جدید میں سوائے مادہ پرستی اور ظاہر بینی کے کچھ نہیں، کہتے ہیں:

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے
کل مست عیش و ناز تھے ہوٹل کے ہال میں
اب ہائے ہائے کر رہے ہیں اسپتال میں
ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر
جو پوچھا دل سے اس جینے کا کیا مقصود آخر ہے
شکم بولا کہ اس کی بحث کیا خادم تو حاضر ہے
بتائیں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

ڈارون کے نظریۂ ارتقائے آدم پر تنقید ملاحظہ ہو:

نیست کس مصروف کار دیں بقلب مطمئن
یک فنا فی الآثار است و یک فنا فی الدارون
ڈارون صاحب حقیقت سے بہت دور تھے
میں نہ مانوں گا کہ آباء آپ کے لنگور تھے
نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے
جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب
سرفرازی ہو اونٹوں کی تو گردن کاٹیے ان کی
اگر بندر کی بن آئے تو فیض ارتقاء کہیے

اور انگریزی اقتدار کے بعد قوم کی حالت کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نئی نئی لگ رہی ہیں آنچیں ، یہ قوم بیکس پگھل رہی ہے
نہ مغربی ہے، نہ مشرقی ہے، عجب سانچے میں ڈھل رہی ہے
وزن اب ان کا معین نہیں ہوسکتا کچھ
برف کی طرح مسلمان گھلے جاتے ہیں

اور یہ انداز بھی ملاحظہ ہو:

انھی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں ، زبان میری ہے بات ان کی
انھی کی محفل سنوارتا ہوں ، چراغ میرا ہے ، رات ان کی
فقط میرا ہاتھ چل رہا ہے ، انھی کا مطلب نکل رہا ہے
انھی کا مضمون ، انھی کا کاغذ، قلم انھی کا ، دوات ان کی

اکبرالہ آبادی تنقید برائے تنقید کے قائل نہیں تھے، بلکہ انہیں مسلمانوں کو ان کی اسلامیت اور دینی غیرت پر قائم رکھنا مقصود تھا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ تم ترقی جتنی چاہے کرو، سب روا ہے، بس ایک بات یاد رکھنا کہ اللہ کو اور اپنی اسلامیت کو فراموش مت کرنا:

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو
جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اردو شاعری غیرت اسلامی کی مثالوں سے بھری پڑی ہے، اور یہ غیرت مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی ہے، کبھی تو مغربی تہذیب پر تنقید کی شکل میں۔ کبھی مسلمانوں کی عظمت رفتہ پر اظہار حسرت و افسوس اور تہذیب اسلامی کی تقدیس و ثنا خوانی کی صورت میں۔ کبھی ان مشکلات و مصائب کی تصویر کشی کی شکل میں جن سے مسلمان دوچار تھے اور ہیں۔ اور کبھی تاریخ اسلامی گذشتہ کارناموں کے تذکرہ کی شکل میں۔ اس قبیل کی شاعری میں شیخ عبدالرزاق کلامی کی صمصام الاسلام، حفیظ جالندھری کی شاہنامۂ اسلام، خواجہ الطاف حسین حالی کی مسدس حالی اور اسلامی تعلیم و تربیت اور مسلمانوں کی پسماندگی و زبوں حالی کی تنقید کے موضوع پر مسلمان شعراء کی نظمیں شامل ہیں۔ نیز اردو ادب کا دامن تعلیم و تربیت، تزکیۂ نفس، زہد و توکل اور صبر و استقامت کے بیش بہا سرمایہ سے بھی مالا مال ہے، اور بڑے بڑے شعراء نے ان موضوعات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔

اردو نثر

جذبۂ اسلامی کو پیش کرنے، مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی لینے اور اسلامی بیداری کی عکاسی کرنے میں اردو نثر کا حصہ شعر سے کم نہیں بلکہ بڑھا ہوا ہے، کیونکہ نثر کا دامن اشعار سے زیادہ وسیع ہے، یہ علم و فن، ادب و دعوت اسلامی اور اصلاح معاشرہ سارے پہلوؤں کو محیط ہے۔ اردو زبان نے اپنی نشو و نما کے اس مرحلہ پر ایک طویل مسافت طے کی ہے، اور وسیع رقبہ پر مشتمل ہے، اور بہت سے ایسے علمی و دینی ذخائر اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے جو قدیم اسلامی زبانوں کے ذخیروں کے ساتھ

ہمسری کا دعوی رکھتے ہیں۔ بلکہ اردو میں اسلامی موضوعات پر بعض ایسی کتابیں اور مضامین موجود ہیں جن کی نظیر دوسری زبانوں میں نہیں ملتی، ان میں تاریخ وسیرت نبوی ،مشاہیر اسلام وحکمائے اسلام کی سیرت اور قرآن وحدیث اور فقہ کے موضوع پر متعدد اسلامی دائرۃ المعارف اور انسائیکلو پیڈیا معرض وجود میں آچکے ہیں جو اردو والوں کو دوسری زبانوں سے مستغنی بناتے ہیں، نیز دیگر اسلامی زبانوں جیسے فارسی، عربی اور ترکی کا سارا سرمایہ اردو زبان میں منتقل کیا جاچکا ہے، چنانچہ تحقیق وریسرچ کا کام کرنے والوں کو اس زبان میں کسی بھی موضوع پر کم مائگی، تہی دامنی یا نقص وکمی کا احساس نہیں ہوتا۔اور یہ اسلامی اثرات نثر کی تمام اقسام جیسے ناول، افسانے، حکایات ،کہانیوں اور ضرب الامثال سب میں پائے جاتے ہیں۔

اردو زبان میں دعوت اسلامی، تربیت اسلامی اور اصلاح معاشرہ کے موضوع پر ایک وقیع کتب خانہ وجود میں آچکا ہے، اور ابھی تک برابر اردو زبان میں ایسے مصنفین ومؤلفین پیدا ہوتے جارہے ہیں جو جدید نسل کی تربیت اور اس میں اسلامی شعور پیدا کرنے کا کام کررہے ہیں۔

اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں اور اسے آسان وعام فہم بنانے میں فکر اسلامی اور حاملین فکر اسلامی وعلم برداران دعوت اسلامی کے اثرات کا اعتراف تاریخ ادب اردو کے مؤرخ رام بابو سکسینہ نے بھی کیا ہے، ان کی کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ مرزا احسن عسکری نے ۱۹۲۵ء میں کیا، یہ کتاب اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم مرجع شمار ہوتی ہے، مؤلف کتاب کہتے ہیں:

''مولوی اسماعیل صاحب کا مشہور رسالہ تقویۃ الایمان اور نیز دیگر مریدان مولوی سید احمد کی تصانیف مثلاً ترغیب جہاد، ہدایۃ المؤمنین، نصیحة المؤمنين (أو المسلمين) موضح الکبائر و البدعات، مأۃ مسائل وغیرہ، ان سب سے اردو زبان کو بھی ضرور تقویت پہونچی''۔

آگے لکھتے ہیں:

اس کے علاوہ ادب اردو کے تاریخ نگار مستشرق گارساں دتاسی کے مطابق وہ اثرات بھی سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے حق ہی میں جائیں گے جس سے مسلمان فرقوں کی تصانیف مثلاً (۱) سید احمدیوں (۲) ہندوستانی وہابیوں اور (۳) روشنائیوں وجود میں آئیں، نیز سید احمد شہید کے دوبارہ ظہور پذیر ہونے پر رسالے لکھے گئے''۔

ان تصنیفات نے اردو نثر کی گردن سے جو تکلفات سے گراں بار تھی، تصنع، تکلف، تسجیع و ابہام کا قلادہ اتار پھینکا، اور اس کی جگہ صاف گوئی، جرأت، بیباکی، سادگی و سلاست کا ہار پہنایا، جس پر سید احمد شہیدؒ کے رفقاء کی نثر نگاری کی بنیاد قائم ہے۔

اردو صحافت

اردو نثر کی ترویج و ترقی میں اردو صحافت کا بھی اہم رول ہے جو ہمیشہ ذمہ دار

صحافت رہی ہے، اوراس میدان میں دینی واصلاحی صحافت کا قابل ذکر کردار رہا ہے، رسالوں اور اخباروں میں لکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد سید احمد شہیدؒ کی جماعت مجاہدین، اور دینی جذبے کے حامل علماء کی طرف منسوب رہی ہے، اوراس میدان میں دبستان سید احمد خاں اور ان کے مدرسۃ العلوم سے متعلق افراد بھی شریک ہیں، اورخاص طور پر اردو صحافت کوفروغ ہندوستان کی جنگ آزادی، خلافت عثمانیہ کے زوال اور انگریزوں کی شہ پر ہندوستان کے مختلف طبقات میں ہونے والی کشمکش اور فرقہ وارانہ فسادات کے دور میں حاصل ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

ہندوستانی صحافت میں ہمیں ۱۹۱۲ء کے ان خونریزیوں اورالمیوں کی گونج سنائی دیتی ہے جب خلافت عثمانیہ یورپ کی ترک تازیوں اور چیرہ دستیوں سے دوچار تھی، اور بہت سے محکوم ممالک اس کے اقتدار سے نکل گئے، اوران پر یورپی ممالک کا قبضہ ہوگیا، شعراء کی طرح ادباء نے بھی عالم اسلام کے ان واقعات کی تصویر کشی دل کھول کر کی، اور مغربی تہذیب پرکڑی تنقید کی، اور عالم اسلامی پر یورپی ظلم و جور کی مذمت کرتے ہوئے مغرب کی سفاکیوں اور چیرہ دستیوں سے پردہ اٹھایا، جن ادباء نے عالم عرب اورافریقہ کے اسلامی ممالک کے مسائل کوپیش کیا ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام سرفہرست ہے، جو اپنے پرجوش ادب، سیال ورواں قلم، اپنی ادبی تحریروں اور دلچسپ اسلوب کے لئے مشہور ہیں، چنانچہ وہ الہلال کے ۱۳؍جولائی ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں لکھتے ہیں:

''مراکش میں عربی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور طرابلس معرض خطر میں ہے، ایسی حالت میں قدرتی طور پر افریقہ کے عہد اسلامی کا ماضی قریب یاد آجاتا ہے۔''

''طرابلس میں آج جو بازار قتال گرم ہے الجزائر پوری ایک صدی تک اس میں مبتلا رہا جو شمالی افریقہ میں سب سے بڑی اسلامی مملکت تھی، اور جس کے لئے پہلی صدی ہجری میں عہد نبوت کا صحبت یافتہ خون بہایا گیا تھا۔ مسلسل خونریزیاں، پیہم عہد شکنانہ سفا کیاں، قتل عورات و اطفال، احراق منازل و بلدان، ہتک مساجد و اشراف اور تمام وحشیانہ اور بربری مظالم جو مسیحی غلبہ و غضب کے لازمی اجزاء ہیں، فرانس کے ہاتھوں ایک ایک کرکے الجزائر کی نصف کروڑ کی آبادی پر گذرے اور بالآخر جانبر نہ ہوسکا۔'' (الہلال، جلد اول، ۱۳؍جولائی ۱۹۱۲ء، صفحہ ۷)

عثمانی مجاہد طرابلس یوزباشی جاوید بک کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دنیا میں تلوار اور قلم ایک ہاتھ میں کم جمع ہوتے ہیں تلوار کا آہنی قبضہ شاید اس قدر سخت ہے کہ اس کی گرفت کے بعد انگلیوں میں قلم کی گرفت کی صلاحیت باقی نہیں رہتی، لیکن سرزمین اسلام کے اعجوبہ زار میں کون سی شے تعجب انگیز نہیں؟ تخت حکومت اور بوریائے درویشی، گلیم فقر اور خلعت شاہنشاہی، محراب عبادت اور

ایوان سلطانی، دبدبہ وسطوت اور عدل ومساوات، دولت وتجارت اور توکل وقناعت، اشتغال دنیوی اور زہد وعبادت، ترقیات مادی اور تصفیۂ روحانی، اعتماد نفس وتدبیر اور تفویض واعتقاد تقدیر، غرض کہ سینکڑوں جذبات واعمال ہمیشہ باہم مخالف چلے آتے تھے، جنہوں نے سب سے اول اس کے جامع اضداد دورِ خصوصیت میں ایک دوسرے سے معانقہ کیا۔ منجملہ ان کے ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ تیغ وقلم کی قدیمی مخالفت مٹا کر دونوں کو ایک جگہ جمع کردیا، ممکن ہے کہ دیگر اقوام میں اس کی خال خال مثال ملے، لیکن اسلام کی تاریخ اس کی سینکڑوں مثالوں سے لبریز ہے''۔

(الہلال، جلد اول، ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء، صفحہ ۱۱-۱۲)

ایک مقام پر ان لوگوں کا جواب دیتے ہوئے جو مسلمانوں کو یورپ یا ہندوؤں کے اتباع کی تلقین کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

جب اتباع دین اور اعتصام بحبل اللہ المتین کی شمعیں خود ان کے یہاں فروزاں ہیں تو ان کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے ٹمٹماتا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت ہے؟ انہوں نے واضح طور پر لکھا:

''مسلمانوں کو ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہوگا ان کے لئے کبھی موجب فلاح وفوز نہیں ہوسکتا۔ (الہلال ۱۳ر اکتوبر ۱۹۱۲ء)

یہی نہیں بلکہ انہوں نے سختی کے ساتھ لکھا کہ:

''ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل اور اعتقاد کے لئے بھی قرآن کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں، بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم بلکہ مشرک ہوگا۔'' (الہلال ۸/ستمبر ۱۹۱۲ء)

اگر ہم اردو زبان وادب کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ناول، افسانے، ڈرامے اور تاریخ میں اسلامی جذبہ اور دینی وتربیتی عناصر کا کتنا غلبہ ہے، اور ہم دیکھیں گے کہ ادباء نے ان ادبی اصناف میں بھی اسلامی مسائل اور مسلمانوں کی زندگی کی مشکلات پیش کی ہیں، اور تاریخ اسلامی کی فتح مندیوں اور کامرانیوں کے ساتھ ساتھ اس کی شکستوں اور ہزیمتوں اور اسلامی تاریخ کے پردرد و پر اثر واقعات پر بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح بہت سے ادباء نے اسلامی زندگی کی مشکلات اور اسلامی معاشرہ کی راہ میں حائل دشواریوں کو بھی اصلاح کی غرض سے اپنے ناولوں اور قصوں میں جگہ دی ہے، مثلاً عبدالحلیم شرر کہ ان کا مؤثر واقعات اور داستانوں کا ایک طویل سلسلہ ہے، جن میں انہوں نے زیادہ تر مصائب ومشکلات کی تصویر کشی کی ہے، اور ان کی اس طرح کی کتابوں کو بڑی مقبولیت ملی اور شہرت دوام حاصل ہوئی۔

اردو میں تاریخ کی کتابوں نے بھی اسلامی غیرت وحمیت کو مہمیز دینے اور اخلاف کا تعلق اسلاف سے استوار کرنے میں قائدانہ کردار ادا کیا ہے جو تاریخ کا وظیفہ ہے، انگریزی سامراج چاہتا تھا کہ امت کا تعلق اس کے ماضی سے کاٹ دے

اور غلط سلط تاریخ پیش کر کے نئی تعلیم یافتہ نسل کے ذہنوں میں شکوک وشبہات کا بیج بودے، لیکن آفریں ہے اردو تاریخ نویسوں پر کہ انہوں نے ماضی پر ان کا اعتماد بحال کیا اور ان کے آباء واجداد نے سیاست، علم، ادب اور فن کے میدانوں میں جو جرأت مندانہ کارنامے انجام دیئے تھے ان کی عظمت وتقدیس ان کے دلوں میں پیدا کی، ان مؤرخین کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کا اسلامی جذبہ نیز اسلامی رنگ اور قابل عبرت و موعظت باتوں کو نمایاں کرنے کی ان کی کوشش موضوع کے ساتھ انصاف کرنے سے مانع نہیں ہوتی تھی، چنانچہ وہ لائق عبرت باتوں کی طرف توجہ بھی دلاتے تھے لیکن اس کے باوجود تاریخی پیشکش میں کوتاہی نہیں کرتے تھے، اور اپنے موضوع سے ہم آہنگ یہ تاریخ اپنے جذباتی ومؤثر اسلوب کے نتیجہ میں ایک دلآویز ادبی موضوع بن جاتی، اس کے نتیجہ میں قاری عالمی اسلوب سے قریب تر آسان تاریخی اسلوب کی پیشکش سے جذبات کی عکاسی اور قلبی ووجدانی جوش کی طرف منتقل ہوتا جو دلوں کو حیرت زدہ کر دیتا اور جو وجدانی ادب سے قریب تر ہوتا تھا۔

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ

اس اسلوب کے بہترین نمائندے مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ اور علامہ شبلی نعمانیؒ تھے، قاری ان کی تاریخی تحریروں میں ایسے شاہکار ٹکڑے پاتا ہے جو اپنی تاثیر و دلآویزی میں کسی فنی نثری ٹکڑے سے کم نہیں ہیں، بلکہ بعض مرتبہ وہ نثری شاعری کے ٹکڑے معلوم ہوتے ہیں، اور یہ رنگ سفرناموں، سیرت وسوانح، ملکوں کی تاریخ اور

اسلامی ثقافت کی تاریخ نیز دیگر اقسام میں ظاہر ہوتا ہے۔

اسلامی جذبہ کی تاثیر ودلآویزی

اسلامی جذبہ اور اسلامی رنگ اردو زبان کا ایک شعار اور جزء لا يتجزأ بن گیا تھا، جس سے نہ کوئی تاریخی کتاب خالی ہوتی اور نہ سفر نامہ، یا ایسا کوئی مضمون جس میں اسلامی دور کے فن تعمیر یا اسلامی دور کے تاریخی آثار مثلاً حوض، تالاب، باغات، سائنسی وعلمی جائزے یا فضائی رصد گاہیں اور مناظر فطرت سے متعلق مضامین پیش کئے گئے ہوں، اور قاری ان تحریروں میں ان کی کچھ جھلکیاں پاتا ہے، اور اگر ان کا تعلق کسی المیئے، یا کسی تاریخی یادگار کے مٹنے سے ہوتا تو قاری ان کے درد وغم اور حسرت وافسوس میں ڈوبے ہوئے بیان میں اس خسارہ کی تفصیل پاتا جو اس کو پہونچا ہوتا یا عبرت کی جو باتیں ان میں ہوتیں ان سے درس عبرت لیتا۔

ہندوستان کے ایک بڑے اسلامی مؤرخ علامہ سید عبدالحی حسنی جن کی کتاب ہندوستان کے مشاہیر اہل کمال کے تذکرہ میں " نزهة الخواطر و بهجة المسامع و النواظر "اور" الهند في العهد الإسلامي " (اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں) ہے، ۱۸۹۴ء میں یعنی ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ کے تقریباً پچاس سال بعد دہلی، سہارنپور اور اطراف کے اسلامی آثار، علمی اسلامی مراکز اور علماء و بزرگان دین کی زیارت کو نکلے، اور اپنے سفر کے تأثرات اور یادداشتیں ''دہلی اور اس کے اطراف'' کے عنوان سے اردو میں شائع کیں، یہ یادداشتیں ان کے بے پناہ بلکہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اسلامی جذبہ کی عکاسی کرتی ہیں، اور ان کے بعض مقامات قاری

کوخون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیتے ہیں، جب وہ اپنے دردمند قلم اور زخمی دل سے اسلامی آثار کی کہنگی و بے بسی اور ان کی خستہ حالی کا تذکرہ کرتے ہیں، اور یہ بتاتے ہیں کہ سیاسی انقلاب نے ان میں کیا تبدیلیاں کیں اور ان کو کیا سے کیا بنا دیا۔ لیکن اب بھی وہ شاندار دور کی یاد دلاتے ہیں۔

لال قلعہ کی سیر کے وقت ان کا یہ جذبہ چھلک پڑتا ہے اور وہ کہتے ہیں:

''ہم مسجد سے براہ راست قلعہ گئے، یہ قلعہ بالکل سنگ سرخ کا بنا ہوا ہے، اپنی لطافت اور سبکی میں بے نظیر ہے، دروازہ پر ایک گورا ٹہل رہا تھا، اس نے ٹکٹ لے لیا، اور ہم اندر روانہ ہوئے، قلعہ کے اندر جانے کے بعد متعدد دروازے اور ڈیوڑھیاں مسلسل ملتی ہیں، ان میں اب آج کل گورا بازار ہے، اس سے نکل کر پھر بالکل ویران اور غیر آباد ہے، کہیں کہیں انگریزی عمارتیں اور بارکیں بنی ہوئی ہیں، شاہی عمارتیں بالکل متأصل کردی گئی ہیں، ان کے نشانات اب صرف دربار عام کے ایک درجہ سے اور دربار خاص وحمام ومسجد و مثمن برج سے معلوم ہوتے ہیں، جن کے دیکھنے سے ایسی عبرت و رقت ہوتی ہے جو کسی طرح بیان میں نہیں آسکتی۔ سبحان اللہ! یہ وہ مکانات ہیں جن میں ہر کس و ناکس کے پہونچنے کی مجال نہ تھی، بڑے بڑے امراء ہفت ہزاری و پنج ہزاری دربار عام تک پہونچنے کو فخر و سعادت سمجھتے تھے، وہی تخت جس کے

سامنے درباری اکبری و جہانگیری میں سجدہ کرتے تھے، اور درباری شاہجہانی و عالم گیری میں اس کے پائے کو بوسہ دینے کو فخر سمجھتے تھے، آج ادنی ادنی گورا جوتہ پہنے ہوئے اسی کو روندتا ہے۔ فاعتبروا یا أولی الأبصار . الملك لله ، و الأمر لله ، و الأرض لله ، یورثها من یشاء .

مجھ کو معاف کیجئے گا، ان مکانوں کے دیکھنے سے میرا دل ایسا بے قابو ہے کہ میں ان کے حالات بیان کرنے سے بھی قاصر ہوں، بلکہ جو شخص ان درباروں کی ہسٹری اور قلعہ کی جاگرفی سے ماہر ہے وہ کیا ممکن ہے کہ ان کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو نہ روئے، اس کا دل بے چین نہ ہوجائے، اس کے بدن پر رونگٹے نہ کھڑے ہوجاویں، اس کی آنکھوں کے سامنے خدا کی سچی عظمت و ہیبت نمودار نہ ہوجائے، دنیا کے فانی ہونے کا پردہ نہ اٹھ جائے، ذرا تھوڑی دیر کے واسطے آپ حدیقۃ الاقالیم میں محمد شاہی دربار کا سماں دیکھ لیجئے، پھر عالم شاہی دربار کا تنزل ملاحظہ فرمایئے، پھر ان ٹوٹی پھوٹی دیواروں میں کرّ و فرشاہی کے آثار دیکھئے۔ اللہ اللہ ، و لا موجود إلا لله ۔

اب نہ وہ زمانہ ہے، نہ وہ لوگ ہیں، نہ بادشاہ ہیں، نہ ان کے درباری، یہ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں باقی ہیں، جو زبان حال سے

مسلمانوں کے اقبال وادبار، ترقی وتنزل کا بیان کررہی ہیں، بڑا سنگ دل ہے وہ شخص جوان کو دیکھ کر نہ رواٹھے، بڑا قاسی القلب ہے وہ مرد جوان کو دیکھ کر متاثر نہ ہو، بڑا بے حمیت ہے وہ مسلمان جو مسلمانوں کے اقبال وادبار کی ان حقیقی تصویروں کو دیکھ کر خاموش رہے، بڑا بے غیرت ہے وہ نیچری جو کارخانۂ قدرت کی ان نیرنگیوں کو دیکھ کر اپنے عقیدہ پر نادم نہ ہو۔

کیا یہ وہی دربار خاص ہے جن میں بڑے بڑے سلاطین ہند علی قدر مراتب کھڑے ہونے کو فخر سمجھتے تھے، کیا یہ وہی تخت ہے جس کے سامنے بڑے بڑے مہاراجہ سر جھکانے کو اپنا دین وایمان جانتے تھے، یہ سب کارخانۂ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، فانی ہے اور زائل تمام کائنات۔اور باقی ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی موت وحیات ہے،جس کی قدرت اور بقاء پر عالم کے نشیب وفراز، گرم وسرد، تلخ وشیریں، تغیرات وحوادث باواز بلند گواہی دے رہے ہیں،کل شئ هالك إلا وجهه۔"

مؤرخ کا قلم رکتا نہیں بلکہ وہ ان آثار کی مزید تصویر کشی کرتا جارہا ہے اور اپنے رنج وغم کا اظہار پر درد اسلوب میں کررہا ہے، ادھر قاری کا حال یہ ہے کہ وہ جملہ پر رکتا ہے، آہ سرد کھینچتا ہے اور جب اس کے غم کو ذرا سکون ملتا ہے تو آگے بڑھتا ہے۔

یہ صرف ایک نمونہ ہے، اسی طرح سلاطین گجرات اور وہاں کی تاریخ بیان

کرتے وقت ان کا غم تازہ ہو جاتا ہے اور وہ ان فنی یادگاروں کو پیش کرتے ہیں جو مسلمانوں نے دنیا کے مختلف خطوں میں چھوڑی ہیں، تاریخ نگاران سے خود بھی متأثر ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی متأثر کرتا ہے، اور دلوں میں اسلام اور تاریخ اسلام پر فخر اور عظمت اسلامی کے ان مٹے ہوئے نقوش وآثار سے عبرت پذیری کا ایک طوفان بلاخیز اٹھتا ہے۔

یہ بعض نمونے اور مثالیں ہیں جو اردو زبان وادب اور شاعری میں اسلامی عنصر کی اثر انگیزی ودلآویزی کو پیش کرتی ہیں، اور یہ مثالیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کو تلاش کرنے والا کتابوں سے ان کو ڈھونڈھ نکالنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرے گا، یہ مثالیں نثر بدیع میں، ناول میں، افسانے اور تاریخ وسیرت میں، اور سفرناموں سب میں پائی جاتی ہیں۔ اور یہ بزرگوں کے مواعظ وملفوظات اور حکایتوں اور اشعار میں زیادہ مؤثر انداز میں ملتی ہیں، اس طرح اردو زبان نے کسی دوسری زبان کے مقابلہ میں اسلامی عنصر سے زیادہ اثر قبول کیا ہے، اور اس میں انحراف وبگاڑ کم سے کم آیا ہے، اور تاریخ کا کوئی بھی دور اس رنگ سے خالی نہیں رہا ہے، حتی کہ جدید دور میں بھی جب کہ مادہ پرستانہ مغربی تہذیب دنیا کی ہر زبان حتی کہ عربی زبان پر بھی اپنے شکنجے مضبوط کر چکی ہے، یہ رنگ موجود ہے۔

اردو ترجمہ: **اقبال احمد ندوی غازیپوری**

ڈاکٹر نسیم اختر ندوی

اردو زبان پر عربی زبان کے اثرات

اردو زبان پر عربی زبان کے کیا اثرات ہیں اور اثرات کس طرح پڑے اس کا مکمل احاطہ تو ذرا مشکل کام ہے۔لیکن اس کے چند پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنا مناسب ہوگا۔

عرب و ہند کے تعلقات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اگر ایک طرف ہندوستان اسلامی تہذیب وتمدن سے متاثر ہوا تو دوسری طرف اس نے اپنے علوم جیسے فلسفہ،علم نجوم وریاضیات سے عربوں کو متاثر بھی کیا۔

۲۳۵۰ ق م کے آس پاس سے جو دستاویزات میسو پوٹامیہ سے حاصل ہوئی ہیں ان میں ملوہا سے تجارتی تعلقات کا ذکر ملتا ہے۔ملوہا سندھ کے علاقے کا قدیم نام ہے۔میسو پوٹامیہ کی کتابوں میں ملوہا اور میسو پوٹامیہ کے درمیان دو منزلوں دلمن اور ماکن کا ذکر بھی ملتا ہے۔دلمن غالباً بحرین ہوسکتا ہے۔[۱] اس طرح ہندوعرب کے

۱۔قدیم ہندوستان ۔رام شرن شرما۔ترجمہ سید جمال الدین ۔اردو ایڈیشن ،این ،سی ،ای آر ٹی جولائی ۱۹۹۷، ص:۷۲

تعلقات بہت قدیم ہیں مگر ایک ہزار سال قبل مسیح کا ثبوت بآسانی ملتا ہے۔ اس وقت کے تجارتی سامانوں میں ایسے ۳۵ / سامان ہیں جنکی خرید و فروخت عرب و ہند کے درمیان ہوا کرتی تھی۔ یہاں ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عرب تجار کے ذریعہ عربی زبان کا ہندوستانی زبانوں سے سابقہ یقیناً پڑا ہوگا۔

محمد بن قاسم نے ۷۱۲ میں سندھ کو فتح کیا۔ اسلامی حکومت قائم ہوئی جس سے اس علاقے میں عربی ثقافت عام ہوئی اور عربی جاننے والوں کی تعداد میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا۔ پروفیسر منور کے مطابق:

> ''غزنوی خاندان کے زمانۂ آغاز تک اسلامی حکومتوں کی دفتری زبان بالعموم عربی تھی، علاوہ ازیں عربی، علمی زبان بھی تھی اور دینی زبان بھی۔ [۱]

اس سیاسی لسانی اور ثقافتی رابطہ کو قائم رکھنے میں غزنوی، غوری، خلجی، لودھی اور مغل حکمرانوں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ ان حکمرانوں کی عربی زبان اور اسلامیات سے دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف تغلقوں کے دور میں ایک ہزار مدرسے صرف دہلی میں موجود تھے۔ [۲]

مغلیہ دور کے وجود میں آنے سے قبل ہی ہندوستان کا ہر خطہ عربی زبان اور اسلامی علوم و فنون سے پوری طرح آشنا ہو چکا تھا۔ مدرسے بھی قائم ہوئے، خانقاہیں بھی وجود میں آئیں، علوم شرعیہ اور عربی زبان و ادب پر تصنیفات بھی سامنے آئیں۔ مغلوں کی زبان ترکی اور فارسی تھی مگر اسلام سے تعلق کی بنا پر عربی زبان اور اسلامی

۱۔ بحوالہ اردو پر عربی کے لسانی اثرات۔ ڈاکٹر رضوانہ معین، حیدرآباد۔ ص: ۲۴

۲۔ تاریخ ادبیات مسلمان پاک و ہند، ڈاکٹر محمد یوسف۔ جلد دوم عربی ادب ص: ۸

فنون کی تعلیم کو برتری حاصل تھی۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ عربی کی خدمت دراصل اسلام کی خدمت ہے۔ بقول ابو منصور الثعالبی جنہوں نے اپنی کتاب فقہ اللغۃ العربیۃ میں لکھا ہے: " من أحب الله أحب رسوله محمداً صلى الله عليه وسلم ومن أحب الرسول العربى أحب العرب ومن أحب العرب أحب العربية التى نزل بها أفضل الكتاب على أفضل البشر"۔

جہاں تک سوال ہے اردو زبان کا تو اس زبان کے آغاز مولد اور ماخذ کے بارے میں ماہرین لسانیات میں چند اختلافات موجود ہیں۔ بقول پروفیسر گیان چند جین کے کسی زبان کے آغاز کا مسئلہ طے کرنا ماہرین لسانیات کا کام ہوتا ہے۔ [۱]

ہاں اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اردو ایک ہند آریائی زبان ہے اور اسکی بنیاد کھڑی بولی ہے جو مغربی ہند کی ایک شاخ ہے، اس طرح اردو کا شجرۂ نسب کھڑی بولی کے وسیلے سے شورسینی اپ بھرنش سے ملتا ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی میں عربی اور فارسی کے الفاظ داخل ہوتے گئے اور اسکے صوتی مزاج میں ایک نمایاں فرق پیدا ہوتا گیا اس طرح وہ دیگر ہند آریائی زبانوں سے مختلف زبان کی شکل میں وجود میں آئی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو زبانیں دیگر زبانوں سے مل کر جنم لیتی ہیں وہ بہت جلد ترقی کرتی ہیں کیونکہ یہ دوسری زبان کے رسم الخط، الفاظ، مفردات اور قواعد سے پورا استفادہ کرتی ہیں۔ اردو انہیں خوش نصیب زبانوں میں سے ایک ہے جس نے لسانی

۱۔ بحوالہ اردو پر عربی کے لسانی اثرات۔ ڈاکٹر رضوانہ معین، حیدرآباد۔ ص:۴۹

مسائل میں ہندی اور فارسی کے علاوہ عربی کے حروف تہجی، رسم الخط، مفردات، الفاظ اور کچھ قواعد صرف ونحو سے پورا استفادہ کیا ہے۔

اردو کی ساخت میں بنیادی حیثیت ہندی کو حاصل ہے مزید برآں اس میں سنسکرت پراکرت، اپ بھرنش اور جدید ہند آریائی زبانوں کے عناصر شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں بیرونی الفاظ بھی شامل ہو چکے ہیں۔ مثلاً یونانی، پرتگالی، ترکی، انگریزی۔ مگر اردو زبان، عربی وفارسی سے خاص طور سے متاثر رہی ہے۔

اردو صوتیات کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے حروف تہجی میں ۲۹ر حروف عربی کے ہیں، پانچ فارسی کے، تین ہندی کے، کچھ لوگ مجہول ''ے'' کو شامل نہیں کرتے، اس طرح اردو میں چھتیس حروف ہوئے۔

اردو میں عربی ابجد کے تمام حروف اختیار کرنے کے اسباب یہ ہیں کہ جب عربوں نے ایران کو فتح کرلیا اور اہل ایران دین اسلام میں داخل ہو گئے تو انہوں نے اسلامی تہذیب وثقافت کو اختیار کرلیا۔ اپنی فارسی زبان لکھنے کے لئے بھی انہوں نے عربی رسم الخط قبول کرلیا۔ اردو پر فارسی کا اثر انداز ہونا تھا کہ عربی کے تمام حروف اس میں داخل ہو گئے۔ اردو رسم الخط کے بارے میں [۱] پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''اردو ایک ہند آریائی زبان ہے لیکن اس کا رسم الخط شاہی خاندان کی زبان عربی سے ماخوذ ہے''۔

پروفیسر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

۱۔ املا نامہ۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ص: ۱۷ بحوالہ اردو پر عربی کے لسانی اثرات۔ ڈاکٹر رضوانہ معین، حیدرآباد۔ ص: ۱۷

''اردو رسم الخط عربی رسم الخط کی توسیع شدہ شکل ہے، جس کا اطلاق پہلے ایرانی پر ہوا اور بعد کو ہندوستانی پر''۔ ۱

اور بقول پروفیسر سلیم ''اردو زبان کا رسم الخط درحقیقت عربی رسم الخط ہے''۔ ۲

اردو صرفیات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان میں مجرد الفاظ کا بڑا ذخیرہ عربی فارسی سے لیا گیا ہے۔قواعد کی بعض چیزیں مثلاً جمع بنانے کے قاعدے، حاصل مصدر کے لاحقے ،حروف جر وغیرہ عربی فارسی سے مستعار لئے ہیں۔اردو ادباء وشعراء نے عربی الفاظ کو تشبیہ، استعارہ، مزاج و کنایہ کے طور پر استعمال کر کے اس زبان میں خوبصورتی پیدا کی ہے۔سرسید، ڈپٹی نذیر، مولانا حالی، علامہ شبلی، ڈاکٹر محمد اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں اسکی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ عربی کے جتنے بھی تین حرفی افعال ہیں ان سب کے مصادر ۴۴؍اوزان میں سے کسی ایک وزن پر ضرور ہوں گے۔اور یہ سب نہیں تو بیشتر اردو میں مستعمل ہیں۔

ہم سبھی جانتے ہیں کہ عربی ایک اشتقاقی زبان ہے۔ایک ہی مصدر سے مختلف الفاظ بنائے جاتے ہیں۔مثلا اسم فاعل، اسم مفعول، مبالغہ، صفت مشبہ، اسم تفضیل، ظرف زماں ومکاں، اسم آلہ وغیرہ ان میں سے ہر ایک کے الفاظ کا ایک قابل قدر ذخیرہ اردو میں موجود ہے۔

۱۔مرتب ڈاکٹر عبدالستار دلوی۔اردو میں لسانی تحقیق ص:۳ بحوالہ سابق ص:۱۳

۲۔پروفیسر ایس۔ایم سلیم اردو رسم الخط ص:۱۱

دلچسپ بات یہ ہے کہ عربی ضمائر کا استعمال بھی اردو میں نظر آتا ہے۔ مثلاً کما حقہ، بجنسہ، بنفسہ، بعینہ، سلمہ، دامت برکاتہم، مخدومی، عزیزی اور مکرمی۔

اسمائے اشارہ کی مثال: کتاب ھذا، مدرسہ ھذا وغیرہ

عربی حروف کی مثال اردو میں: بالمشافہہ، بلاشبہ، فی الجملہ، مع اہل وعیال، علی ھذ القیاس، تحت الشعور اور حتی الامکان وغیرہ۔

حروف نفی کی مثال: لاأبالی، بلاترتیب اور بلاشبہ۔

عربی نحو کے اثرات بھی اردو میں نظر آتے ہیں۔ جیسے عربی مرکب اضافی کی مثال اردو میں:

اہل وطن، اہل نظر، ذوق نظر، صبر ایوب، حسن یوسف، رابطۂ ادب اسلامی۔

مرکب توصیفی کی مثال: فطرت سلیم، ید بیضا، عصر جدید، ادب اسلامی وغیرہ۔

علم بلاغت اور اردو کے باب میں غضنفر علی غضنفر نے اپنی کتاب مشرقی معیار نقد میں بلاغت کی بہت سی مصطلحات کا ذکر کیا ہے جو درحقیقت عربی کے صنائع و بدائع کی مصطلحات ہیں اور اسی معنی میں اردو میں مستعمل ہیں۔

مثلاً تشبیہ، مشبہ، مشبہ بہ، وجہ شبہ، استعارہ، مجاز مرسل، حسن تعلیل، ایہام، تضاد اور طباق وغیرہ۔

علم عروض میں اردو نے عربی سے بھرپور استفادہ کیا۔ شعر گوئی کے لئے ہر زبان میں کچھ اوزان ملتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ عربی میں اس کے جو اصول وقوانین ہیں انہیں عروض کہا جاتا ہے۔ خلیل بن احمد نراہیدی (متوفی ۷۸۶ء) اس فن کے موجد

ہیں۔ انہوں نے عربی شاعری کا جائزہ لیکر پندرہ بحروں کا نام متعین کیا، چار مزید بحروں کے نام کا اضافہ بعد میں کیا گیا۔

عربی کی ان انیس بحروں میں سے بارہ بحریں اردو میں مستعمل ہیں۔ ۱

آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ افعال اور حروف کی حد تک چاہے اردو پر عربی کے اثرات زیادہ نہیں ہیں مگر اسماء کی حد تک اردو میں بھی عربی کے مستعار الفاظ بے شمار ہیں اور انکی کثرت نے نہ صرف یہ کہ اس زبان کے مزاج کو اپنا زیر اثر بنایا بلکہ اس کو ایک جمالیاتی حسن اور معیار بھی عطا کیا۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ اسلام جب ایران میں داخل ہوا تو وہاں ایک لسانی انقلاب پیدا ہوا۔ ہم جانتے ہیں اگر قرآن نہ ہوتا تو آج عالمی سطح پر بولی، لکھی اور سمجھی جانے والی فصیح عربی زبان کا وجود نہ ہوتا۔ اس کتاب عظیم نے اس زبان کو باقی رکھا اور قرآن کے ساتھ ایرانیوں کے لگاؤ کی وجہ سے عربی حروف فارسی میں داخل ہوئے اور فارسی سے اردو میں آئے اس طرح اگر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اگر قرآن نہ ہوتا تو اردو زبان پر بھی عربی کے یہ اثرات نہ ہوتے۔

۱۔ پروفیسر مسعود حسین خاں۔ اردو میں زبان اور ادب ص:۴۶ بحوالہ ڈاکٹر رضوان معین۔ اردو پر عربی کے لسانی اثرات ص:۲۷۵

عارف عزیز
(بھوپال)

زبان وادب کی تشکیل میں اردو صحافت کا حصہ

اردو صحافت ، بنگلہ صحافت کے بعد ہندوستان کی قدیم ترین صحافت ہے، ہندی، مراٹھی، گجراتی یہاں تک کہ ہندوستانیوں کی انگریزی صحافت کا اسکے بعد آغاز ہوا، اردو کی اس صحافت نے ۱۹ویں صدی کے عہد ساز رجحانات کے فروغ میں جو تاریخی کردار ادا کیا، اس کا تو عام طور پر اعتراف کیا جاتا ہے، لیکن زبان وادب کی تشکیل وترقی میں جو حصہ لیا اس کو فراموش کر دیا گیا ہے۔ ۱۸۲۲ء میں ''جام جہاں نما'' اردو کا پہلا مطبوعہ اخبار تھا جو کلکتہ سے شائع ہوا۔ اردو صحافت کے اس باقاعدہ آغاز سے پہلے صرف دہلی سے بارہ ایسے قلمی اخبارات سپرد ڈاک کئے جاتے تھے، جن کا مقصد انگریزوں کے اقتدار کے خلاف عوام میں بیداری لانا، ان کو متحد کرنا اوران کے دل میں قومی جذبات کو پروان چڑھانا تھا، ان اخباروں کے وقائع نگاروں میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے۔ اس لئے لارڈ آک لینڈ اور لارڈ کیننگ کو کہنا پڑا کہ ''قلمی اخبارات نے عوام میں انگریزوں کے خلاف جذبات بھڑکا کر ۱۸۵۷ء کے

انقلاب کی راہ ہموار کی''۔۱۸۵۷ء میں گورنر جنرل کونسل کے رکن میکالے نے تو صحافت پر اپنے نوٹ میں یہاں تک لکھدیا کہ ''عام لوگوں میں دیسی زبانوں کی مطبوعہ صحافت کا اتنا اثر نہیں جتنا قلمی صحافت کا ہے، پیشہ ور وقائع نگاروں کے مرتب کئے ہوئے بے شمار اخبار ہندوستان میں نکلتے ہیں، ہر کچہری، ہر دربار کے باہر وقائع نگار منڈلاتے رہتے ہیں، صرف دہلی سے ہر روز ۱۲۰ قلمی اخبار بذریعہ ڈاک باہر بھیجے جاتے ہیں''۔مشہور محقق شانتی رنجن بھٹا چاریہ کے مطابق ''۱۹ ویں صدی میں یعنی ۱۸۲۲ء سے ۱۸۹۹ء تک کم وبیش پانچ سو اخبارات ورسائل ہندوستان کے کونے کونے سے منظر عام پر آئے''۔

ظاہر ہے مذکورہ اخبارات نے جہاں عوام میں سیاسی شعور کی تخم ریزی کر کے جذبہ حریت کو پروان چڑھایا، اپنے قارئین کو جدید فکر اور علوم سے آشنا کیا، وہیں اردو زبان وادب کی تشکیل میں غیر معمولی خدمت انجام دی، بالخصوص فارسی آمیز مقفع و مسجع عبارت اور بوجھل الفاظ سے اردو زبان کا پیچھا چھڑا کر، عوامی زبان بنانے میں ایک اہم کردار نبھایا، جس کے نتیجہ میں اردو زبان برق رفتاری سے ایک ترقی یافتہ زبان کے سانچے میں ڈھلتی چلی گئی، لیکن اردو صحافت کے اس کردار کو عام طور پر نظر انداز کیا گیا۔ مؤرخ وناقد بھی اس سچائی کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے کہ اردو اخبار ورسائل نے اپنی زبان کو بولی سے زبان تک کے سفر میں گراں قدر حصہ لیا، اس میں سیکڑوں نہیں ہزاروں نئے الفاظ ومحاوروں کا اضافہ کیا اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے، اردو زبان وادب، انگریزی یا دوسری عصری زبانوں کے الفاظ ومحاروں سے آج مالا مال ہے، تو یہ بھی اردو صحافت

کی دین ہے۔ مثال کے طور پر پروفیسر، ٹیچر، انجینئر، ڈاکٹر، اسپیکر، پارلیمنٹ، اسمبلی، سپریم کورٹ، ہائی کورٹ، سیکولرزم، کمیونزم، سوشلزم، فرنٹ، روڈ، بائیکاٹ نوٹس وغیرہ وہ الفاظ ہیں جو آج اردو زبان کا جزء لاینفك بن چکے ہیں۔ اردو اخبارات میں ان الفاظ کو مسلسل من وعن استعمال کر کے زبان کے خزانے میں جو اضافہ کیا گیا وہ اظہر من الشمس ہے۔ حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ اس کا اعتراف کیا جائے۔

اسی طرح یہ دعوی کرنا بھی بے جا نہ ہوگا کہ اردو زبان کو عام فہم لیکن معیاری بنانے، اسے سنوارنے اور سجانے میں اردو صحافیوں کا قابل قدر حصہ ہے۔ ''خطوط غالب'' تو اردو نثر کو سلاست و بذلہ سنجی کا پیرہن عطا کرنے کی ایک انفرادی سعی تھی، جس کے محرکات کا جائزہ لیا جائے تو ممکن ہے کہ اس عہد کے اردو اخبارات کا پرتو اس میں نظر آ جائے، بعد میں مولوی محمد باقر، سرسید احمد خاں، بہاری لال مشتاق اور مولانا محمد حسین آزاد نے صحافت کے وسیلہ سے اپنے اور دوسروں کے نظریات کی اشاعت کر کے اردو زبان و ادب اور تحقیق کے ساتھ ساتھ سیاست کی قندیلیں بھی روشن کیں۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابیہ صحافت ہو یا مولانا حسرت موہانی کی شگفتہ بیانی، مولانا ظفر علی خاں کی پر جوش تحریریں ہوں یا مولانا عبد الماجد دریابادی کے طنز میں بجھے ہوئے شذرات، انہوں نے صحافت کے وسیلہ سے اردو کے نثری خزانہ میں بے پایاں اضافہ کیا ہے۔ اردو کے فکاہیہ وطنزیہ ادب کا جائزہ لیا جائے تو اس کا نوے فیصد حصہ صحافت کا عطیہ ملے گا، اگر اردو کے اخبارات و رسائل نہیں ہوتے تو کالم نگاری، انشائیہ نگاری، انٹرویو نگاری اور افسانہ نگاری کا وجود نہیں ہوتا

کیونکہ ان کی اولین اشاعت کا وسیلہ عام طور پر اخبار و جرائد ہوتے ہیں، مذکورہ اصناف کتابی شکل میں کافی بعد میں شائع ہوتی ہیں۔ اردو صحافت کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ اس نے قصہ کہانیاں اور حکایتیں، سفرنامے، موضوعاتی نظمیں، سیاسی مضامین، قانونی و پارلیمانی مباحث اور طبی و سائنسی موضوعات کو اخبارات کے صفحات پر جگہ دی ہے۔ اگر ریسرچ اسکالر اردو صحافت کی ان خدمات کا جائزہ لیں تو کئی ضخیم جلدیں اس کے لئے ناکافی ہونگی اور تنقید و تحقیق کی بھی یہ اہم خدمت شمار ہوگی۔

اردو صحافیوں نے سیاسی و ادبی تحریکات کو ہی پروان نہیں چڑھایا ادب کی مختلف اصناف کی ترقی میں بھی حصہ لیا، فکاہیہ اور طنزیہ کالموں کا ذکر گذر چکا ہے۔ اس صنف کو صحافت نے جو اعتبار بخشا وہ لائق تحسین ہے۔ منشی سجاد حسین، چودھری محمد علی ردولوی، حاجی لق لق، ملا رموزی یا ان کے معاصرین طنز و مزاح نگاروں سے اردو دنیا خاطر خواہ طور پر واقف نہیں ہوتی اگر اخبارات و رسائل میں ان کو مقام نہیں ملتا۔ آزادی کے بعد شوکت تھانوی، مجید لاہوری، فکر تونسوی، علامہ درپن، ابراہیم جلیس، علامہ مدہوش، تخلص بھوپالی، احمد جمال پاشا، مجتبیٰ حسین یہ سبھی سکے صحافت کی ٹکسال کے ڈھالے ہوئے ہیں لیکن ہمارے بیشتر نقاد اردو صحافت کے اس کارنامے کا اعتراف کرنا کفر سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ابتدا میں صحافت کی اس خدمت کو سراہا گیا۔ مولوی محمد حسین آزاد پہلے ناقد ہیں، جنہوں نے ''آبِ حیات'' میں لکھا کہ:

> ''سید میر انشاء اللہ خاں کے زمانہ تک انشاء پردازی اور ترقی اور وسعت زبان اردو فقط شعراء کی زبان پر تھی، جن کی تصنیفات،

غزلیں اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے اور غرض ان سے فقط اتنی تھی کہ امیر اور اہل و دل سے انعام لے کر گذارہ کریں یا تفریح طبع یا یہ کہ ہم چشموں میں تحسین و آفریں کا فخر حاصل کریں، وہ بھی فقط نظم میں، نثر کے حال پر کسی کو اصلا توجہ نہ تھی کیونکہ کاروائی مطالب ضروری کی سب فارسی میں ہوتی تھی، یعنی اردو نثر اردو صحافت کی ایجاد ہے''۔

زبان وادب کی تشکیل میں اردو صحافت کے کردار کے بارے میں مثالیں اور بھی ہیں۔لیکن ان سے اعراض کرتے ہوئے یہاں رپورٹنگ کا حوالہ دینا کافی ہوگا، اگر اردو کے اخبارات ور پورٹر نہ ہوں تو زبان وادب سے متعلق ساری سرگرمیاں ماند پڑ جائیں، جلسے، مشاعرے اور مباحثے صرف ان لوگوں تک محدود رہیں جو ان میں حصہ لیتے یا سامع کی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں۔ یہ اردو کے صحافی ہیں جو بیک وقت رپورٹر ومترجم کے فرائض انجام دیتے ہیں انگریزی و ہندی سے ترجمہ میں اپنی ذہنی کاوش کا مظاہرہ کرتے ہیں اور مضامین، مراسلے اور کاروائی میں زبان و بیان کی اصلاح کر کے انہیں اخبارات کی زینت بناتے ہیں۔

اردو صحافت نے زبان وادب کے فروغ کے ساتھ سیاسی وسماجی تحریکات کی ہی آبیاری نہیں کی، ادبی ولسانی معرکوں کو سرانجام دے کر اپنی زبان کا ہر نازک مرحلہ میں دفاع بھی کیا، خصوصیت سے اردو پر کسی سمت سے حملہ ہوا تو تمام اخبارات اور اس کے صحافیوں نے دل سوزی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا، اسی طرح اپنی زبان کے حقوق و مفادات کے لئے جد و جہد ہو یا علاقائی طور پر اردو کو دوسری زبان بنانے کے مطالبہ

کے لئے آواز بلند کرنا، تمام اخبارات اس میں شریک وسہیم رہے، اردو اخبارات کی جغرافیائی حیثیت بھی کافی وسیع ہے، وہ شمال میں کلکتہ سے سری نگر تک اور دہلی سے ممبئی، حیدرآباد اور بنگلور تک ہر بڑے شہر میں پھیلے ہوئے ہیں اور زبان پر اپنے تأثرات ڈال رہے ہیں، ملک کی گیارہ اہم ریاستوں سے شائع ہونے والے یہ اخبارات ورسائل آج اردو دنیا کی ایک مؤثر طاقت ہیں، ان روزناموں یا ہفت روزہ اخباروں اور ماہناموں کی بڑی تعداد معیاری ہے، اور خوب سے خوب تر کی تلاش کے لئے ان کی کدوکاوش جاری ہے، یہ اخبار ورسائل ہر قسم کے افکار اور سیاست کی نمائندگی کرتے ہیں، ان میں ہر مذہب اور علاقے کے ترجمان مل جائیں گے، یہاں تک کہ سنگھ پریوار، آریہ سماج، اسلام، جماعت اسلامی، جمعیۃ علماء، اہل حدیث، سناتن دھرم، سکھ ازم، مسیحیت، ترقی پسندی، جدیدیت کے ہمنوا نیز ادب اسلامی کے علمبرداران میں شامل ہیں۔ اس رنگارنگی اور مختلف جہتوں کی نمائندگی کے اثرات وعوامل اردو زبان وادب پر مرتب ہو رہے ہیں۔

پروفیسر عبدالباری
(علی گڑھ)

اردو لسانیات اور "المبین"

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی خدمات کا جائزہ

ہندوستان میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ایک عظیم ملکی وملی سرمایہ ہے، ساتھ ہی ساتھ امت مسلمہ کا ایک قابل قدر ثقافتی ادارہ اور ایک مکمل ''علی گڑھ تحریک'' کا محور و مرکز بھی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ثقافتی اقدار کے نشو ونما میں زبان وادب کا عمل دخل بہت ہی اہم ہوتا ہے۔ برصغیر ہند میں یقیناً مسلمانوں کے دینی اور ثقافتی ترقی میں اردو زبان وادب کا کلیدی رول آتا ہے۔ اسی صورت حال کے پس منظر میں ہمیں سرسید کی تحریک علیگڑھ میں جہاں امت مسلمہ کی مجموعی سربلندیوں اور کامرانیوں کے لئے کاوشوں کا پتہ چلتا ہے، وہیں فروغ زبان اردو کے لئے ان کی ہمہ جہت تدابیر اور کارکردگی کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔ بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کو ایک سائنٹفک زبان بنانے میں سرسید کی مساعی خشت اول کی حیثیت رکھتی ہیں۔ خود سرسید کی تحریروں نے اردو زبان کی مسجع ومقفیٰ عبارت آرائیوں کے مقابلے میں ایک فعال اور زمانے کے

جدید تقاضوں سے عہدہ براہونے والی اردو انشاء کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے، چنانچہ مولانا آزاد سر سید تحریک اور سر سید کے ''تہذیب الاخلاق'' کی ہندوستانی مسلمانوں کے ذہن وفکر پر اثر اندازی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''فی الحقیقت جدید اردو علم وادب کی بنیادیں اسی رسالہ نے استوار کیں۔ جدید ہندوستان کے بہترین مصنف اسی حلقہ کے زیر اثر پیدا ہوئے اور یہیں نئے قسم کی اسلامی تحقیق وتصنیف کی راہیں پہلے پہل کھولی گئیں''۔ ۱

حقیقت تو یہ ہے کہ سر سید نے اردو زبان کی بقا اور ترویج کے لئے اپنی جدوجہد زندگی کے بالکل آخر ایام تک جاری رکھی۔ چنانچہ انہوں نے اپنے انتقال سے صرف چند دنوں قبل ۱۹؍مارچ ۱۸۹۸ء کو اپنا ایک آرٹیکل علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں طبع کرایا جو چند فرقہ پرست ذی اثر ہندوؤں کی اس سازش کو ناکام کرنے کے لئے تھا جس کے ذریعہ اردو رسم خط کو ہٹا کر تمام سرکاری دفتروں اور محکموں میں ہندی زبان اور ناگری حروف کو انگریزی لفٹنٹ جنرل کی مدد سے جاری کرنے کی بیجا کوشش کی جارہی تھی۔ ۲

یوں تو اردو زبان وادب میں انشا پردازی اور صحافت کے فروغ میں سر سید کا ایک خاص مقام ہے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اردو لسانیات کی سنگلاخ زمین میں بھی خوشنما بیل بوٹے اگائے ہیں۔

۱۔ آجکل (دہلی) مولانا آزاد نمبر ص؍۶۲ نومبر ۱۹۸۸ء

۲۔ اصغر عباس؛ سر سید کی صحافت، ص؍۲۶۳ (ضمیمہ نمبر ۵) اردو اکیڈمی، لاہور

سر سید کی ''آثار الصنادید'' میں ''تاریخی لسانیات'' کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ سر سید کی وفات کے بعد بھی دبستان سر سید سے وابستہ رفقاء کار نے اردو زبان و ادب کے فروغ کی شمعیں روشن رکھیں۔ اسی دبستان سے وابستہ عربی کو محور بنا کر لسانیات کے فن میں مولانا سید سلیمان اشرف کی اردو میں لکھی ''المبین'' اپنی ایک انفرادیت اور شان امتیاز رکھتی ہے۔ بلاشبہ یہ کتاب اردو زبان و ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

اردو زبان و ادب میں خصوصیت سے تقابلی ادب و لسانیات کے تناظر میں اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ جب علامہ اقبال علی گڑھ تشریف لائے تو انہوں نے خود مولانا سید سلیمان اشرف سے اس کتاب کی گوناگوں خوبیوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا: ''مولانا آپ نے عربی زبان کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن کی طرف پہلے کبھی میرا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا۔[۱]

افسوس کا مقام ہے کہ خود اردو کے ادباء اور ماہرین فن اس کتاب کی کما حقہ قدر افزائی نہ کر سکے۔ اسے ہم اہل زبان اردو کی تغافل شعاری اور نا قدر شناسی ہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کے مصنف کو جو ایک یگانۂ روزگار شخصیت کے حامل تھے، صرف ایک بڑے عالم اور مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے سربراہ کی حیثیت سے جانا گیا، حالانکہ انکا شمار اردو کے ممتاز ادباء اور ماہر لسانیات کے طور پر ہونا چاہئے تھا۔

حقیقت بیں نگاہوں سے دیکھا جائے تو سرفروشان تحریک علی گڑھ کے

۱۔ پروفیسر محمد زبیر۔ پروفیسر علامہ سید سلیمان اشرف، معارف رضا، ص/۱۸۱ کراچی ۱۹۸۷ء

سلسلۂ زریں کی داستان بڑی طویل اور تہ دار ہے، اسلاف کے کارناموں کی قدر شناسی کا جذبہ قدرے بیدار ہو اور دیدۂ بینا سے کام لیا جائے تو ہمیں چمن سرسید کے علمی افق پر ان فدائیان چمن کے بکھرے ہوئے لعل و گہر کے ڈھیر صاف نظر آئیں گے۔ مولانا سید سلیمان اشرف کی ذات گرامی بھی اسی سلسلۂ زرین کی ایک انمول کڑی ہے۔

آپکی ذات جامع معقولات و منقولات تو تھی ہی، اسی کے ساتھ آپ وقت کے بہترین خطیب اور صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ آپکی تقریبا ۱۰ اہم کتابوں کا پتہ چلتا ہے، جن میں "المبین"، "الانہار" اور "ھشت بھشت خسرو" خالص شعر و ادب سے متعلق وقیع اور مفید تصنیفات ہیں۔

جہاں تک ''المبین'' کا تعلق ہے، اسے ہم لسانیات کے مباحث پر مخصوص نگارشات کے دائرے میں برصغیر ہند میں اپنے طرز کی پہلی وقیع تصنیف کا درجہ دے سکتے ہیں۔ عربی زبان و ادب کے تناظر میں لکھی گئی یہ کتاب انہیں اردو لسانیات کے اولین معماروں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ نقد ادب کا ملکہ بھی مولانا سید سلیمان اشرف میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ چنانچہ اس کتاب میں انہوں نے خالص لسانیاتی مباحث کے علاوہ مستشرقین اور یورپی ناقدین فن کے ادب کے متعلق بعض مفروضوں اور غلط آراء کا نہ صرف دندان شکن جواب دیا ہے بلکہ اہل زبان اردو کو مغربی افکار و نظریات سے مرعوب ہونے اور احساس کمتری سے دوچار ہونے سے بھی حتی الامکان بچانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے ادب کی مناسبتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ان جدید رجحانات و روش کی نشان دہی بھی کی ہے جنہیں اپنا کر اردو زبان کو استحکام اور فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔

مولانا نے لسانیات کے دائرے میں جن مفید نکات کی نشان دہی کی ہے وہ لسانیات کے جدید عالمی رویوں سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے، ساتھ ہی ساتھ ایک اہم بات یہ بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ آج بھی اسلامی ثقافت کی نمائندہ عربی زبان و ادب سے ناطہ جوڑے رکھنا اردو زبان و ادب کے فروغ میں ایک اہم ترین اور ناگریز عنصر ہے۔ اسلامی فکر اور اسلامی روح سے ہم آہنگی کیساتھ زندگی کے کسی بھی شعبے سے متعلق باتیں اگر اردو زبان و ادب کے سانچے میں پیش کرنی ہوں تو لامحالہ ہم عربی کے مانوس الفاظ اور تراکیب کے استعمال پر مجبور ہوتے ہیں۔

اردو لسانیات کا جدید تقاضوں کیساتھ باضابطہ فروغ بیسویں صدی سے ہوتا ہے۔ اس سے قبل زیادہ تر اردو قواعد سے متعلق کتابیں لکھی گئیں جنکی بنیاد "علم السنة" پر ہوئی تھی۔ اصلاً اسکا تعلق لسانیات سے نہیں ہوتا تھا، اردو لسانیات کے مسائل پر لکھنے کا سلسلہ شروع بھی ہوا تو ان کا موضوع زیادہ تر فروغ زبان سے متعلق ہوتا اور جس کا دائرہ کار تاریخی یا تقابلی لسانیات تک محدود ہوتا تھا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ عالمی سطح پر جدید لسانیات کی بنیاد رکھنے والا فرانسیسی ماہر لسانیات فرڈیننڈ ہے جس نے اپنی کتاب CourseInGenral linguistics میں پہلی بار ہیئتی یا توضیحی لسانیات (Description linguistics) کو جدید لسانیات کا روپ دیا۔ یہ کتاب ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ تاریخی لسانیات کے مطالعے کی ابتدا اٹھارہویں صدی کے اواخر سے ہوتی ہے، اس کے بعد بیسویں صدی کے اوائل سے توضیحی لسانیات فروغ پاتی ہے، توضیحی لسانیات کی بہت سی شاخیں ہیں۔ مثلاً صوتیات (Phonetics) معنیات (Senantics) نحویات (Syntax)

تشکیلیات (Morphology) وغیرہ۔اس کے علاوہ بھی لسانیات کی اور چند شاخیں ہیں جو زبان کو باہر کی دنیا سے جوڑتی ہیں مثلاً نفسیاتی لسانیات (Psycho-linguistics) اور اطلاقی لسانیات (Applied linguistics) وغیرہ۔

۱۹۵۳ء کے بعد اردو میں ایسی کتابیں شائع ہوئیں جن میں عمومی لسانیات (General linguistics) کے مطالعے کو موضوع بنایا گیا۔عمومی لسانیات میں، لسانیات کے تمام شعبوں کی مبادیات سے بحث کی جاتی ہے عمومی لسانیات پر اردو میں شائع ہونے والی سب سے پہلی کتاب عبدالقادر سروری کی ''زبان اور علم زبان'' کہی جاتی ہے جو ۱۹۵۶ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔اس کے بعد عمومی لسانیات پر اردو میں لکھنے والوں میں ہم گیان چند جین، ڈاکٹر شوکت سبزاروی، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر اقتدار حسین خان، خلیل صدیقی، پروفیسر مسعود حسین خاں اور مرزا خلیل بیگ کے نام لے سکتے ہیں[۱]۔ لیکن قابل توجہ بات یہ کہ مولانا سید سلیمان اشرف کی ''المبین'' مذکورہ بالا اردو لسانیات پر تصانیف سے بہت پہلے یعنی ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔یہ بات مزید حیران کن ہے کہ مولانا نے تاریخی لسانیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لسانیات کے جدید ترین نکات یعنی ہیئتی یا توضیحی لسانیات کو بھی خاص طور پر موضوع بحث بنایا ہے۔ انہوں نے خصوصیت سے لفظ کے صوتیاتی آہنگ اور معنی سے ربط پر اپنی آراء پیش کی ہیں جو جدید لسانیات کا خاص موضوع قرار دیا گیا ہے۔موضوع کے جدید تقاضوں کی روشنی میں فن کی وسعتوں کا بھی مولانا کو اندازہ تھا۔چنانچہ وہ کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں:

''غرض لغت کا علم بجائے خود ایسا وسیع ہو گیا ہے کہ اس کی صحیح نمائندگی کے لئے

۱۔لسانی تناظر: پروفیسر مرزا خلیل بیگ،ص ۶۸۔۶۵، باہری پبلیکیشنز، نئی دہلی ۱۹۹۷ء

اس کتاب جیسے مختصر اجزاء ہرگز کافی نہیں لیکن ؎

ابھی تو دیکھتا ہوں ظرف بادہ خواروں کا
سبو و خم کی ٹھیرے گی دور جام کے بعد [۱]

میرے سامنے ''المبین'' کا وہ نسخہ ہے جو علیگڑھ سے ۱۹۲۹ء میں طبع ہوا۔ کتاب میں سات ابواب اور ۱۷۰ صفحات ہیں، ابواب کی ترتیب درج ذیل ہے:

عربی زبان کے مخصوص فضائل

مخارج وصفات اعراب حروف

ترکیب حروف

ایک سوفسطائی کا اندفاع

فلسفہ ارتقاء لسان

فلسفۂ اشتقاق

عربی زبان کا حیرت انگیز کمال گویائی

لیکن ان سبھی ابواب میں فلسفہ ارتقاء زبان، ترکیب حروف اور مخارج و صفات و اعراب حروف کی بحث ایک خاصے کی چیز ہے۔

صفات حروف کی بحث میں لکھتے ہیں: عربوں نے اس ہیئت کو جو بوقت ادا حرفوں کو عارض ہوتی ہے جب باعتبار صفات لحاظ کیا تو انہیں کیف میں بھی ممتاز پایا۔ کسی حرف میں سبکی و نرمی تھی اور کسی میں صلابت و سختی۔ اس لحاظ سے بھی عربوں نے حروف تہجی کو چند اقسام پر تقسیم کیا ہے۔ [۲]

۱۔ المبین ص/۱۶۹، علیگڑھ

۲۔ المبین ص/۱۳

اس سلسلے میں مولانا نے باعتبار کیف حروف کی مشہور ۱۶ قسمیں گنائی ہیں جن میں مجہورہ، مہموسہ، شدیدہ اور رخوہ وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

مولانا ہیئت صوتی اور معنی ومفہوم کا باہمی تناسب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

'لفظ' ہیئت صوتی اور معنی ومفہوم کے ساتھ کیا مناسبت رکھتی ہے اس کی طرف خلیل وسیبویہ نے یوں اشارہ کیا ہے کہ ٹڈی، جسے عربی میں جُنْدُب کہتے ہیں اس کی آواز میں درازی پائی جاتی ہے اور باز کی آواز میں انفصال اور انقطاع محسوس ہوتا ہے، اس لئے ٹڈی کی آواز کے لئے لفظ صرَّ اور باز کی آواز کے لئے صرصر اہل عرب نے وضع کیا۔ سیبویہ اور خلیل نے بس یہی دو لفظ کہہ کر اس نادر نکتہ کی طرف رہنمائی کی کہ حرف ''صاد'' کی صفت یہ ہے کہ وہ صفیرہ ہے۔ چھوٹے پرند کی آواز کے لئے لفظ کا حرف صفیرہ سے شروع ہونا عجیب معنی خیز ابتدا ہے۔ دوسرا حرف ''را'' ہے جو ایک جگہ مشدد آکر دراز ہوگیا اور دوسرے کلمہ میں ساکن ہوکر درازی کو اسی طرح منقطع کردیا جیسا کہ باز کی آواز میں تقطیع پائی جاتی ہے۔ پھر یہ کہ ''را'' حرف تکرار ہے۔ آواز کے لئے اس کی مناسبت بھی ظاہر ہے [۱]

لفظ کی صوتی اور معنوی کیفیات پر بحث کرتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:

بیمار مرض کی تکلیف سے کراہتا ہے۔ مریض کی اس کراہ میں بھی باعتبار مرض کی شدت اور ضعف کے ایک فرق پایا جاتا ہے۔ کراہ کی ایک پتلی اور سست آواز نکلتی ہے اسے عربی میں أنین کہتے ہیں۔ اگر اس سے بھی پست ہو تو "ھنین" ہے۔ مریض نے کراہنے کی کوشش کی لیکن ضعف نے پوری قوت سے کراہنے کی اجازت نہ دی تو اس

۱۔ المبین ص/۳۱

کراہ کو ھنین کہتے ہیں۔ضعف سے کراہ کی آواز بگڑ جاتی ہے تو یہ ''زفیر'' ہے۔سانس کا نظم تہہ و بالا ہو گیا تو اس وقت کی آواز "شھیـــــق" ہے۔یہاں بھی ہر لفظ با معنی و موضوع ہے اور اپنی حقیقت و ماہیت کو پیش کر رہا ہے۔اس کے ساتھ مریض کی آواز ہے۔اس لئے ہر لفظ کا تلفظ بھی رنج و حسرت، ضعف و ناتوانی کا فوٹو ہے۔صنعت لفظی و معنوی، جملہ و کلام یا اشعار کے بیت میں ہوا کرتی ہے، لیکن عرب کی زبان کا ہر لفظ مفرد ان محاسن سے آراستہ ہوتا ہے۔[۱]

واقعہ یہ ہے کہ عربی الفاظ کے صوتی آہنگی سے معنوی کیفیات کو اجاگر کرنے کی صفات کو اگر ہم اردو زبان و ادب کا بھی حصہ بنالیں تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچے۔ ہمیں کلام اقبال میں عربی زبان کے ہیئتی تجربوں کی بہت ساری مثالیں ملتی ہیں۔ بلاشبہ ''المبین'' کے مطالعہ سے اردو زبان و ادب کے فروغ کی راہیں استوار ہو سکتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

☆☆☆

۱۔مولانا سید سلیمان اشرف: المبین ص ر ۵۷۔۱۵۶

ڈاکٹر سعید الرحمٰن الأعظمی ندوی

اردو زبان کے سوانحی ادب کی تشکیل میں "پرانے چراغ" کا حصہ

"پرانے چراغ" مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ کی اردو تصنیف ہے۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ معاصر شخصیات کے سوانحی خاکوں کا یہ بے مثال مرقع ان شخصیات میں عصر حاضر کے نامور علماء، ادباء، شعراء اور دانشوروں کے ساتھ باکمال ہستیوں اور مصلحین ومجددین کا تذکرہ بھی بڑے ہی مؤثر اور دل آویز پیرایۂ بیان میں پیش کیا گیا ہے۔ ہر شخصیت کی تصویر کشی کچھ ایسے انداز سے کی گئی ہے کہ ہر تصویر کا رنگ اور خط وخال جداگانہ ہے اور ہر ایک اپنی ایک مستقل حیثیت کی مالک ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ جو انداز بیان ایک کے لئے اختیار کیا گیا ہو، بالکل وہی یا اس کے مشابہ اسلوب دوسرے کے لئے بھی اپنایا گیا ہو۔ یہ سوانحی ادب کا سب سے بڑا کمال ہے کہ سوانح حیات پیش کرنے کے لئے ادب کی چاشنی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو اور ہر شخصیت کے امتیازی اوصاف کو بیان کرنے کے لئے زبان وادب کے تنوع اور اسلوب بیان کے نرم وگرم پہلوؤں کی خاص رعایت

کی گئی ہو۔

سیر وسوانح اور تراجم رجال کی کتابوں میں عام طور سے جو طرز تحریر رائج ہے وہ ایک خشک تاریخی مضمون کی حیثیت سے معروف اور مقبول ہے۔اس طرز تحریر میں بڑی یکسانی ہوتی ہے۔اس لئے کہ کسی بھی شخصیت کے حالات بیان کرنے کے لئے چند مشترک اصطلاحات ہیں اور ان کو ہم بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً تاریخ پیدائش، ابتدائی تعلیم و تربیت، خاندان اور ماحول، خاندانی روایات، اعلیٰ تعلیم، مشغلہ، زندگی کے حالات، عقائد وافکار، مسائل و معاملات، اسفار و مشاہدات، اولاد و احفاد، اہل تعلق، میدان عمل، کارہائے نمایاں، تاریخ وفات اور وفات کے بعد کے اثرات وغیرہ۔

ان مشترک احوال کے بنا پر مختلف شخصیات کے لئے تقریباً ایک ہی زبان اور یکساں اسلوب بیان اختیار کیا جاتا ہے اور سوائے تاریخوں اور زندگی کے معاملات اور اعداد و شمار میں کچھ فرق ظاہر کرنے کے، سب کے لئے ایک ہی طرز اور زبان استعمال کرنا کچھ معیوب نہیں سمجھا جاتا، گویا ایک ہی ٹوپی تھوڑے فرق کے ساتھ سب کے سروں پر فٹ کردی جاتی ہے۔

ساتویں صدی ہجری میں عربی زبان کے مشہور سوانح نگار علامہ شمس الدین احمد ابن خلکان اس موضوع کے امام تسلیم کئے جانے کے قابل ہیں۔انہوں نے اپنی کتاب "وفیات الأعیان و ابناء ابناء الزمان" میں جن شخصیات کا تذکرہ کیا ہے ان کی امتیازی حیثیت اور انکے مراتب کمال کو اپنے سنجیدہ قلم سے اس انداز سے ذکر کیا

ہے کہ ہر شخصیت کی امتیازی خصوصیت کو حقیقت پسندی کے دائرہ میں رکھتے ہوئے اس کو اس کا صحیح مقام عطا کیا ہے اور نہایت باریک بینی کے ساتھ اس کے مقام کو واضح کیا ہے۔ یہ سیرت نگاری کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو بہت کم سیر و سوانح کے موضوع میں اس فنی مہارت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اس کتاب میں نہ صرف مؤلف کا حسن ذوق اور ممتاز طرز بیان نمایاں ہے بلکہ اس سے ان کی وسیع واقفیت اور باریک بیں نظر کا پتہ بھی چلتا ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سیر و سوانح کی تدوین کے موضوع پر اپنی بیش قیمت رائے کا اظہار فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بہت سے ادباء و انشاء پرداز کسی شخصیت کی ترجمانی اور اس کی زندگی اور کاموں کے تعارف کرانے کے طرز نگارش کو نہایت آسان تصور کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ معروف شخصیتوں کے تذکرہ میں بڑی سخاوت کے ساتھ انکے القاب و آداب کے ساتھ انکی خصوصیات اور امتیازات کا ڈھیر لگا دیتے ہیں اور تمام شخصیتوں کے لئے قدر مشترک کے طور پر ایسے تعریفی کلمات اور عقیدت کے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ہر عالم و ادیب اور ہر صاحب نظر و دانشور، ہر بزرگ اور عالی مرتبت، ہر حاکم و قائد کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام شخصیتیں بہت تھوڑے فرق کے ساتھ ایک ہی قالب سے ڈھل کر نکلی ہیں اور ان شخصیتوں کے الگ الگ

اوصاف اور خصوصیات نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کسی شخص کا تعارف یا کسی انسان کے حالات زندگی کا بیان کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے بلکہ اس موضوع کو اختیار کرنے والے اور سیر و سوانح کی کتابوں کی تصنیف میں مشغول ہونے والے شخص کے لئے چند اہم نکات (Points) کو پیش نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے۔

۱۔ جس شخصیت کا تعارف کرایا جا رہا ہے یا تو اس سے ذاتی یا قریبی تعلقات ہوں اور اس کے ساتھ وقت گذارنے کا موقع ملا ہو، اگر ایسا نہ ہو تو کم از کم اس شخصیت کے جملہ حالات، غیر جانبدار مطالعہ اور مختلف ذرائع سے تلاش و جستجو کے ذریعہ سے معلوم ہوئے ہوں۔

۲۔ طرز ادا و نگارش پر پوری قدرت حاصل ہو اور ان میں استعمال ہونے والے الفاظ کا قابل لحاظ ذخیرہ صاحب نگارش کے پاس موجود ہو۔

۳۔ نہایت باریکی، امانت داری اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اس شخصیت کو وہی لباس پہنایا جائے جو اس کے قد و قامت کے عین مطابق ہو۔

۴۔ کسی شخص کی زندگی کے حالات لکھتے وقت نہایت بے لوث جذبہ اور مخلصانہ نیت کارفرما ہو اور فکر و ضمیر کے ساتھ وہ پوری طرح ہم

آہنگ ہو۔ اس لئے کہ کوئی تعارفی تحریر اگر ان عناصر سے خالی ہو تو اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی تصویر یا نقش و نگار محض تجارتی جذبہ سے تیار کیا جائے اور اس کا تیار کرنے والا کرایہ پر حاصل کیا ہوا انسان معلوم ہوتا ہو۔

۵۔ اہل ادب و دانش کو اچھی طرح معلوم ہے کہ الفاظ کا ایک درجۂ حرارت و برودت ہوتا ہے جسے الفاظ کا (Temperature) کہنا زیادہ صحیح ہوگا، چنانچہ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے الفاظ کے استعمال میں اور تعارفی کلمات میں اس کا لحاظ رکھنا بہت زیادہ اہم اور ضروری ہے، اسی لئے (High Temperature) والے الفاظ کو (Normal Temperature) والے الفاظ کی جگہ پر استعمال کرنا کسی طرح صحیح نہیں، چہ جائے کہ (High Temperature) والے الفاظ کو (Temperatureless) الفاظ کی جگہ استعمال کیا جائے، اسی طرح نہایت ہی بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال کرنا کسی عام شخصیت کے لئے مناسب نہیں، جس کے تعارف کے لئے معتدل الفاظ استعمال کئے جاسکتے ہوں۔ اس سلسلے میں اشکال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب تعارفی شخصیت جامعیت اور کمال کا درجہ رکھتی ہو، اور اس کے سب سے اہم پہلو اور مرتبہ کو پیش کرنے میں دشواری پیش آرہی ہو لیکن یہ مسئلہ اس سوانح نگار کے لئے ذرا بھی دشوار نہیں ہوتا جو

زیرِ تعارف شخصیت کے تمام پہلوؤں سے، اسکی تصنیفات سے اور اس کے بارے میں معاصرین کی رائے سے پورے طور پر واقف ہو'' ۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے ''پرانے چراغ'' کو مرتب کرتے وقت ان تمام مذکورہ گوشوں اور نزاکتوں کو پیش نظر رکھا ہے اور مختلف سطح اور مرتبہ کی شخصیتوں کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے کہ ان کی شخصیت کا پورا سراپا نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور اس کی ایک خوبصورت تصویر آنکھوں کے سامنے متمثل ہو جاتی ہے وہ ہر شخصیت کے بارے میں اسکے حقیقی نقوش اور اپنے ذاتی تأثرات کا ذکر ایسے مؤثر اور خوبصورت انداز میں کرتے ہیں جس کا صحیح اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جو سوانح نگاری کی روح اور شخصیت کی تصویر پیش کرنے کا ذوق رکھتے ہوں ۔ ''پرانے چراغ'' اگرچہ معاصر شخصیتوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے لیکن اس میں مشاہیر علماء ومصنفین، اساتذہ اور شیوخ وقت، احباب اور رفقائے کار اور شہرۂ آفاق شخصیات کے ساتھ ایسے باکمال اور اہل قلوب جو بڑی حد تک پردہ خفا میں مستور تھے کا تذکرہ واقعاتی انداز میں اس طرح کیا گیا ہے کہ اس میں ادب وانشاء کی لذت وچاشنی ہر جہت سے نمایاں ہے۔

اس صورت حال کا ذکر مصنف علیہ الرحمۃ نے اس طرح کیا ہے:

''یہ درحقیقت نقوش وتأثرات کا مجموعہ ہے جو اپنی یاد، ذاتی تجربات و واقعات اور خطوط اور ذاتی تحریروں کی مدد سے تیار کیا گیا ہے، اس کی خوبی کہیے یا عیب کہ اس میں اپنی زندگی کے واقعات اور تجربات اور اپنے دل کے احساسات وتأثرات اور ان شخصیتوں کی

زندگی کے واقعات اوران کے قلبی تأثرات واحساسات ایسے گھل مل گئے ہیں کہ ایک کودوسرے سے جدا کرنا اور ایک کی مدد کے بغیر دوسرے سے آشنا ہونا مشکل ہوگیا ہے۔لیکن اس سے ان شخصیتوں کے بہت سے ایسے خط وخال نمایاں ہوگئے ہیں جو روایتی سوانح عمریوں اور رسمی تاریخوں میں عام طور پر نمایاں نہیں ہوتے۔اس لئے سوانح نگاروں اور تاریخ نویسوں کو بھی ان میں زندگی کی بہت سی گم شدہ کڑیاں، چہرہ کا اتار چڑھاؤ، زندگی کے نشیب وفراز، دل کی دھڑکنیں اور اقبال کے الفاظ میں ''دلوں کی تپش اور شبوں کا گداز'' ملے گا جو بڑے ضخیم تذکروں اور پر جلال تاریخوں میں نہیں ملتا اور یہی ان مضامین کی اصل قدر وقیمت ہے''۔(پرانے چراغ ج:اص۹،۱۰)

اگر یہ کتاب اپنے تذکروں میں اس امتیازی صفت کی حامل نہ ہوتی اور اس کے عظیم مصنف کا واقعاتی تجزیہ پورے ادبی جلال وکمال کے ساتھ اس میں نمایاں نہ ہوتا تو اردو زبان کے سوانحی ادب کی تشکیل میں اس کا یہ نمایاں حصہ نہ ہوتا اور ہمیں اس کتاب کو سوانح اور تذکرہ نگاری کے موضوع پر ایک بڑا اضافہ قرار دینے کی جرأت نہ ہوتی،لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس کتاب کے ذریعہ سوانح نگاری کے نئے راستے کھلتے ہیں اور تاریخ کو ادب کے پیرایۂ بیان میں پیش کرنے کی ایک نئی دریافت ہوتی ہے،اور شخصیتوں کی خوبیوں کو سمجھنے اوران کی سچی ترجمانی کرنے کا ایک نیا اسلوب سامنے آتا ہے اور کتاب سے استفادہ کرنے والے قارئین کے لئے ان

کے ذوق کی تسکین اور ان کی دلچسپی کا سامان فراہم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی معلومات میں ایک وقیع اضافہ ہوتا ہے۔ سادگی اور پرکاری کا جامع طرز تعبیر اور اسلوب بیان قاری کے دل ودماغ کو زندگی اور تازگی بخشتا ہے اور اس کے اندر زندگی کی ایک روح بیدار ہوتی ہے۔ ان خیالات کی تائید مصنف علیہ الرحمۃ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''یوں تو اس مجموعہ میں مختلف ذوق ورجحان رکھنے والے قارئین کو اپنے ذوق کی تسکین اور دلچسپی کا سامان ملے گا کہ اس میں عالم ومصنف بھی ہیں، شاعر وادیب بھی، فقیر ودرویش بھی، سیاست وخدمت ملی کے میدان کے شہسوار بھی، بزرگ بھی، دوست بھی، نامور بھی، گمنام بھی، لیکن اشخاص کے انتخاب میں بھی اور ان کے حالات وکمالات، پسند وناپسند کے تذکرے میں مصنف کا ذوق ورجحان، اس کی اپنی زندگی اور ماحول اور اس کی پسند وناپسند ضرور کارفرما نظر آئے گی اور یہ زندگی کی ایک علامت بھی ہے، صاف گوئی اور راست بیانی، سادگی اور بے تکلفی کی نشانی بھی کہ زندہ انسان جب کسی انسان کے متعلق کبھی کچھ لکھتا ہے یا کہتا ہے تو اپنی ذات سے الگ نہیں ہوتا، اگر وہ ایسا کرے گا تو تصنیف کسی قلم اور قلب کی سچی ترجمانی اور کارفرمائی نہیں، ایک بے جان کیمرہ کا مصنوعی عمل ہے۔ مصنف کی زندگی کا ایک بڑا حصہ مدرسہ کی فضا اور دینی ماحول میں گزرا ہے، اس نے اپنی

شعوری و علمی زندگی کا سفر تدریس و تصنیف سے شروع کیا اس لئے قدرتاً اس کے تأثرات و بیانات میں ان کا حصہ غالب و نمایاں رہے گا اور اس حصہ سے قدرتاً انہیں لوگوں کو زیادہ دلچسپی ہوگی جو اس کا ذوق اور تجربہ رکھتے ہیں، اگر یہ کوئی عیب اور نقص ہے تو مصنف اس سے بری ہونیکا دعویٰ نہیں کرتا اور اگر یہ کوئی خوبی ہے تو وہ خواہ مخواہ اس سے انکار اور تواضع سے کام لینے کی ضرورت نہیں سمجھتا''۔(پرانے چراغ ج:۱ص/۱۲،۱۳)

اس کتاب کی جلد سوم کے مقدمہ میں کتاب کے ناشر کی طرف سے مصنف کی تاریخ نگاری و سیرت نویسی کے نقطۂ نظر کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

''مصنف کا نقطۂ نظر، تاریخ نگاری اور سیرت نویسی کے متعلق یہ ہے کہ کسی نسل و قوم کی تاریخ اور کسی دعوت و تحریک اور دین و مذہب کی تعلیمات کو کسی رنگ آمیزی، داستان طرازی اور تزئین و آرائش کے بغیر سامنے رکھدینا چاہئے کہ جمال فطرت اور حسن حقیقت کو ظاہری رنگ و روغن اور مہکتے ہوئے تازہ پھولوں کو مصنوعی رنگ و بو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسری صفت جو''پرانے چراغ'' کے مصنف علیہ الرحمۃ کو دوسرے مؤرخین اور سیرت نگاروں اور تذکرہ نویسوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ فن تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے عام مزاج و انداز اور لگی بندھی ڈگر سے ہٹ کر انہوں نے اپنی کتابوں

میں ان تاریخی دستاویزوں اور مصادر و مراجع سے بھی فائدہ اٹھایا ہے جو بظاہر اس موضوع پر نہیں تھیں مگر ان میں وہ قیمتی لعل و جواہر موجود تھے جو براہ راست خاص اس موضوع پر لکھنے والوں کو ملنے دشوار تھے، اگر چہ اس نازک علمی و تاریخی سفر میں بڑے نازک موڑ اور سخت و ہمت شکن گھاٹیاں بھی آئیں جن سے گذرنا آسان نہ تھا کہ یہ موضوع (تاریخ نویسی اور سیرت نگاری) ''بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے'' لیکن محض توفیق الٰہی کی خاص دستگیری، وسیع قلب، متوازن فکر، وسیع و طویل اور عمیق مطالعہ کی قوت و ہمت اور مشق شناوری کی بدولت وہ اس سے عہدہ برآ ہو سکے''۔ (پرانے چراغ ج:۲ ص/۶، ۷)

اب آیئے ذرا جائزہ لیتے ہیں ''پرانے چراغ'' کے سوانحی ادب کا اور اس میں مذکورہ شخصیات کے ساتھ انکے درجہ اور مقام کے لحاظ سے پیرایۂ بیان کے مختصر اشارے کا، تاکہ سوانحی ادب کی تشکیل میں اس کتاب اور اس کے مصنف کی منفرد ادبی خصوصیات سامنے آسکیں اور اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی تردد یا پس و پیش نہ باقی رہ جائے کہ اردو زبان کے سوانحی ادب کی تشکیل میں ''پرانے چراغ'' کا حصہ کتنا اہم اور تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔

سب سے پہلی جلد کے ابواب پر ایک سرسری نظر ڈالئے تو چند بلند پایہ، عالم و رہنما کا تذکرہ اپنے پورے ادبی جاہ و جلال اور عقیدت کی روح کے امتزاج کے ساتھ

آپ کے لئے نہ صرف سامان عبرت پیش کرنے کے لئے کافی ہے بلکہ آپ کے ادبی ذوق اور اس کی تسکین کے لئے ایک نئے اسلوب نگارش اور زور بیان سے مالا مال ادب و بلاغت کا خزانہ آپ کے ہاتھ میں آئے گا۔

مثال کے طور پر علامہ سید سلیمان ندویؒ کا تذکرہ یوں شروع ہوتا ہے:

''مولانا سید سلیمان ندویؒ سے ہمارے خاندان کے ایسے گونا گوں تعلقات اور ایسے عزیزانہ روابط تھے کہ وہ کسی دور میں بھی ہم لوگوں کے لئے اجنبی اور نامانوس نہیں تھے، وہ دارلعلوم ندوۃ العلماء کے نہ صرف تعلیم یافتہ اور فاضل بلکہ اس کے لئے سرمایۂ افتخار و نازش تھے، وہ میرے والد کے عزیزی شاگرد اور بھائی صاحب کے ایسے دوست تھے جو عمر میں بڑے اور فضیلت و شہرت میں بڑھے ہوئے تھے، ہماری درسگاہ کے ایک طرح کے مربی و سرپرست بھی تھے، میرے استاد مولانا خلیل عرب کے ساتھ بھی انکا تعلق کچھ ایسا ہی تھا کہ عرب صاحب کی طرف سے احترام کا معاملہ بھی تھا اور بے تکلفی و مزاح و ظرافت کا معمول بھی، عرب صاحب نے اس دور میں ندوہ میں تعلیم پائی تھی جب سید صاحب وہاں کے اساتذہ میں شامل تھے۔ اگر عرب صاحب کو ان سے پڑھنے کی نوبت آئی بھی ہوگی تو برائے نام، اس کے بعد جب دیکھا دونوں کا ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ خوش طبعی اور بے تکلفی کا دیکھا۔ سید صاحب اپنے بے تکلف احباب

میں بڑے ظریف، نکتہ سنج، سبک روح اور خوش مذاق تھے۔ لیکن ان کے مذاق میں بھی ایک علمی و ادبی شان ہوتی تھی۔ عرب صاحب بھی باوجود اس کے کہ ان کا زیادہ تر سابقہ عربی سے تھا اردو کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور لکھنؤ میں طویل مدت گذارنے کی وجہ سے زبان کی باریکیوں اور مزاح وظرافت کی نزاکتوں سے واقف تھے کہ ذرا سی بے احتیاطی سے مزاح اس طرح ابتذال اور خوش طبعی کس طرح اشتعال کے حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔'' (پرانے چراغ ج:اص ر۱۷)

انہی بلند علماء ورہنما میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کا تذکرہ پورے ادبی آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔ اس کے بعد چند مشائخ کبار و مصلحین کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے پر کشش تذکرہ سے اس ضمن میں مولانا احمد علی لاہوری، مولانا شاہ وصی اللہ فتحپوری کے عطر بیز حالات کا تذکرہ نہ صرف یہ کہ قلب وروح کے لئے غذا اور دوا کا سامان فراہم کرتا ہے بلکہ ہر ایک کے روحانی اور تربیتی کمالات کا ایک ادبی جائزہ اپنی الگ الگ خصوصیات کے ساتھ موجود ہے۔

اسی طرح چند اساتذۂ کرام کا تذکرہ شروع ہوتا ہے۔ شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی اور مولانا خلیل عرب، مولانا سید طلحہ حسنی کے تذکرے باصرہ نواز ہوتے ہیں۔ پھر ''چند ہستیاں بلند مقام لیکن گمنام'' کے عنوان سے چار شخصیتوں کے نام مذکور ہیں، مولانا شاہ حلیم عطا سلونی، مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی امروہوی،

سید صدیق حسن ICS)، الحاج سید محمد خلیل صاحب نہٹوری، پھر ''کچھ دوست اور کچھ بزرگ'' کے عنوان سے پانچ شخصیتوں کا نام نامی جملہ تفصیلات کے ساتھ نہایت دل آویز پیرایۂ بیان میں ذکر کیا گیا ہے، ان میں مولانا مسعود عالم ندویؔ، جگر مرادآبادی، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر محمد عبدالجلیل فریدی، مولانا معین الدین ندویؔ شریک بزم ہیں۔

اب آتے ہیں ''پرانے چراغ'' کی دوسری جلد ''مع تکملہ سینے کے داغ'' کی طرف۔اور پھر اس پر نظر ڈالتے ہیں تو سب سے پہلے ہندوستان کے چند اہل کمال اور مشاہیر رجال کی فہرست نظر آتی ہے۔نمبر ایک پر مولانا محمد علی جوہر، پھر نواب صدر یار جنگ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ ان جیسا مخلص، جری، نڈر، بہادر اور خدا پرست، عاشق اسلام قائد اس ملت کو اس صدی میں نہیں ملا، لیکن بد قسمتی کی بات یہ تھی کہ انہوں نے ایک ایسے مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا تھا اور اس کو اپنی سحر انگیز شخصیت کی توانائیوں اور قائدانہ صلاحیتوں کا محور بنایا تھا، جس کی زمام کاران کے ہاتھ میں نہیں بلکہ ملک کے باہر سات سمندر پار ایک ایسی جماعت و فرد کے ہاتھ میں تھی جو ان کے مشوروں کا تابع اور انکی ہدایتوں کا پابند نہ تھا، بلکہ اپنے مصالح اور مغربی طاقتوں کے چشم وابرو کا غلام تھا یعنی مسئلہ خلافت، جسے کمال اتاترک نے اتحادیوں کے اشارہ اور خاص طور پر برطانیہ کے مشورہ اور ہدایت

پر بیک جنبش لب یا گردش قلم ختم کردیا اور سارا عالم اسلام خاص طور پر ہندوستان کا مجروح وستم رسیدہ مسلمان دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔''

پھر جب ہندوستان کے مسائل میں ان کی رہنمائی اور قیادت کا وقت آیا تو وہ اپنی بہترین توانائیاں صرف کر چکے تھے، ان کا دل زخموں سے چور چور تھا اور ان کا جسم بیماریوں سے زار ونزار، ملت کی خوردہ گیری، حساب طلبی تنقید وملامت، اندرونی انتشار، بیرونی مخالفت اور ساتھیوں کے بے وفائی سے ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا، وہ اپنی جوانی، طاقت، ہمت کے زمانہ میں جن لوگوں کے ساتھ اور جنہوں نے اس ملک کو آزاد کرانے کے لئے ان کے ساتھ قربانیاں دی تھیں ان کو بعض تلخ تجربوں اور واقعات کی بنا پر چھوڑ چکے تھے اور جب جن لوگوں کی انہوں نے رفاقت اختیار کی تھی یا جو ان کے گرد جمع ہو چکے تھے وہ ان کے خلوص، جذبہ قربانی، قابلیت اور بلند عزائم میں انکی کوئی نسبت نہیں رکھتے تھے، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ''یوسف بے کارواں'' بن کر رہ گئے۔

آخر میں پھر انکی مضطرب روح اور بے چین طبیعت نے اپنا جوہر دکھایا اور اس نے اپنے مرکز اصلی کی طرف پرواز کی۔ ۳۱-۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں وہ شیر کی طرح گرجے اور بلبل کی طرح چہکے انہوں نے اس وقت ہندوستان جانے سے انکار کردیا جب تک ان کو اس ملک کی آزادی کا مکمل پروانہ نہ مل جائے، وہیں ۴ رجنوری ۱۹۳۱ء کو ان کی طائر روح نے قفس عنصری سے پرواز کی۔ مفتیٔ اعظم فلسطین الحاج سید امین الحسینی کی دعوت وتحریک پر انکی نعش فلسطین لے جائی گئی اور انکے جسد خاکی کو سرزمین انبیاء اور معراج نبوی کی پہلی منزل بیت المقدس کے ایک گوشہ میں جگہ ملی،

اقبال نے خوب کہا ہے ؎

خاک قدس اورا بآغوش تمنا می گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہ کہ پیغمبر گذشت

اور انکا یہ کہنا بھی صحیح نکلا ؎

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

(پرانے چراغ ج:۲ص/۱۷،۱۸)

مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان کے علمی وادبی مرتبہ اور انکی سیاسی بصیرت وذہانت پر تحریر فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:

''انکا حیرت انگیز حافظہ، ان کی غیر معمولی ذہانت، انکی حاضر دماغی اور بے دار مغزی، انکی ادبیت اور انکی انشاء پردازی جو کسی وقت اور کسی جگہ انکا ساتھ نہیں چھوڑتی، ان کی اپنے مطالعہ اور معلومات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی عجیب وغریب صلاحیت، انکی سیاسی بصیرت اور دور بینی، ان کی اپنے خیالات میں پختگی اور اپنے مسلک پر ثابت قدمی واستقامت اور لوگوں کی مدح وتنقید سے بے پرواہی، انکی خودداری اور عزت نفس ہر شبہ سے بالاتر اور ہر اختلاف سے بے نیاز ہے''۔(پرانے چراغ ج:۲ص/۶۰،۶۱)

دوسرا باب ''چند بزرگ شخصیتوں'' کے عنوان سے الحاج مفتی امین الحسینی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا محمد سلیم مکی پر مشتمل ہے، اور جس طرح بزرگ شخصیتوں کے بارے میں ہر طرح کے آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کے حالات کا تذکرہ ہونا چاہئے آپکو اس باب میں پورے ادب واحترام کے لحاظ کے ساتھ نظر آئے گا۔

تیسرے باب میں نامور ادیب وانشاء پرداز میں مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر رشید احمد صدیقی، چودھری غلام رسول مہر، مولانا ماہر القادری کی باکمال شخصیتیں نظر آئیں گی اور آپ انکے سوانحی تذکرہ کو لذت ادب سے معمور پائیں گے۔اور چوتھے باب میں ''چند علمائے کبار'' کے عنوان سے مولانا عبدالشکور فاروقی، علامہ بہجۃ البیطار، مولانا عبدالعزیز میمن، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی کا تذکرہ پڑھ کر آپ روحانی بالیدگی محسوس کریں گے۔ اور پانچواں باب ''چند محترم احباب ومعاصرین'' کے عنوان سے چار اہم شخصیتوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے، ان میں صوفی عبدالرب ایم۔اے، مولانا سید ابوبکر غزنوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا سید ابوالاعلی مودودی کے سوانحی خاکے اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ پڑھے جاسکتے ہیں اور چند عزیز اور محبوب شخصیتوں کے داغ مفارقت دینے کے بعد ''سینے کی داغ'' کے عنوان سے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ نہ صرف تأثر اور تصویر غم کا آئینہ ہے، بلکہ یہاں بھی شہسوار ادب کے تعزیتی مضامین لکھنے کی ایک نئی سمت متعین ہوتی ہے اور نیا اسلوب عطا ہوتا ہے، یہ آخری باب جن محبوب شخصیتوں پر مشتمل ہے۔ وہ ہیں مولانا سید ابوالخیر

برق، مولانا کی ہمشیرہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ، مولانا کے محبوب بھتیجے مولانا محمد الحسنی عرف محمد میاں اور مولانا اسحاق جلیس ندوی۔

اب ہمارے سامنے ''پرانے چراغ'' کی تیسری جلد ہے۔اس کا پہلا باب عالم عربی کی چند ناموراور دینی احباب کے تذکروں سے مزین ہے۔اس میں پہلا نام شیخ حسن البنا، دوسرے سید قطبؒ، تیسرا صالح قزازؒ اور چوتھا شیخ عبداللہ ابراہیم انصاریؒ کا ہے۔دوسرے باب کا عنوان ہے ''ممتاز دینی داعی اور روحانی مربی'' اس میں ذکر ہے، رئیس التبلیغ مولانا محمد یوسف کاندھلوی اور حضرت مولانا محمد احمد پھولپوری ۔تیسرا باب ''چند نامور معاصرین وقائد دین وملت'' کے تذکرے پر مشتمل ہے، اس باب میں آپ پڑھیں گے مجاہد ملت مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سید منت اللہ رحمانی کے ساتھ شہید صدر جنرل ضیاء الحق کا تذکرہ۔ اور چوتھے باب میں ''چند جلیل القدر علماء اور خادم دین'' کے عنوان سے تذکرہ ہوا ہے۔ مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی کا۔ پانچویں باب مین جو دس شخصیتوں کے تذکرے پر مشتمل ہے، آپ مطالعہ کریں گے، چند خادمان دین، کارکنان ملت، احباب ورفقاء کے عنوان سے سید محمد خلیل صاحب، ڈاکٹر آصف قدوائی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب، مولانا عبیداللہ بلیاوی، مولانا ابواللیث اصلاحی، حکیم عبدالقوی دریابادی، مولانا محب اللہ لاری ندوی اور مولانا عبدالرحیم مجددی کا۔ چھٹے اور آخری باب کا عنوان ہے ''چند خورد سال لیکن باکمال رفیق وعزیز'' اس میں تذکرہ ہے سید احمد الحسنی، مولانا

ابوالعرفان ندویؒ، مولانا محمد ثانی حسنی اور مولانا نور عظیم ندویؒ اور انہی عزیزوں کے ذکر پر ''پرانے چراغ'' کا تیسرا حصہ بھی اختتام پذیر ہوتا ہے اور سوانحی ادب کا وہ عظیم الشان خزانہ ہاتھ آتا ہے، جو تجربات، مطالعات، مشاہدات اور تربیت و پرداخت کا ایک عظیم ادبی اور تاریخی مرقع ہے۔ اردو زبان کے سوانحی ادب کی تشکیل میں اس کتاب کا جس قدر حصہ ہے اس کا اندازہ کرنا کتاب کی تمام جلدوں کا مطالعہ کئے بغیر مشکل ہوگا۔

مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بارے میں خود یہ تحریر فرمایا ہے کہ ''سیر و سوانح کا ادب میری نظروں میں سب سے زیادہ محبوب اور میرے لئے بہت آسان ہے، اور ادب کی اس صنف کیساتھ بچپن ہی سے مجھے بہت زیادہ شغف تھا، تذکرے اور انکی سوانح حیات عربی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھتا رہا، یہاں تک کہ اس موضوع پر میری کتابوں کا ایک مکتبہ تیار ہوگیا''۔

بلاشبہ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ کی اردو اور عربی دونوں زبانوں میں سیر و سوانح کے موضوع پر کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے جو اسلامی کتب خانہ کی زینت ہونے کے ساتھ ساتھ اہل علم و ادب اور اصحاب فکر و نظر کیلئے ایک بڑے تاریخی مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔

عزیز الحسن صدیقی

اردو زبان و ادب کی تشکیل میں غازی پور کا حصہ

غازی پور مشرقی اتر پردیش کا ایک قدیم ترین شہر ہے جو اپنی تاریخی حیثیت اور گوناگوں خصوصیات کی بنا پر پڑوسی شہروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اسکی بنیاد کسی دنیادار حکمراں نے نہیں بلکہ اللہ والوں کی جماعت کے ایک فرد نے رکھی تھی۔ مظلوم کی نصرت وحمایت اور ظالم حکمراں کے خلاف جہاد اس کی بنیاد کا سبب بنا۔

جوناخاں ملقب بہ محمد شاہ بن سلطان غیاث الدین تغلق کی حکومت میں فیروز شاہ تغلق (عم زاد جوناخاں) نائب السلطنت ہے۔ ایک بڑھیا اسکے دربار میں حاضر ہوکر فریاد کرتی ہے کہ کٹھوت کے راجہ چکوامان دھاتا نے اس کی لڑکی کو اپنے حرم میں داخل کرلیا ہے، مگر نہ جوناخاں کی ہمت پڑتی ہے کہ اس کے خلاف فوج کشی کرے، نہ فیروز شاہ اقدام پر آمادہ ہوتا ہے، بالآخر بڑھیا در در کی خاک چھانتی پھرتی ہے، اسی تگ ودو میں اس کو فقرائے اسلام کی ایک جماعت کا پتہ ملتا ہے اور اسی جماعت کے ایک

بزرگ سید مسعود کی خدمت میں حاضر ہوکر اپنی بپتا سناتی ہے، بزرگ اسکی امداد پر فوراً آمادہ ہوجاتے ہیں۔ جونا خاں کو جب معلوم ہوا کہ سید صاحب سرکش راجہ کی سرکوبی کے لئے تیار ہیں تو وہ بھی ایک لشکر ساتھ بھیجنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے، اس طور پر سید صاحب متوکلاً علی اللہ اپنے صاحب زادگان، سرکاری لشکر اور مجاہدین کو ساتھ لیکر کٹھوت روانہ ہوجاتے ہیں۔ دہلی سے کٹھوت تک کی طویل مسافت طے کر کے بیسوندی کے کنارے پہونچ کر سید صاحب چکوامان دھاتا کو دعوت مبارزت دیتے ہیں، چکوا مقابلے میں آتا ہے اور ہلاک ہوتا ہے، اس کے بعد اس کا بھتیجہ میدان مقابلہ میں اترتا ہے اور وہ بھی مارا جاتا ہے، دوسرے معرکے میں سید مسعود کے صاحبزادے سید راجے شہید ہوتے ہیں۔ جس جگہ انہیں شہادت نصیب ہوتی ہے وہیں انہیں دفن کردیا جاتا ہے اس طرح اس جگہ کا نام ''سید راجے'' پڑ گیا اور شہر کا ایک محلّہ بن گیا جس کو برادران وطن اب ہر شنکری کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ ۷۶۷ھ میں جب سید مسعود کا انتقال ہوگیا تو ان کو بھی اسی جگہ بیٹے کے بغل میں دفن کیا گیا۔اسی وقت سے دونوں قبریں برادران وطن کی عقیدت گاہ بنی ہوئی ہیں۔

بادشاہ کو جب چکوا مان دھاتا کے ہلاک ہونے اور سید مسعود کی کامیابی و کامرانی کی خبر ملی تو اس نے سید صاحب کو ملک السادات مسعود غازی کے لقب سے نوازا اور راجہ کے مقبوضات بھی ان کی سپردگی میں دیدیا۔ جس مقام پر ۷۳۰ھ میں یہ معرکہ پیش آیا وہیں ملک السادات مسعود غازی نے غازی پور کے نام سے ایک شہر آباد کیا جس کے قیام کا مادہ تاریخ ''حق استقلال'' ہے۔

سید مسعود نے اس جگہ ایک صالح حکومتی نظام قائم کیا۔علماء وصلحا کو لاکر یہاں آباد کیا، انکی قدر عزت کی، مدرسے اور مسجدیں تعمیر کیں، اس شہر کے محلوں اور آبادیوں کے نام، علماء اور مشائخ اور مجاہدین وغازیان کرام کے نام پر رکھے۔مثلاً قاضی منڈی، قاضی محمد غازی، مقری محلہ، جوڑن شہید، چندن شہید..............وغیرہ۔

کہتے ہیں دیار مشرق میں جون پور کے بعد غازی پور ہی وہ شہر تھا جو بجا طور پر مدینۃ العلم اور مدینۃ الحکمت کہلانے کا حق رکھتا تھا۔ملک السادات اپنی اولاد اور اپنے رفقا کے ساتھ یہیں رہ پڑے اور غازی پور اور اسکے قرب وجوار زنگی پور، دیوکھٹیا، نونہرا، پارہ وغیرہ میں یہ لوگ آباد ہوتے چلے گئے۔

۷۳۰ ہجری مطابق ۱۳۳۰ء میں غازی پور کے نام سے جو چھوٹا سا شہر آباد ہوا تھا اس کا تعلق دہلی اور لکھنؤ دونوں شہروں سے تھا۔ظاہر ہے کہ یہ دونوں ہی شہر زبان وادب ٹیکسال کی حیثیت رکھتے تھے اور اقتدار کے مرکز بھی تھے۔ان دونوں جگہوں سے فوجیں بھی آئیں، مزدور اور صناع بھی آئے اور علماء وادبا بھی آئے۔آمد ورفت کا یہ سلسلہ طویل عرصہ تک جاری رہا۔دہلی اور لکھنؤ کے زبان وادب کے دھارے بھی یہاں آکر ملے اور مقامی زبان پر اثر انداز ہوئے، اس طرح صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو زبان کا جنم ہوا۔تہذیبی وثقافتی تبادلے بھی ہوئے اور شعر وادب کے پیمانے بھی چھلکے۔

۱۳۲۷ء میں غازی پور کا دارالسلطنت دہلی سے باضابطہ وبراہ راست تعلق قائم ہو چکا تھا اور عوام وخواص کی آمد ورفت شروع ہو چکی تھی۔چونکہ عرصہ دراز تک غازی

پور مغلوں کے زیر نگیں رہا اور شاہی فوجوں کی آماجگاہ اور جنگی سرگرمیوں کا مرکز بھی رہا اس لئے یہاں کی تہذیبی و معاشرتی زندگی پر باہر سے آنیوالوں کا اثر پڑا اور اس میں شک نہیں کہ یہاں کا زبان و ادب دہلی اور لکھنؤ کی زبان و تہذیب اور ثقافت کے اثر سے ''عطرِ مجموعہ'' بن گیا۔ اس وقت تک فارسی ہی سرکاری و دفتری زبان تھی، مگر مقامی بولیوں اور علاقائی زبانوں سے مل کر اس نے ایک نیا روپ اختیار کیا، اسی روپ کا نام ''اردو'' پڑا۔ مختلف زبانوں کے اختلاط سے وجود میں آنیوالی زبان جسے ہم ''اردو'' کہتے ہیں، کل بھی عوام کے دلوں پر راج کرتی تھی اور آج بھی کرتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کو بدھ مت کی طرح (جو ہندوستان میں جنما مگر اسکو دیس نکالا دیدیا گیا) ہندوستان سے کھدیڑنے کی پوری کوشش کی گئی مگر وہ بدستور ہندوستانیوں کے دلوں کی دھڑکن بنی ہوئی ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ زبان فی الاصل دہلی اور لکھنؤ میں پروان چڑھی، فارسی کے کوکھ سے نکلی مگر مقامی زبانوں کے اثر اور میل جول سے اس پر نکھار آیا اور یہ حکومتوں کے دربار، عدالتی دفاتر اور کوچہ و بازار ہر جگہ پہونچ گئی۔ اس کے دلآویز حسن اور میٹھے بول نے سب کے من کو موہ لیا۔

ہم یہ دعوی تو نہیں کر سکتے کہ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ کی طرح دبستان غازی پور کا بھی علیحدہ وجود تھا، یا ہے لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ غازی پور جس طرح کل اردو کا گہوارا تھا آج بھی ہے۔ یہاں ہمیشہ صاف ستھری اور نکھری ہوئی اردو زبان کا چلن رہا ہے۔ آج بھی غازی پور کے لوگ اپنے پڑوسی شہروں اور اضلاع کے

مقابلے میں زیادہ صاف اور معیاری زبان بولتے ہیں۔

شیخ عبداللہ صدیقی کا عہد

۱۷۳۹ء میں اودھ کے پہلے نواب وزیر سعادت خاں کے داماد صفدر جنگ (۱) نے دھروارہ (ضلع غازی پور) کے محمد قاسم صدیقی کے بیٹے شیخ عبداللہ صدیقی کو تین لاکھ سالانہ کے پٹے پر غازی پور دے دیا گیا۔ شیخ عبداللہ نے اس شہر میں جہاں قابل دید خوبصورت عمارتیں، مسجدیں اور تالاب بنوائے اور وسیع باغ لگوایا وہیں علم دین اور زبان وادب کی بھی خدمت کی، وہ خود بھی علم دین سے آراستہ وزہد وتقوی کی دولت سے مالا مال تھا۔

ڈاکٹر علی شیر خاں مؤلف ''اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں غازی پور کی خدمات'' کا خیال ہے کہ غازی پور میں اردو شاعری کا آغاز سترہویں صدی میں ہو چکا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اردو زبان وادب ابتدائی مراحل سے گذر رہے تھے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ یہاں اردو زبان وادب میں اسی عہد سے اپنا ترقی کا سفر شروع کیا تھا۔ اس زمانے میں بادشاہوں اور نوابوں کے دربار میں قصیدوں کی زیادہ پذیرائی ہوا کرتی تھی اس لئے عام طور سے شعر گوئی پر زیادہ دھیان دیا جاتا تھا، نثری ادب پر کم توجہ دیجاتی تھی جس کی وجہ سے شعر و شاعری کا رواج عام ہو گیا مشاعروں کے انعقاد اور گل دستوں کی اشاعت کو اردو کے فروغ کے لئے کافی سمجھ گیا۔ اب صدیوں کے بعد اہل قلم نے اردو کی تاریخ کو کنگھالنے اور اردو زبان واد

(۱) ایچ، آر، نیول: گزیٹیر جلد ۲۹، مطبوعہ گورنمنٹ پریس الہ آباد ۱۹۰۹ء

کے فروغ میں غازی پور کا حصہ معلوم کرنیکی کوشش کی تو انہیں شعراء کی لمبی لمبی صفیں نظر آرہی ہیں جب کہ نثر نگار خال خال نظر آتے ہیں ایسا بھی نہیں ہے کہ اتنے طویل عرصے میں غازی پور میں کوئی نثر نگار پیدا ہی نہ ہوا ہو۔ راقم نے جستجو کی تو اس کو اس مردم خیز بستی میں اردو کے ایسے ایسے صاحب طرز انشاء پرداز، ادیب وصحافی اور نقاد نظر آئے جن پر نہ صرف غازی پور بلکہ پورے ملک کو ناز ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ اب تک صحیح معنوں مین ان پر کوئی کام نہیں ہوسکا ہے۔

ہم اس مختصر سے مضمون میں ان میں سے بعض کا ذکر کریں گے۔ چونکہ ہمیں اردو زبان کی تشکیل اور فروغ میں غازی پور کا حصہ متعین کرنا ہے اس لئے ہم صرف شاعروں کے تذکرے پر اکتفا نہیں کر سکتے، ہمیں نثر نگاروں کا بھی تعارف کرانا ہے اور یہ بھی ثابت کرنا ہے کہ غازی پور کے علماء وادبا نے گیسوئے اردو کو سنوارنے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔

اردو زبان وادب کا گہوارہ

جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، غازی پور ابتداء ہی سے اردو زبان وادب کا گہوارہ رہا ہے اور اس کے قصبات وقریات تک میں بڑے بڑے اہل قلم پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے بلند پایہ مضامین لکھے، کتابیں تصنیف کیں، قرآن پاک کی تفسیریں لکھیں، ترجمے کئے، تحقیق وتنقید کے فن کو نکھارا، بڑی بڑی جامعات میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ نزہتہ الخواطر، علمائے ہند، تراجم اہل حدیث وغیرہ میں ان کا اجمالی تذکرہ موجود ہے۔

علمی وادبی ماحول

فی زمانہ یہ شہر اجڑا اجڑا سا نظر آتا ہے، مگر ماضی میں بہت خوبصورت اور بڑا پرکشش تھا قاضی مرتضیٰ حسین بلگرامی (۱۷۱۹۔۱۷۹۵) نے ہندوستان کے دور دراز علاقوں کا سفر کرنے اور وہاں کے تاریخی حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد ''حدیقۃ الاقالیم'' کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اس کا بیشتر حصہ ۱۷۷۸ء۔۱۷۸۲ء کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے غازی پور کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''یہ ایک قدیم شہر ہے جو گنگا کے شمالی کنارے پر آباد ہے جنوبی کنارے پر قدیم آبادی ہے یہاں گلاب کے پھول بکثرت پیدا ہوتے ہیں، یہاں شیخ عبداللہ صدیقی غازی پوری کی چالیس ستونی عمارت ہے۔ الہ آباد کی چالیس ستونی عمارت سے اعلیٰ یہ عمارت ہے۔ اسکی عجیب بات یہ ہے کہ اسکی چھت پر فوارے لگائے گئے ہیں اور ستونوں کے اطراف نہریں جاری ہیں''۔

اس شہر کو پھولوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے چپے چپے پر کیوڑا، گلاب، جوہی، چمبیلی اور بیلے کے باغات تھے یہی وجہ ہے کہ ایچ آر نیول کلکٹر غازی پور نے بھی گزیٹیر (جلد ۲۹) میں اس شہر کے موسم، خوشگوار فضا اور رونق و بہار کا تذکرہ کیا ہے۔ بڑے بڑے مصنفین و محققین اور ادباء و شعراء یہاں کشاں کشاں چلے آتے تھے۔ مشہور بنگالی ادیب رابندر ناتھ ٹیگور ۱۸۸۷ء میں یہاں آئے اور عرصے تک دریائے گنگا کے ساحل پر اپنے ایک عزیز کے بنگلے میں مقیم رہے یہاں انہوں نے

متعدد کتابیں لکھیں۔ ملک محمد جائسی نے بھی یہاں قیام کیا ہے۔

اس شہر کا ماحول علمی وادبی کاموں کے لئے ہمیشہ سازگار رہا ہے اور خاص طور سے اردو زبان وادب کے ارتقاء میں اسکا بڑا حصہ رہا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ علم دوست اور ادب نواز حکام یہاں تبادلہ کرا کے آتے تھے اور قیام کرتے تھے۔ سرسید احمد یہاں آئے۔ بانی چشمۂ رحمت مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی آئے۔ مولانا عبدالشکور مچھلی شہری (جن کو بقول مولانا مناظر احسن گیلانی سرکار انگریزی کی طرف سے مناصب جلیلہ حاصل تھے اور اپنے ساتھ طلبہ کی جماعت بھی رکھتے تھے) آئے۔ مؤلف ''تذکرہ علماء ہند'' مولوی رحمٰن علی آئے۔ [1] اکبر الہ آبادی آئے۔ حکیم جمیل الدین نگینوی آئے۔ قاضی عبدالودود آئے۔ علامہ شبلی، شوق نیموی اور حیات اللہ انصاری نے یہاں تحصیل علم کیا۔ آل احمد سرور نے اپنی ابتدائی تعلیم یہیں سے شروع کی۔ علی عباس حسینی کا تو یہ وطن ہی تھا مگر اپنی ملازمت کے آخری دور میں وہ مقامی گورنمنٹ کالج میں بحیثیت پرنسپل مامور رہے۔

صفیر بلگرامی

ظفر اوگانوی لکھتے ہیں۔۔۔

''صفیر بلگرامی (شاگرد غالبؔ) ۱۸۷۴ء میں غازی پور گئے تھے، اس سفر کی یادگاران کی مثنوی ''دعوت احباب'' ہے جو ۱۲۹۱ھ میں آرہ سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں غازی پور کے ان شعراء کا

(۱) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ص ۴۲۹: مولانا مناظر احسن گیلانی''

تذکرہ کیا ہے جن سے ان کی ملاقات ہوئی تھے"۔[۱]

اردو کے غیر مسلمین محبین

ملک کی آزادی کے بعد ایک منصوبے کے تحت اردو کو بھی بانٹ دیا گیا اور اس کا رشتہ مذہب سے جوڑ دیا گیا حالانکہ دور عصبیت سے پہلے یہ سب کی زبان تھی۔ میرؔ و غالبؔ کی تھی تو نگمؔ اور چکبستؔ کی بھی تھی۔ طوالت کا خوف دامن گیر نہ ہوتا تو ہم اردو کے ابتدائی دور سے آج تک کے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں کی خدمات کا تفصیل سے ذکر کرتے اور ثابت کرتے کہ گیسوئے اردو کو سنوارنے میں صرف مسلمانوں ہی کا نہیں غیر مسلموں کا بھی ہاتھ ہے۔

> سدا سکھ سہائے جو نثارؔ دہلوی کے تخلص سے مشہور ہیں، اکبر شاہ ثانی کے عہد کے مشہور شاعر ہیں۔ انہوں نے آخری دنوں میں الہ آباد میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کا وطن سید پور (غازی پور) تھا۔[۲]

ماضی بعید کے ایک محسن اردو کا ذکر ہو چکا، اب ماضی قریب کے ایک شیدائے اردو کا بھی ذکر سن لیں۔ مولوی رام کرپال لال عرشیؔ غازی پوری (وفات ۱۹۶۹ء) کے بارے میں مشہور ہے کہ میٹرک کے امتحان کا پرچہ انہوں نے منظوم اردو میں حل کیا تھا اور جب انہوں نے وکالت کا امتحان پاس کر لیا تو پہلا عرضی دعوی جو حاکم کی عدالت

---

(۱) صفیر بلگرامی ص/۱۰۸: مؤلف ظفر اوگانوی

(۲) اردو شاعری کی ارتقاء میں ہندو شاعروں کا حصہ، مطبوعہ الہ آباد ۱۹۶۹ء، مصنفہ گپت سہائے سریواستوا

میں پیش کیا وہ بھی منظوم اردو میں تھا اور اس کی تاریخ اس مصرعے کے ذریعہ نکالی تھی۔

''یہ تصدیق کہتا ہوں اے عدل گستر''۔

۱۹۳۹ء

چمنستان اردو کی آبیاری کرنیوالے

ماضی کی چند صدیوں میں چمنستان اردو کی آبیاری ورکھوالی کرنے والوں کے صرف نام ہی لکھے جائیں تب بھی سیکڑوں صفحات درکار ہوں گے پھر بھی حق ادا نہ ہوگا اور ''گل چین بہار'' کو تنگ دامانی کا گلہ رہے گا۔

غازی پور میں ایسے بہت سے علماء و محققین اور ادیب وصحافی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی تقریروں، اپنے درس اور اپنی تالیفات سے اردو زبان وادب کو مالا مال کیا۔ کچھ لوگ باہر سے آئے اور یہاں رہ کر خدمت کی اور چلے گئے مثلاً سر سید احمد خاں، حکیم جمیل الدین نگینوی اور بعض وہ تھے جو یہاں رہ پڑے۔ مثلاً مولانا رحمت اللہ فرنگی محلی، مولانا فاروق چریاکوٹی اور مولانا عبدالاحد شمشاد۔ سر سید (قیام غازی پور ۶۴۔ ۱۸۶۲ء) اور حکیم جمیل الدین نگینوی (قیام غازی پور ۱۸۔۱۹۰۳ء) کے عہد میں غازی پور میں مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف ہوئیں۔ سر سید نے اپنے انداز وفکر کے مطابق تصنیف وتالیف کا شغل جاری رکھا اور حکیم جمیل الدین نگینوی نے اپنے نہج پر کام کیا، علمی مباحثوں کا بھی سلسلہ رہا۔ سر سید نے صرف ایک مدرسہ قائم کیا جب کہ حکیم صاحب نے بہت سے مدرسے قائم کرنے والے پیدا کئے۔ سر سید کے مدرسہ کا تعلق سرکار برطانیہ سے تھا اس لئے اس کا نام ملکہ برطانیہ کے نام پر وکٹوریہ گورنمنٹ اسکول

رکھا گیا اور ملک کی آزادی کے بعد اس کا نام شیو ناتھ سنگھ گرلز اسکول ہو گیا۔ حکیم جمیل الدین کے صرف ایک شاگرد مولانا عمر فاروق (م ۱۳۶۳ھ) نے اگرچہ شہر غازی پور میں ایک ہی مدرسہ "مدرسہ دینیہ" کے نام سے قائم کیا مگر ان کی تحریک اور ان کے شاگردوں کی مساعی کے نتیجے میں درجنوں چھوٹے بڑے مدرسے کھلتے چلے گئے جو ایک طرف دینی تعلیم کو رواج دے رہے ہیں تو دوسری طرف اردو زبان کی بقا کا سامان کر رہے ہیں۔

باہر سے آنے والے جو علماء و ادباء غازی پور کے ہو رہے انہوں نے چشمۂ رحمت اورنیٹل کالج کو اپنی خدمات کا مرکز بنایا۔ مثلاً مولانا رحمت اللہ پہلی بار سرسید کی دعوت پر غازی پور آئے اور سرسید کے مدرسے کے ناظم مقرر ہوئے۔ پھر دوبارہ ۱۸۶۹ء میں آئے تو چشمۂ رحمت قائم ہوا۔ مولانا فاروق چریا کوٹی (۱۸۰۹ء) اور مولانا عبدالاحد شمشاد (م ۱۹۰۰ء) یہاں آئے تو پھر لوٹ کر نہیں گئے اور یہیں کی خاک کے پیوند ہو گئے۔

اردو زبان کے فروغ میں مدارس کا رول

دنیا جانتی ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں مدارس کا کیا رول رہا ہے۔ ملک کے دوسرے مقامات کی طرح غازی پور کے مدارس نے بھی اردو زبان و ادب کو مقبول بنانے کے سلسلہ میں اہم رول ادا کیا ہے۔

سرسید کی کاوشیں

سرسید احمد خاں ۱۸۶۲ء میں بحیثیت صدر اعلی (سب جج) غازی پور آئے۔

وہ برطانوی حکومت کے ملازم تھے۔ مگر ۱۸۵۷ء کا انقلاب اور ہندوستانیوں پر انگریزوں کے مظالم اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اس لئے ان پر بڑا اثر تھا۔ چنانچہ دوسرے ہی سال یعنی ۱۸۵۸ء میں انہوں نے ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' لکھ کر انگریزوں کے مظالم پر سے پردہ اٹھایا تھا، ان پر سخت تنقیدیں کی تھیں اور ہندوستان کی بربادی کا ماتم کیا تھا۔ پھر ۱۸۵۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تھا۔ ان کے دوستوں کا خیال تھا کہ سرسید آگ اور خون سے کھیل رہے ہیں اور مشورہ دیا تھا کہ سرسید اس کتاب کو فوراً جلادیں ورنہ جان سے ہاتھ دھونا پڑیگا، مگر وہی سرسید بعد کے حالات میں ایسے بدلے کہ انہوں نے انگریزوں کی مخالفت ترک کر کے مفاہمت وحمایت کی راہ اختیار کرلی۔ تاہم وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں جہاں جہاں گئے عام ہندوستانیوں کی بہی خواہی، قومی اتحاد اور خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کی ہمدردی اور اردو زبان کی خدمت سے غافل نہیں رہے۔ وہ نہ خود انگریزوں سے ٹکرانا چاہتے تھے نہ مسلمانوں کو ٹکرانے کا مشورہ دیتے تھے انکے غازی پور سے چلے جانے کے بعد حکومت نے بنارس میں کبیر چورا کے مقام پر ایک اسپتال بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس جگہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی، حکومت اس کو اسپتال کی خاطر منہدم کرنا چاہتی تھی۔ مسلمان آڑے آئے تو حکومت نے سرسید کا بنارس تبادلہ کیا۔ سرسید نے بنارس آکر مسلمانوں کو مخالفت سے باز رکھا اور مسجد منہدم ہوگئی اور حکومت نے وہاں سے تھوڑی دوری پر لوہٹیا میں دوسری مسجد بنوادی۔ بنارس کے سرکاری ریکارڈس میں اس واقعہ کی تفصیلات محفوظ ہیں۔ موضوع سے ہٹ کر محض سرسید کے ذہن وفکر کی طرف ہلکا سا اشارہ کرنے کی خاطر ہم نے یہ

واقعہ تحریر کیا ہے۔جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں، سر سید نے غازی پور آنے کے بعد ایک مدرسہ قائم کیا۔جس کے بارے میں مولانا حالی فرماتے ہیں:

"یہ مدرسہ مثل مدرسۃ العلوم کے محض قومی چندے سے "سیلف ہیلپ" کے اصول پر قائم کیا گیا تھا۔ بعد میں یہ مدرسہ وکٹوریہ اسکول کے نام سے ہوا اور ہائی اسکول تک پڑھائی ہوتی تھی"۔ ۱

مدرسہ قائم کرنے سے پہلے انہوں نے ۱۸۶۲ء میں ایک تحریر "التماس بخدمت ساکنان ہندو ارباب علم فی تعلیم اہل ہند" لکھکر اپنے ذاتی پریس سے چھپوا کر شائع کی تھی۔ انہوں نے یہاں ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی او رتقریروں، تحریروں، علمی مباحثوں اور سائنسی تجربوں کے علاوہ مغربی علوم کی اہم کتابوں کو ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنیکا ایک عظیم الشان منصوبہ تیار کیا۔سوسائٹی قائم کرنے کے بعد انہوں نے مختلف زبانوں کے ترجمے کا کام کرنے کیلئے جن اصحاب کو مامور کیا تھا ان میں اردو کا ترجمہ کرنے والے بابو گنگا پرشاد تھے، جو انگریزی کتابوں کا متن اردو میں مولوی فیض الحسن کو بتاتے تھے اور وہ اس کو سلیس اور بامحاورہ اردو میں لکھ لیتے تھے۔انہوں نے "تزک جہاں گیری" کا متن ۶۴۔۱۸۶۳ء درمیان یہیں لکھا اور اس کا ابتدائی جزو یہیں چھپوایا، اس کے علاوہ سر سید احمد خاں نے اپنے نانا فرید الدولہ کی فارسی زبان کی تصنیف "فوائد الافکار فی اعمال الفرجاد" کا اردو میں ترجمہ کر کے غازی پور سے شائع کیا۔ ۲ اس کے علاوہ تاریخ فیروز شاہی جس کی

(۱) حیات جاوید: ص/۱۲۶

(۲) تذکرۂ مشائخ؟ غازی پور ص/۱۷۵: عبید الرحمن صدیقی

تدوین انہوں نے مراد آباد میں شروع کی تھی یہیں آ کر مکمل کی، جس کو ۱۸۶۲ء میں ایشیاٹک سوسائٹی نے چھاپا۔

سرسید نے "تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل" غازی پور ہی کے زمانہ قیام میں لکھی تھی۔ یہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تھی۔ اس کتاب کی تصنیف کے وقت ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ مختلف آسمانی کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے۔ وہ عبرانی زبان سے ناواقف تھے اس لئے ایک یہودی عالم کو پندرہ سو روپئے ماہانہ پر ملازم رکھا علاوہ ازیں وہ خود ہر ہفتے چھٹی کے دن یکہ سے چریا کوٹ جاتے تھے، جہاں مولوی عنایت رسول سے بھی عبرانی زبان سیکھتے تھے۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے اس کا انگریزی ترجمہ ایک انگریز سے کراتے تھے، جس کو سو روپئے ماہانہ دیتے تھے۔ اس تفسیر کو چھاپنے کیلئے انہوں نے اپنی جیب سے ہزاروں روپئے خرچ کر کے رڑکی سے پریس منگوایا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے علمی کام ایسے تھے جو زیادہ تر اردو میں ہوئے اور اردو زبان وادب کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ کا سبب بنے۔

سرسید اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔ ان کا غازی پور میں قیام یقینی طور پر اردو کے حق میں مفید اور کارآمد ثابت ہوا۔ انکے چلے جانے کے بعد دوسرے خادمان اردو نے آگے بڑھ کر اردو کا پرچم سنبھالا۔ دو ہی سال بعد سرسید علیگڑھ چلے گئے، ورنہ ظاہر ہے کہ جن کاموں کی بنیاد انہوں نے ڈالی تھی وہ اگر جاری رہتے اور ترجمہ و تالیف کا سلسلہ اسی طرح جاری رہتا تو یقیناً اردو کو فائدہ پہونچتا تاہم اردو اپنی خوبیوں اور محاسن کی بنا پر ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔

اردو کو علمی زبان بنانے کا کام

اردو کی تاریخ اور ہندوستان بھر میں اردو کو علمی و ادبی زبان بنانے کا پہلا کام غازی پور ہی میں شروع ہوا تھا اور یہ کام وقتی نہ تھا بلکہ براہ راست اسی تحریک کے زیر اثر آگے چل کر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج وجود میں آیا۔

جان گلکرسٹ نیل کی کاشت کے سلسلے میں ۱۷۸۲ء میں (فورٹ ولیم کالج کے قیام سے پہلے) غازی پور میں تھا۔ اس نے یہیں پہلی انگلش اردو اور اردو انگلش ڈکشنری تیار کی۔ ۱۷۹۰ء میں یہ ڈکشنری زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ گلکرسٹ نے یہیں ایک اور کتاب (ہندوستانی زبان کے قواعد) کا خاکہ بھی تیار کیا۔[۱]

میر معین الدین فیضؔ

انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں غازی پور میں ایسے شعراء گذرے ہیں جن کو اگرچہ ہندوستان گیر شہرت نہیں ملی مگر فن میں کامل دستگاہ حاصل ہونیکی وجہ سے ادب میں ان کو اہمیت حاصل ہے۔ ایسے شاعروں میں میر معین الدین فیضؔ بھی شامل تھے۔ اردو کا غیر ملکی محسن جان گلکرسٹ بھی ان کی علمی قابلیت کا قائل تھا۔

میر معین الدین کو جان گلکرسٹ کے ایماء پر ہی فورٹ ولیم کالج میں ملازمت ملی تھی اور انھوں نے ''پند نامہ شیخ فرید الدین عطار'' کا ترجمہ کیا۔ اور ''چشمۂ فیض'' نام رکھا۔ فیض نے خود لکھا ہے کہ ''۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۳ء میں جان گلکرسٹ کے حکم سے فرید الدین عطار نیشا پوری کے پند نامہ کا ترجمہ کیا''۔

---

(۱) اردو ادب کی ارتقاء میں غازی پور کی خدمات: ص ۱۴۳، ڈاکٹر علی شیر خاں

ڈاکٹر جاوید نہال لکھتے ہیں:

''مقام افسوس ہے کہ چشمۂ فیض شائع نہ ہو سکی، مگر اردو ادب کی یہ خوش بختی ہے کہ چشمۂ فیض کا اصل نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ ان کی مترجمہ منظوم مثنوی سے ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں بڑی سلاست، روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ ان کی مثنوی سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔[۱]''

ہے وہ عاقل جو کوئی شاکر رہے　نفس بد پر اپنے وہ قادر رہے
گرچہ درویشی ہے مشکل اے عزیز　پر نہیں کچھ اس سے بہتر اور چیز
جس نے قابو میں کیا یہ نفس بد　ساتھ نیکی کے ہوا وہ نامزد
غیبت مردم کا مت کیجو خیال　کہ عذاب حق سے چھٹنا ہے محال

انیسویں صدی کا گلدستہ

قاضی عبدالودود اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ انکے والد عبدالوحید وحیدؔ کی چند غزلیں غازی پور میں شائع شدہ گلدستہ میں چھپی تھیں۔

وکٹوریہ اسکول پریس

وکٹوریہ اسکول جو سر سید کے مدرسہ کی بگڑی ہوئی شکل تھا، مگر سر سید جو کچھ چھوڑ

(۱) بنگال میں اردو: ڈاکٹر جاوید نہال

گئے تھے، اس کو کچھ دنوں تک اس نے سنبھالئے رکھا۔ ایک انگریز مصنف نے مظہر العجائب کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۸۶۹ء میں وکٹوریہ اسکول پریس سے شائع ہوئی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈیڑھ دو سال قبل غازی پور میں اردو پریس نے کام شروع کر دیا تھا۔

کلام آسی

مولانا عبدالعلیم آسی غازی پور کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کا کلام ادب کا سرمایہ اور ادب برائے زندگی کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کی ایک ایک نظم اور ایک ایک غزل ادب پارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے ایک شاگرد مولوی عبدالصمد ایک بار دہلی گئے تو انکی چند غزلیں ساتھ لیتے گئے اور غالبؔ کو سنایا۔ غالب دم بخود سنتے رہے، اس کے بعد کہا، ''اللہ اللہ! ایسے لکھنے والے اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں!''۔ مولانا آسی کہا کرتے تھے، غالب ہوتے تو سننے سنانے کا لطف تھا۔ آسی صوفی تھے اور غالبؔ رند و مشرب، مگر دونوں کے کلام میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے دلدادہ تھے۔ غالبؔ کا یہ شعر۔

ایسی جنت کو کیا کرے کوئی
جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں

تو خیر ان کے مذاق کے مطابق معلوم ہوتا ہے، مگر آسی جیسے صوفی اور عالم کا یہ شعر بہت کھٹکتا ہے۔

اللہ کے پلے میں وحدت کے سوا کیا ہے
جو کچھ ہمیں لینا ہے لے لیں گے محمدؐ سے

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

اس مختصر سے مضمون میں غازی پور سے تعلق رکھنے والے سبھی اہل قلم کی تصانیف کا مفصل تذکرہ کرنا یا شعراء کی تخلیقات کا تعارف کرانا ممکن نہیں ہے، اس لئے ہم ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر ماضی قریب کے چند اصحاب کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ اصحاب ہیں جنہوں نے اپنی نگارشات سے اردو زبان و ادب کو مالا مال کیا ہے، مگر ہم ساتھ ہی یہ شکوہ بھی کریں گے کہ ان شخصیتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور انہیں وہ مقام بھی نہیں دیا گیا جس کے یہ مستحق تھے، حالانکہ ان میں سے ایک ایک فرد اس لائق تھا کہ اس پر تحقیقی مقالے سپرد قلم کئے جاتے مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ جس دور سے تعلق رکھتے تھے وہ چھپنے سے زیادہ چُھپنے کا دور تھا تاہم اخلاف کا فرض تھا کہ اپنے اسلاف کے کارناموں پردہ خفا میں نہ رہنے دیتے۔ علی ھذا القیاس موجودہ دور میں بھی بعض اہم علمی شخصیتیں ایسی موجود ہیں جن پر اہل غازی پور ناز کرنیکا حق رکھتے ہیں۔ مثلاً مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب جو ضعف و نقاہت اور پیرانہ سالی کے باوجود اب بھی میدان تصنیف و تالیف میں سرگرم ہیں اور ملک و بیرون ملک میں ان کی علمی حیثیت اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ انہوں نے برسہا برس تک دارالمصنفین میں تصنیفی خدمات انجام دینے کے بعد علامہ شبلی

کے شہر اعظم گڑھ میں ہی جامعۃ الرشاد کے نام سے ایک علمی و تعلیمی ادارہ قائم کیا اور فقہ و تاریخ پر سیکڑوں مضامین اور درجنوں کتابیں لکھیں۔ بلاشبہ موصوف اور انکی صف کے دیگر مصنفین کو ادب اسلامی کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے۔

ماضی کے ممتاز اہل قلم

مولانا سید عبدالرشید بزرگاوی سچے عاشق رسولؐ تھے۔ تمام عمر علوم نبوی کی تحصیل و اشاعت میں صرف کی۔ ۱۸۷۸ء میں جب مدرسہ شاہی مراد آباد کا قیام عمل میں آیا تو اس کے اولین مہتمم منتخب ہوئے۔

ادبی ذوق۔ قدرت نے آپ کو ادب کا ذوق سلیم عطا فرمایا تھا۔ ۱۳۰۱ھ میں منعقدہ جلسہ دستار بندی کے موقع پر مولوی حشمت حسین نے ایک قصیدہ کہا تھا جس میں آپ کو سرخیل ارباب سخن کہا تھا۔ آپ نے نثر و نظم دونوں میدانوں میں سدا بہار گل کھلائے ہیں۔ آپ کی شاعری کا مقصد دنیاوی جاہ و حشم نہیں تھا، بلکہ اللہ تبارک وتعالی اور اس کے محبوب کی بارگاہ میں ہدیہ عقیدت و محبت پیش کرتے ہوئے اپنی بندگی کا اظہار کر کے مغفرت کا سامان مہیا کرنا تھا۔ آپ کی شاعری میں گل وبلبل کے فسانے نہیں ہیں، بلکہ حقیقی واردات قلبی کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کی تمام تر شاعری حمد و نعت پر مشتمل ہے۔

تصنیف و تالیف۔ مثنوی درد دل، محسن الاسلام، کلیات رشیدیہ (مجموعہ مکتوبات) کلیات رشیدیہ (نظم) وغیرہ۔ وفات: ۱۹۰۴ء میں بمقام مراد آباد انتقال ہوا۔

شیخ عبدالمجید رسوا غازی پوری۔ حاتم علی مہر کے شاگرد تھے۔ ۱۲۸۶ھ میں بسلسلۂ ملازمت آگرہ میں مقیم تھے۔ غالب سے تلمذ رکھتے تھے۔

مولانا محمد جان ادیب بحری آبادی (م ۱۹۲۰ء)

عربی و فارسی کے علاوہ اردو کے بڑے ادیب تھے۔ علامہ فاروق چریا کوٹی کی صحبت و تربیت نے انکی ادبی صلاحیت کو جلا بخشی تھی، انہوں نے اپنے درس و تدریس اور تحریر و تقریر سے اردو زبان و ادب کو بہت فائدہ پہونچایا۔

ذاکر حسین انجم (ولادت ۱۹۸۱ء)

معروف ادیب و شاعر تھے۔ ہفتہ وار ''انیس ہند'' کے مدیر تھے۔

شاہ علی اعظم فریدی

مشہور و ممتاز ادیب و شاعر تھے۔ ۱۹۳۴ء میں ماہنامہ ''آسی'' کا اجراء کیا۔

جمیل احمد صدیقی

مشہور ادیب تھے۔ ماہنامہ ''آسی'' میں انکے افسانے چھپتے تھے۔

نظیر ہاشمی

مشہور ادیب و صحافی تھے۔ رسالہ ''آسی'' آپ ہی کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا۔ مختلف جریدوں کے ایڈیٹر رہے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ علامہ اقبال کی کسی کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ کتاب نایاب ہے۔

زاہد حسین جوہر (م ۱۹۸۳ء)

شاعر افسانہ نگار اور صحافی تھے۔

علامہ جمیل مظہری (م ۱۹۸۵ء)

بنیادی طور پر شاعر تھے، مگر مضامین اور افسانے بھی لکھے ہیں۔ عہد ساز شخصیت کے مالک تھے۔

علامہ رضا مظہری (م ۱۹۸۵ء)

بحیثیت شاعر مشہور ہیں۔ مگر بلند پایہ نثر نگار بھی تھے۔ آپ نے کئی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی کے ایماء پر ٹیگور کے ناول ''جوگا جوگ'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تحریک پر انجمن ترقی اردو کے لئے ۱۹۴۵ء میں مشہور افسانہ نگار سرت چندر چٹرجی کے ناول ''چرترہین'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔

علی عباس حسینی (م ۱۹۶۹ء)

۱۸۹۷ء میں بمقام ''پارہ'' پیدا ہوئے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، ساری عمر درس و تدریس میں گذاری، جونیر اور ہائی اسکول کے نصاب کی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کی ایک کتاب ''گلستاں'' کشمیر یونیورسٹی میں رائج ہے۔ متعدد بلند پایہ انگریزی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مشہور افسانہ نگار تھے۔

مولانا عبدالوحید صدیقی غازی پوری (م ۱۹۸۱ء)

موضع ''بہرا'' ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خاندانی رواج کے خلاف اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لئے دیوبند پہونچے۔ فراغت کے بعد آزادی کی تحریک اور تصنیف و تالیف کے میدان میں اپنی فطری صلاحیتوں کا پرچم نصب کیا۔ مینجمنٹ کی تعلیم حاصل کی۔ نہ اس کی ڈگری رکھتے تھے، مگر اس میدان کے بھی شہسوار

نکلے۔ سب سے پہلے دہلی سے ماہنامہ ''جاوید'' نکالا۔ دارالعلوم دیوبند میں ناظم شعبۂ تنظیم وترقی رہے۔ پہلا اخبار ''الجمعیۃ'' کے جنرل منیجر بنائے گئے۔ مولانا ظفر علی خاں مدیر ''زمیندار'' لاہور کے معاون رہے، پھر ''نئی دنیا'' نکالا۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عثمان فارقلیطؔ کے بعد اگر کسی کو بابائے اردو صحافت کہا جا سکتا ہے تو انہیں کو کہا جاسکتا ہے۔ بیباک قلم، بے خوف اور نڈر صحافی مولانا عبدالوحید نے کوئی کتاب نہیں تصنیف کی، مگر کتابیں لکھنے والے اور بیباک صحافت کرنیوالے اپنے پیچھے ضرور چھوڑ گئے۔ ان کی یادگار اردو کا کثیر الاشاعت ہفت روزہ ''نئی دنیا'' تو ہے ہی، اس کے علاوہ متعدد ماہنامے اور ڈائجسٹ ان کے صاحبزادگان نکالتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا گھرانہ اس وقت اردو زبان وادب کی جس اعلیٰ پیمانے پر خدمت کر رہا ہے اس کی کوئی مثال نہیں پیش کی جاسکتی۔

مولانا سید احمد علی زمانوی (م ۱۹۰۷ء)

مختلف علوم وفنون پر کتابیں تصنیف کیں، جن میں کچھ ہی چھپ سکیں۔ تفصیلات حاصل نہ ہوسکیں۔

مولانا عبدالرحمٰن بقاؔ (م ۱۹۱۶ء)

اردو کے بلند پایہ ادیب وشاعر تھے۔ اپنی تحریروں اور اشعار سے اردو ادب کو نالامال کیا۔ صاحب دیوان شاعر تھے، مگر دیوان طباعت کی منزل تک نہ پہونچ سکا اور ضائع ہوگیا۔ مختلف موضوعات پر آپ کے مسودات کا ذخیرہ بھی شائع نہ ہوسکا اور دستبرد زمانہ کی نذر ہوگیا۔

مولانا فضل الرحمٰن باقیؔ (م ۱۹۶۱ء)

عربی اور اردو کے بلند پایہ عالم اور نامور ادیب و شاعر تھے۔کلکتہ یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے استاذ تھے، ادبی رسائل میں برابر آپکے مضامین چھپتے رہتے تھے۔مختلف موضوعات پر سیکڑوں صفحات لکھے ہیں۔عبدالعلی شوقؔ سندیلوی نے اصلاح سخن نامی کتاب ترتیب دینے کی غرض سے جن چالیس شعراء کی خدمت میں غزل برائے اصلاح بھیجی تھی ان میں مولانا باقی بھی تھے۔

مولانا ابوالحسن صدیقی حلیم (م ۱۹۶۷ء)

دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور جنگ آزادی کے سورما تھے۔عربی، فارسی اور اردو کے بلند پایہ ادیب و شاعر تھے۔تحریک آزادی میں انہماک اور ''ادارہ دینیہ'' کی ذمہ داریوں نے تصنیف و تالیف کا موقع نہیں دیا، پھر بھی بہت کچھ لکھ گئے، مگر چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔بکثرت مضامین، چند چھوٹے چھوٹے اصلاحی رسائل، سفرنامہ حج اور جیل کی ڈائری بہ عنوان ''حدیث زنداں''، سیرت پر ''رسول خدا'' وغیرہ چھپ چکی ہیں اور کئی مسودات چھوڑے ہیں۔غازی پور کی تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کو تلاش کرنے والے سب سے پہلے مصنف وہی ہیں، جس کی بنیاد پر بعد والوں نے کام کیا۔مقامات بدیع الزماں ہمدانی کی اردو شرح بھی لکھی تھی جو کتب خانہ اسلامیہ ڈھاکہ سے شائع ہو چکی ہے۔مولانا مرحوم اعلیٰ درجہ کے نعت گو بھی تھے۔ارمغان نعت شائع کردہ دینیہ اکاڈمی (۱۹۹۹ء) میں زائر حرم حمیدؔ صدیقی لکھنوی اور مولانا سید محمد ثانی حسنی رائے بریلوی کی منتخب نعتوں کے ساتھ مولانا ابوالحسن صدیقی کی نعتوں کا مجموعہ بھی شامل ہے۔

مولوی قمر احمد بحری آبادی

پیشہ سے وکیل تھے، مگر دلچسپی سیاست اور ادب سے تھی۔ آزادی کے سپاہی بھی تھے اور قلم کے بادشاہ بھی۔ مولانا شوکت علی کیساتھ روزنامہ ''خلافت'' ایڈیٹ کرتے رہتے تھے۔ ''اجمل'' اور ''چترا'' بمبئی میں ان کی نظمیں اور نثر پارے چھپتے رہتے ان کا ایک کارنامہ جو ادب کی دنیا میں شاہکار ہے ''میگھ دوت'' کا اردو میں منظوم ترجمہ ہے جو ''سندیسا بادل'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ مشہور نقاد، محقق اور دانشور علی جواد زیدی نے اس کا تعارف کرایا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم احراری (م ۱۹۷۶ء)

وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ مشہور معلم و ادیب۔ (۱۹۷۲ء) ترقی اردو بیورو کے چیئرمین بنائے گئے۔ متعدد علمی و ادبی کتابیں لکھیں۔ تنقید پر بھی کئی مقالے لکھے، ان کا سب سے اہم مضمون ''ادبی تنقید کے بنیادی اصول'' ہے، جو نیا ادب میں چھپ چکا ہے۔ (۱۹۳۰ء) میں انہوں نے ایک کتاب ''سیرت نبوی اور مستشرقین'' لکھی تھی، جس کو اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ نے مطبع معارف اعظم گڑھ سے چھپوا کر شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب میں ولہا وزن اور دوسرے مستشرقین کو دندان شکن جواب دیا ہے اور جا بجا سیرت نبوی کے حوالے دیئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف اردو زبان کے تحفظ و بقا کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ جامعہ اردو کی بارہ سال تک بے لوث خدمت انجام دی۔

پروفیسر ممتاز حسین پاروی (م ۱۹۹۲ء)

مشہور نقاد پروفیسر ممتاز حسین کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

نقد حیات، ادبی رسائل، انتخاب غالب، مقدمہ باغ و بہار مع مقدمہ و فرہنگ، ادب اور شعور، غالب ایک مطالعہ، امیر خسرو حیات اور شاعری، حالی کے شعری نظریات، ایک تنقیدی مطالعہ، میر تقی میر حیات اور شاعری۔

مولانا اسماعیل ذبیح غازی پوری (م ۱۹۴۶ء)

مدرسہ دینیہ غازی پور کے ابنائے قدیم میں تھے اور اسکے شعبہ عربی میں استاذ بھی رہے۔ بلند پایہ ادیب تھے۔ شعر و شاعری سے بھی شغف تھا۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۵ء تک مدرسہ دینیہ میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد موتمر المصنفین دہلی سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے درجنوں مضامین اور خطوط جو ادب پارے کی حیثیت رکھتے ہیں ان کی یادگار ہیں۔

مولانا مشتاق احمد غازی پوری (م ۱۹۹۳ء)

مدرسہ دینیہ غازی پور کے ابنائے قدیم میں ممتاز تھے، اور اسکے صدر مدرس بھی رہے۔ کئی کتابیں لکھیں جن منہاج الاسلام اور ریحان الجنۃ بہت مقبول ہوئیں اور انکے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔

پروفیسر مشیر الحق بحری آبادی (م ۱۹۹۰ء)

مشہور عالم اور ادیب، وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی۔ مختلف کتابوں کے مصنف۔

پروفیسر شبیہ الحسن نونہروی (م ۱۹۹۸ء)

ہندوستان کے مشاہیر اہل قلم میں آپکا شمار ہے۔آپ نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔اردو کے ممتاز عالم اور محقق تھے۔آپکے تحقیقی وتنقیدی مضامین اردو رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھے۔

مولانا محمد فاروق قرآنی (م ۱۹۹۴ء)

قصبہ نولی کے رہنے والے تھے۔مدرسہ دینیہ کے ابنائے قدیم میں ممتاز تھے۔ دارالعلوم دیوبند سے فاضل تھے۔شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ شاہ عبیداللہ سندھی کے تربیت یافتہ تھے۔''سیرت'' کے نام سے ایک ماہنامہ بنارس سے نکالتے تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔

مولانا ابوالحسن حیدری الحسینی غوث پوری ندوی (م ۱۴۰۲ھ)

مولانا شمشاد اور حکیم جمیل الدین نگینوی سے عربی کی تعلیم حاصل کرکے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور وہیں سے تکمیل کی،اس کے بعد سی۔اے۔ وی کالج الہ آباد میں استاد مقرر ہوئے۔اردو کے ادیب وشاعر تھے۔درس وتدریس اور تصنیف وتالیف کے ذریعہ اردو زبان وادب کی وسیع خدمات انجام دیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔

مولانا سید محمد متین ہاشمی غازی پوری (م ۱۹۹۲ء)

مدرسہ دینیہ کے غازی پور کے ابن قدیم، دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور اردو

کے ادیب شہیر تھے۔ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور کے ریسرچ سیل کے ڈائرکٹر، اور اسی ادارہ کے رسالہ ''منہاج'' کے مدیر بھی تھے۔ مذکورہ لائبریری اور اس کے ریسرچ کے کلیدی عہدوں پر مامور بیشتر افراد انہیں کے شاگرد ہیں۔

ہاشمی صاحب مرحوم اعلیٰ درجہ کے مقرر و خطیب تھے۔ انہوں بہت سی عربی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ طرز تحریر میں دبستان شبلی سے تعلق رکھتے تھے، جس کی نمائندگی مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے کی ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، تصوف، سیاست، معیشت، قانون اور تعلیم غرض کہ ہر طرح کے موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان عنوانات پر انکی اٹھارہ تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا سید احمد ہاشمی (م ۲۰۰۱ء)

مدرسہ دینیہ غازی پور کے ممتاز ابنائے قدیم میں تھے، ملک کے مشہور عالم دین اور بے مثل خطیب و مقرر تھے۔ کلکتہ سے ارمغان اور کندن نام کے دو ہفت روزہ اخبارات نکالے جن کے مدیر تھے۔ تقریر و تحریر میں مولانا آزاد کا رنگ غالب تھا۔ ان کی تقریریں ایوان بالا (راجیہ سبھا) میں ہلچل پیدا کر دیتی تھیں۔ ان کی پارلیمانی تقریریں اردو میں ہوا کرتی تھیں اور ذوق و شوق سے سنی جاتی تھیں، پارلیمنٹ کے مباحث کی کتابوں میں ان کی تقریریں اردو رسم الخط میں چھپی ہوئی موجود ہیں۔

انہوں نے اخبار الجمعیۃ کی جنرل منیجری کے زمانے میں مولانا فارقلیط کی غیر موجودگی میں الجمعیۃ کے اداریئے بھی لکھے تھے جن کو دیکھ کر اہل نظر نے کہا تھا اب

الجمعیۃ کے لئے ایڈیٹر کی تلاش نہیں کرنی پڑیگی۔ ارمغان میں ان کا ایک مضمون پڑھ کر شاہ قمر الحسن نے کہا ''یہ تحریر تو ابوالکلام کی ہے'' افسوس کہ ملی مسائل اور سیاسی مشاغل نے ان کو مہلت نہ دی ورنہ تصنیف وتالیف کے میدان میں وہ گوئے سبقت لے جاتے اور بہتوں کو پیچھے چھوڑ دیتے۔ ان کی دو تالیفات ہیں۔ ''مشرق وسطی کا دوسرا محاذ'' اور ''نقاب اٹھ جانے کے بعد''۔

پروفیسر ریاض الدین احمد (م ۲۰۰۱ء)

مشہور معلم، ماہر تعلیم اور اہل قل، ریاض الدین احمد صاحب غازی پور کے موضع کٹیلا کے رہنے والے تھے۔ ماہنامہ معارف اور سہ روزہ دعوت میں آپ کے مضامین چھپا کرتے تھے۔ آپ نے تعلیم کے موضوع سے متعلق بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اردو تعلیم کی راہ میں آنیوالی رکاوٹوں کو دور کرنے اور ارباب اقتدار کا تعاقب کرنے لگے رہتے تھے۔ بچوں کی دینی تعلیم کے لئے انہوں نے اردو میں ایک ''تیز رفتار کورس'' بھی تیار کیا تھا۔ وہ دینی تعلیمی کونسل کے نائب صدر تھے۔

موجودہ اہل قلم

ذیل میں ہم ان چند اہل قلم ذکر کررہے ہیں جنہوں نے نثر نگاری یا تحقیق وتنقید کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ چونکہ وہ خود بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں اور ان کی تخلیقات بھی موجود ہیں اس لئے تفصیل کے بجائے اجمال سے کام لیا گیا ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندوی۔ (ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ) کثیر التصانیف اور عالم بزرگ۔

پروفیسر علی محسن صدیقی۔ (استاذ کراچی یونیورسٹی) متعدد کتابوں کے مصنف ومترجم۔

مولانا ابوبکر غازی پوری۔ مختلف دینی کتابوں اور رسائل کے مؤلف ومرتب

پروفیسر سید امیر حسن۔ فارسی واردو کے مشہور ادیب اور ایک درجن کتابوں کے مصنف اور اردو اکاڈمی کے اعزاز یافتہ۔

احمد اللہ بزمی انصاری۔ ادیب وشاعر، ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار پھر ۱۹۳۳ء تک دارالترجمہ حیدرآباد سے منسلک رہے۔

پروفیسر شاہ عبدالسلام بحری آبادی۔ (استاد لکھنؤ یونیورسٹی) ادیب ومصنف۔

مولانا خالد فیصل ندوی۔ (استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) مشہور عالم، ادیب، صحافی اور شاعر۔

شہاب الدین انصاری۔ (سابق لائبریرین سنٹرل لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ) لائبریری سائنس پر اردو میں پہلی کتاب ''آئینہ کتاب داری'' کے مرتب۔

شاہد صدیقی۔ (مدیر نئی دنیا) ادیب وصحافی۔

ظہیر غازی پوری۔ ممتاز ادیب ونقاد اور شاعر۔

مضطر تاج پوری۔ مرتب تذکرہ شعرائے غازی پور۔

ڈاکٹر علی شیر خاں۔ مصنف اردو ادب کے ارتقاء میں غازی پور کی خدمات۔

سیف الرحمٰن عباد۔ مشہور افسانہ نگار۔

عبیدالرحمٰن صدیقی۔ مرتب تذکرہ مشائخ غازی پور۔

............اور ناچیز راقم۔ **عزیز الحسن صدیقی**

بھی پانچوں سواروں میں شامل ہے۔ ہر چند کہ اس کو زمرہ ناموران میں شامل ہونے کا شوق نہیں ہے، مگر چونکہ گذشتہ چالیس سالوں میں اس نے اردو کو گلے کا تعویذ بنائے رکھا اور اردو کی دستخطی مہم سے لیکر اردو کانفرنسوں کے انعقاد تک کی ساری کوششوں اور کاوشوں میں مصروف رہا، انجمن ترقی اردو سے بھی وابستہ رہا، تحریکیں چلائیں، اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم جاری کرائی۔ اردو میں کئی سو مضامین اور متعدد کتابیں لکھ ڈالیں۔ غازی پور کی تاریخ اور مشاہیر غازی پور کا مستند اور محققانہ تذکرہ لکھا اس لئے خادمان ومحبان اردو کی صف میں اگر اس کو بھی تھوڑی سی جگہ مل جائے تو ''کلاہ گوشۂ دہقاں بہ آفتاب رسید'' کا مصداق ہوگا۔

شعرائے غازی پور

شعراء کی فہرست خاصی طویل ہے۔ سب جانتے ہیں کہ غازی پور میں ماضی میں بھی کثیر تعداد میں شعراء رہے ہیں اور اس وقت بھی ہیں۔ ان میں سے بعض استاذ کی حیثیت رکھتے ہیں مگر صاحب دیوان بہت کم ہیں۔ پرانے اساتذہ کا مجموعہ کلام ان کے ورثاء، جانشینوں اور شاگردوں کی غفلت کی نذر ہو گیا۔ ہم اس مختصر مضمون میں کسی کا ذکر کریں اور کس کو چھوڑ دیں؟ اگر کوئی نام اس فہرست میں نہ آسکا تو شکایت ہوگی

اس لئے ہم ماضی و حال کے تمام شعرائے کرام کو سلام کرر ہے ہیں اور ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں جنہوں نے اردو کے قافلے کو آگے بڑھایا۔

صاحب دیوان شعراء

آسی۔ (م ۱۹۱۷ء) چار مجموعہائے کلام دیوان آسی، عین المعارف، ایمان سخن، فرمودہ آسی مطبوعہ ہیں۔

نادر علی برتر۔ (شاگرد ظہیر دہلوی): دیوان نایاب ہے۔

شمشاد۔ (م ۱۹۰۰ء) تین مجموعہ کلام: خزینۂ شمشاد، خزینۂ خیال اور نظم گہر سنج چھپ چکے ہیں۔

مولوی صدرالدین کیفی۔ (سن وفات: ۱۹۰۰ء سے ۱۹۵۵ء کے درمیان) ہنر غازی پوری سے تلمذ رکھتے تھے۔ استاذ الشعراء تھے۔ افسوس کہ کسی تذکرہ نگار نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔

ہنر غازی پوری۔ (۱۹۲۱ء) استاذ الشعراء تھے افسوس سومیشور ناتھ مفلس نے ان کا دیوان (جو انکی امانت میں تھا) چھپوایا، نہ کسی کو دیا اور وہ ضائع ہو گیا۔

قیس زنگی پوری۔ (م ۱۹۷۰ء) استاذ الشعراء تھے۔ صرف قصائد کا ایک مجموعہ یادگار ہے۔

مولوی وحید اللہ احراری۔ (م ۱۹۷۸ء) آپ کا تخلص صاحب تھا۔ سرولی (پہتیا) کے رہنے والے تھے، نصبی تعلق خواجہ عبید اللہ احرار سے تھا۔ کیفی غازی پوری

کے شاگرد تھے، اکبر کے رنگ میں اشعار کہتے تھے۔ مجموعہ کلام ضائع ہوگیا۔

خاموش غازی پوری۔ (م ۱۹۸۱ء) غزل کے اچھے شاعر تھے اور خوش گلو بھی تھے۔ آپ کا دیوان چھپ چکا ہے۔

جمیل مظہری۔ (م ۱۹۸۵ء) تین مجموعہائے: کلام نقش جمیل، فکر جمیل اور عرفان جمیل چھپ چکے ہیں۔

موجودہ دور کے شعراء

موجودہ کے شعراء میں کلیم، عزیز رئیس شہیدی اور ڈاکٹر کلیم قیصر معتبر شعراء کی حیثیت سے غازی پور کا نام روشن کئے ہوئے ہیں۔ کلیم قیصر اگر چہ بلرامپوری ہیں، مگر غازی پور کو تقریباً وطن ثانی بنا چکے ہیں اور یہیں رہ کر اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔

اردو صحافت

غازی پور میں اردو صحافت کی بنیاد سرسید احمد خاں کی کاوشوں کی رہین منت کہی جاسکتی ہے کیونکہ ان کی تحریک کے مؤیدین اور ان کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی کے ممبران میں ممتاز حیثیت رکھنے سید پور (غازی پور) کے ایک علم دوست بابو شیو پرشاد نے ''تہذیب الاخلاق'' کے طرز پر سید پور سے '' آئینۂ تہذیب'' نام کا ایک اخبار جاری کیا تھا جو یقیناً غازی پور سے نکلنے والا اردو کا پہلا اخبار تھا۔ یہ اخبار ''تہذیب الاخلاق'' کے علیگڑھ سے اجرا کے بعد نکلا۔ آئینۂ تہذیب کا پہلا شمارہ ۱۰ ؍ستمبر ۱۸۸۲ء کو صبح بنارس پریس سے شائع ہوا۔ اس اخبار او[ر پر]یس کے سرپرست بابو شیو پرشاد تھے۔

اخبار کی ادارت منشی محمد یاسین شفق کے سپرد تھی۔اس اخبار کا سائز ۱۹×۲۱/۱۲ تھا اس میں کبھی دس اور کبھی آٹھ صفحات ہوا کرتے تھے پہلے صفحہ پر اخبار کے قواعد ہوتے تھے اور آخری صفحہ پر اشتہارات۔

اس اخبار میں موسم کے حال سے لیکر سیاسی نشیب و فراز تک کا ذکر رہتا تھا۔ خبروں کے لئے چار مستقل عنوانات ، لوکل، مختلف واقعات، تار برقی اور خلاصہ گورنمنٹ گزٹ تھے، اس اخبار کے نمائندے اور نامہ نگار بھی تھے۔بعض مشہور اخبارات سے بھی خبریں اخذ کی جاتی تھیں۔ [۱]

آئینۂ تہذیب کے بعد

عرصے تک کوئی اخبار غازی پور سے نہیں نکلا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۶ء تک چار ہفت روزہ اخبارات کے اجرا کا ریکارڈ ملتا ہے۔

۱۔ **ہفت روزہ انیس ہند** ۵۰۔۱۹۳۵ء کے دوران مطبع انجم پریس مدیر ذاکر حسین انجم

۲۔ **ہفت روزہ عارف** ۱۹۴۱ء میں اجرا، مطبع غوثیہ پریس۔مدیر منشی عبدالحمید عارف

۳۔ **ہفت روزہ پریم** ۱۹۴۲ء میں اجراء۔ مطبع غوثیہ پریس۔مدیر منشی عبدالحمید عارف

۴۔ **ہفت روزہ خدمت** ۱۹۴۲ء میں اجراء۔ مطبع ہندوستانی پریس۔مدیر وحید اللہ احراری۔نائب مدیر مولانا اسماعیل ذبیح

رسائل

۱۔ **ماہنامہ آسی**۔ (سن اجراء ۱۹۳۴ء) مدیر سید نظیر ہاشمی

---

(۱) مشائخ غازی پور؟ ص/۱۸۰: عبیدالرحمٰن صدیقی

۲۔ حکیم محمد یوسف کا ماہنامہ۔ جس کا نام اورسن اشاعت نہ معلوم ہوسکا۔ مگر اس کا تذکرہ زبانوں پر ہے۔

۳۔ مدرسہ دینیہ غازی پور کے مندرجہ ذیل موقت اور غیر موقت رسائل

☆ ماہنامہ دینیات اجراء ۱۹۵۸ء

☆ سالانہ میگزین دین ودعوت۔ اجراء ۱۹۷۸ء

☆ غیر موقت المنهاج ۔اجراء ۱۹۸۷ء

۴۔ مدرسہ دینیہ کی مجلس صیانة المسلمین کی طرف سے غیر موقت مجلہٗ تذکیر ۱۹۹۱ء سے شائع ہورہا ہے۔ مرتب عزیز الحسن صدیقی

۵۔ چند سالوں سے مکتبہٗ اثریہ کے زیر اہتمام مجلّہ زمزم شائع ہورہا ہے۔ جس کے مدیر مولانا ابوبکر غازی پوری ہیں۔

موجودہ عہد کا مشہور وممتاز علمی، دینی، اصلاحی، ادبی، اشاعتی مرکز

﴿ادارہ دینیہ﴾

۱۳۵۰ھ میں غازی پور کی سرزمین پر (جس کے بارے میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا قول ہے کہ یہاں ''دماغ پایا جاتا ہے'') ایک ادارہ ''ادارہ دینیہ'' کے نام سے قائم ہوا، جس کے ماتحت مدرسۂ دینیہ کے نام سے ایک دینی تعلیمی مرکز وجود میں آیا اور مختلف دینی واصلاحی اور رفاہی شعبے بھی قائم ہوتے چلے گئے۔ اس ادارے کے اصل محرک اور اصولی طور پر بنیاد رکھنے والے تو مولانا حکیم جمیل الدین

نگینویؒ تھے، جو اس شہر کے علمی انحطاط کے دور میں یہاں وارد ہوئے تھے، مگر عملی طور پر اس کی بنیاد ان کے شاگرد مولانا عمر فاروقؒ نے رکھی تھی اور انکے شاگرد مولانا ابوالحسنؒ نے اس کو روایتی مدرسہ کے بجائے انقلابی اور تحریکی ادرہ بنا دیا۔ یوں تو یہ ادارہ اصولی اور بنیادی طور پر مدرسہ ہی تھا اور ہے مگر کل بھی اس کا مزاج تحریکی تھا اور آج بھی ہے اور خدمت کا میدان علمی و ادبی بھی ہے۔ فی زمانہ اس کے مرکز اور شاخوں کے ذریعہ جہاں اشاعت علم دین کا کام تحریکی انداز میں ہو رہا ہے وہیں اس کے اشاعتی شعبے ''دینیہ اکاڈمی'' کے ذریعہ دینی و اصلاحی موضوعات پر ہلکا پھلکا لٹریچر بھی تیار ہو رہا ہے۔ اس طرح موجودہ عہد میں اردو زبان و ادب کی جو خدمت اس ادارہ کے ذریعہ انجام پا رہی ہے اس کو بلاشبہ اردو کے حق میں ''آب حیات'' کہا جا سکتا ہے، اس کے خدام اور وابستگان تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی سرگرم ہیں اور ان کی خدمات اردو لٹریچر میں اضافہ کا سبب بن رہی ہیں۔

☆☆☆☆☆
☆☆☆

(حکیم مولانا) عبداللہ مغیثی
(میرٹھ)

اردو زبان وادب کے فروغ میں شمالی یوپی کا حصہ

مختلف زبانوں کے باہمی اختلاط وآمیزش سے اردو زبان کا وجود ظہور میں آیا۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ کھڑی بولی کے اسماء وافعال ضمائر اور گرامر پر زور دیکر اردو زبان کا ڈھانچہ تیار کیا گیا یہ زبان اپنی مقبولیت کی وجہ سے ترقی کرتے کرتے بابر کے دور میں ایک صحیح شکل وصورت اختیار کرتے ہوئے اپنی معنویت وانفرادیت کے ساتھ ہمایوں کے دور میں داخل ہوگئی۔ اورنگ زیب کے زمانے میں اردو کو سب سے زیادہ عروج حاصل ہوا اور اس کا نام باقاعدہ **"اردوئے شاہی"** رکھا گیا۔ مسلم شعراء نے برج بھاشا کی شاعری کو ترک کرکے اسی **"اردوئے شاہی"** کو اپنانا شروع کیا حتیٰ کہ ملک کے عوام وخواص اپنی عام زندگی میں اردو زبان کو بولنے لگے اور اردو زبان کا اثر ملک کے اطراف واکناف بالخصوص جنوبی ہندوستان میں اس تیزی سے پھیلنا شروع ہوا کہ

شمالی ہندوستان بھی اردو کی ترویج وترقی میں پیچھے رہ گیا۔ پھر دکن والوں نے اس زبان کو اپنے یہاں کی دیگر بولیوں میں شامل کر کے دکنی اردو کا نیا باب کھول دیا، وہاں کے عوام وخواص اس زبان سے خوب سے خوب تر دلچسپی لینے لگے جب کہ بزرگان دین کی مدد سے اس زبان کو خاص طور پر فروغ ہوا، انہوں نے اپنے خیالات کی اشاعت اور مذہب کی تبلیغ اس نئی زبان میں شروع کی جس سے اردو زبان و ادب کو بہت مقبولیت اور سہارا مل گیا۔

مسلم حکمرانوں کے عہد میں پروان چڑھنے کی بنا پر مسلمانوں میں یہ زبان زیادہ رائج ہوئی کیونکہ اس میں اسلامی ثقافت کا لٹریچر موجود ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ثقافت کا بھی عظیم سرمایہ ہے، اس ثقافت میں اگلوں کے حالات و رجحانات خصوصیت اور اقدار سب کچھ موجود ہے اسی لئے وہ غیر مسلم حضرات کی نظروں مین ایک سلبی اور غیر ترجیحی زبان قرار پائی جب کہ اردو زبان ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت اور راس کی رنگارنگ تہذیبوں کا حسین سنگم ہے حالانکہ اس کے آبیاری میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کا حصہ ہے، اس طرح اردو، مختلف زبانوں کے حسین الفاظ کا ایک گلدستہ بن گئی یہ محض کسی ایک محدود ثقافت وقومیت اور کسی ایک قدیمی زبان کی نوزائدہ نہیں بلکہ وہ متنوع صفات کے حامل ملک کے لئے جتنی موزوں اور نمائندہ زبان ہے دوسری کوئی نہیں۔

اردو زبان وادب اگرچہ ہندوستان کی گنگا جمنی فضاؤں میں منصۂ شہود پر آ لیکن علماء، ادباء اور شعراء کی علمی وادبی کاوشوں نے اردو کو علمی و بین الاقوامی زبان کا،

پلہ بنادیا آج اسکے رخ زیبا کی چمک دمک کو ماند کرنے اور اسکے روشن چہرے کی ضیا کو دھندلانے کے لئے جتنی منفی سازشیں رچی جائیں اور عملی کارروائیاں روبعمل لائی جائیں تب بھی اس کی عالم گیری سطوت وشہرت، نزاکت ولطافت، نشیب وفراز، ترقی وعروج، مدوجزر اور اسکے ذوق ومذاق کو کوئی چھین نہیں سکتا اس نے ملک کے گیسوئے برہم کو سنوارا ہے اس نے انقلاب زندہ باد کا نعرہ دیا ہے ملک کی آزادی میں اسکی ناقابل انکار قربانیاں ہیں اس نے فرقہ پرستی کی بیخ کنی کی ہے اس نے اتحاد و یک جہتی جمہوریت اور بھائی چارہ کو فروغ دیا ہے۔

اسی لئے خیر القرون سے آج تک تمام مؤرخین، مصنفین اور تمام علماء وادباء اور شعراء نے اردو کی ترویج وترقی میں بھرپور حصہ لیا جس کے لئے لاکھوں نثری مؤلفات، مضامین ومقالہ جات اور شعری مجموعات لکھے گئے جہاں عالمی اور ملکی سطح پر اردو زبان و ادب کے لئے قربانیاں دی گئیں وہیں اردو زبان کی گرانمایہ قربانیوں اور اسکی ترویج و ترقی میں شمالی یوپی کا بھی عظیم حصہ ہے، جس میں علماء، صلحاء، ادباء اور شعراء کی تصنیفی، اصلاحی، ادبی اور صحافتی خدمات شامل ہیں جس میں شعروشاعری کا بجا طور پر کلیدی کردار ہے البتہ شاعری میں الفاظ کی ترتیب اس کا حسن وبانکپن ہی سب کچھ نہیں جب تک اس میں خیالات کی ندرت اثر پذیر نہ ہو خصوصا غزل گوئی انفرادی جذبات و احساسات، آفاقی کیفیات، اجتماعی پہلوؤں کی تخصیص، زندگی کے نشیب وفراز، عشق و محبت، ہجر وفراق کی داستانیں، شعوری اور غیر شعوری طور پر شاعر زمانہ کے حالات و واقعات سے متعلق مثبت ومنفی پہلوؤں کا اظہار کرتا ہے گویا شاعری روح عصر میں حسن

و جمال کی آسودگی اور نشاط و تسلین کو تلاش کرتی ہے۔ تحقیق اور اسکی معنویت سے گہری وابستگی کے ساتھ خود خواہشات انسانی کی تکمیل کرتی ہے۔

کوئی بزم ہو کوئی انجمن یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی وہاں ایک چراغ جلادیا

یہ حقیقت ہے کہ شاعری خصوصاً غزل گوئی ہر دور میں جذباتی تقاضوں کی آبیاری کرتی رہی ہے اس نے ہر موضوع کو پیش کرنے کی سعی و کوشش کی ہے یعنی فلسفۂ حسن و عشق یا فلسفۂ حیات سبھی کچھ اس کے دائرۂ عمل میں آجاتا ہے۔ زبان و بیان میں شاعر کی شخصیت کا دخل ہوتا ہے جب کہ شخصیت کی رنگارنگی، تنوع فن اور فنکاری پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے فن کی دودھیا چاندنی سامعین کو ایسا مسخر کر لیتی ہے جس سے انسان کو اضطراب کے بجائے کمال فن کے ادراک کی فرحت اور طربناک احساس کی لذت حاصل ہونے لگتی ہے گویا شعراء جام نہیں چھلکاتے بلکہ شیشوں کو پتھر سے ٹکرانے کی بھرپور جسارت کرتے ہیں۔

مولوی اسماعیل میرٹھی ہندوستان کے ان شعراء و ادباء میں ہیں جن کا سینہ ملت کے درد میں داغ داغ مگر ہاتھ میں الفت و محبت کا چراغ ہے۔ آپ کی شخصیت علمی و ادبی حلقوں میں خوب پہچانی جاتی ہے انہوں نے دیگر شعراء کے مزاج و ذوق اور انداز سے الگ ہٹ کر اپنے تخلیقی عمل سے اردو ادب کو نیا موڑ دیا ہے، انہوں نے فراموش کردہ لب و لہجہ کو شعر و سخن کے ڈھانچہ میں ڈھالا اسی وجہ سے اپنے منفرد طرز بیان اور

شعر گوئی میں رنگ و آہنگ کی وجہ سے آپ کے اشعار ممتاز رہتے ہیں اسی واسطے شاعری کے روایتی اسلوب کے علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ عصر حاضر میں ایک قدیم لہجہ کے امین بھی ہیں۔ آپکے اشعار میں رچاؤ ہے، ارتعاش ہے، نالۂ غم گداز ہے اسی خلوص و صداقت میں ان کی شاعری کی تاثیر اور تسخیر کا راز چھپا ہوا ہے انہوں نے جہل و نادانی کی بیخ کنی کرتے ہوئے علم کی برتری کو اس طرح بیان کیا ہے ۔

گیا دورہ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری
جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عمل داری
جنہیں دنیا میں رہنا ہے رہے معلوم یہ ان کو
کہ ہیں اب جہل و نادانی کے معنی ذلت و خواری
ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن و صناعت میں
نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجاری نہ معماری
جہاں تک دیکھئے تعلیم کی فرمانروائی ہے
جو سچ پوچھو تو نیچے علم ہے اوپر خدائی ہے
گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انسان کا زیور
ہوئی ہے زندگی خود منحصر اب علم و دانش پر
کوئی بے علم روٹی سیر ہوکر کھا نہیں سکتا
نہ زرگر نہ آہنگر نہ بازیگر نہ سوداگر

زمانہ نام ہے میرا تو میں سب کو دکھادونگا
کہ جو تعلیم سے بھاگیں گے نام انکا مٹادونگا

مولوی اسماعیل کا سب سے بڑا کارنامہ انکی وہ اردو ریڈریں ہیں جو بچوں کے لئے انہوں نے لکھی ہیں یہ کتابیں کچھ ایسے انداز اور مزاج شناسی کے ساتھ لکھی گئی ہیں کہ اردو دنیا کی تعلیم گاہوں میں باقاعدہ وہ کتابیں درس میں داخل ہوگئیں اگر ان پانچوں کتابوں کو کوئی شخص توجہ کے ساتھ پڑھ لیتا ہے تو اس کو اچھی خاصی اردو آجاتی ہے۔انہی کتابوں کی بدولت وہ اردو دنیا میں شاعر کے حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔آپکی قومی نظموں کا رجحان زیادہ تر اصلاحی ہے اتفاق واتحاد کی تعلیم کے ساتھ کام کرنے کی تلقین زیادہ ہے جب کہ عاشقانہ وصوفیانہ مضامین کا بھی خاصہ ذخیرہ ہے۔کبھی کبھی وہ عہد ماضی کا عروج اور عہد حاضر کی پستی کا موازنہ کر کے عبرت دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔غزلوں میں زیادہ تر تصوف کے مسائل نظم کرتے ہیں جب کہ عشقیہ مضامین بھی پرزور انداز سے بیان کرتے ہیں،لب ولہجہ کے لحاظ سے غزلیات میں غالب کا رنگ نمایاں ہوتا ہے جب کہ اردو ادبیت ومعنویت پر انکی گہری نظر ہے۔وہ کہتے ہیں۔

وہی کارواں وہی قافلہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی منزلیں وہی مرحلہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی شکر ہے جو سپاس ہے وہ ملول ہے جو اداس ہے
جسے شکوہ کہتے ہو ہے گلا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہی نقص ہے وہی کھوٹ ہے وہی ضرب ہے وہی چوٹ ہے
وہی سود ہے وہی فائدہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی ہے ندی وہی نہر ہے وہی موج ہے وہی لہر ہے
یہ حباب ہے وہی بلبلہ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی خوار ہے جو ذلیل ہے وہی دوست ہے جو خلیل ہے
بد و نیک کیا ہے برا بھلا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

اردو ادب و شاعری اتنا حسین ولطیف اور نازک باب ہے کہ مشائخ نے بھی اسے گلے سے لگالیا اور اپنے ذوق کے مطابق حمد ونعت، نظم وقصیدے اور ترانوں سے مافی الضمیر کو ادا کر کے اس فن کو عزت بخشی۔ سرخیل کارواں مولانا محمد قاسم نانوتوی کی جہاں دیگر زبانوں میں تصانیف کا قیمتی ذخیرہ موجود ہے وہیں اردو زبان میں قابل قدر تحریرات موجود ہیں۔ آب حیات، تقریر دل پذیر، قبلہ نما اور حجۃ الاسلام وغیرہ اردو زبان وادب کے عظیم شاہکار ہیں۔ اردو شاعری سے بھی آپ کو بہت دلچسپی تھی بلکہ اس وقت اچھے اچھے شاعر بھی آپ کے شناور نہیں ہو سکے اگر ایک طرف مزاج شاعرانہ ونوائے عاشقانہ رکھتے ہیں تو دوسری طرف میر حلقۂ تجدید و اصلاح وتبلیغ بھی رکھتے ہیں۔ آپ کی شاعری میں احساس جمال مکمل طور پر موجود ہے، رندی اور سرمستی کہیں نہیں ملتی البتہ زیادہ غالب رنگ نعت شریف کا تھا۔ ایک مرتبہ بارگاہ نبوی میں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید ہے یہ
کہ ہو سگان مدینہ میں میرا نام شمار

کرے ہے ذرہ کوئے محمدی سے خجل
فلک کی شمس و قمر کو زمین لیل ونہار
فلک پہ سب سہی پر ہے نہ ثانی احمد
زمین پہ کچھ نہ ہو پر ہے محمدی سرکار
جو جبریل مدد کو ہو فکر کی میرے
تو بڑھ کے کہوں اے جہان کے سردار
تو فخر کون ومکاں زبدہ زمین وزماں
امیر لشکر پیغمبراں شہ ابرار
تو بوئے گل ہے اگر مثل گل ہیں اور نبی
تو نور شمس ہے گر انبیاء ہیں شمس نہار

ہندوستان کی سرزمین پر اردو ادب کی جو معیاری خدمات انجام دی گئیں ہیں وہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے۔ حفیظ میرٹھی بھی ملک کے ایسے ممتاز شاعر ہیں جنہوں نے اردو شاعری کے ذریعہ اردو زبان کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے، شاعری کے ذریعہ اپنی آفاقی شخصیت بنائی ان کی شخصیت کے تانے بانے مضبوط اور توانا رشتوں سے بندھے ہیں ان کی شاعری میں اعتقاد کی پختگی وایمان کی درستگی کے ساتھ قومی وملی درد کا زیادہ اظہار ہے، وطن سے محبت کے ساتھ اپنی قوم کو حوصلہ بھی دیا ہے جب کہ ملی غیرت اور خودداری کا اظہار بھی کیا ہے، آپ نے کہا۔

اندھیروں سے ڈرے کیوں دل ہمارا
بہت روشن ہے مستقبل ہمارا

شہید جستجو ہوکر تو دیکھے
پتہ پوچھے گی خود منزل ہمارا
نہ دیکھیں گے چمن برباد ہوتے
کہ اس میں خون ہے شامل ہمارا
ضروری ہے کفن بردوش رہنا
وطن ہے کوچہ قاتل ہمارا
ادھر طوفان سے ہم دست وگریباں
ادھر ہے منتظر ساحل ہمارا
کہیں زخمی ہیں ہم تیغ ستم کے
کہیں قاتل ہے خود بسمل ہمارا

دراصل انکی شاعری میں جو وقار و جامعیت اور تمکنت پائی جاتی ہے وہ ان کی ذاتی صلاحیتوں کا اظہار و اعلان ہے جو ایک فن کار کا امتیاز و افتخار ہوتا ہے انہوں نے اپنی شاعری میں جس طرز سخن کو اختیار کیا ہے وہ اس بات کی نمائندگی وغمازی کرتا ہے کہ حفیظ صاحب قدیم روایات کے امین، اقدار کے پاسدار اور زمانہ کے سرد گرم سے واقف غم جاناں اور غم دوراں کے کتنے زاویوں کو آپ نے وضع کیا۔ داخلی اپنائیت اور خارجی صداقت کو دل و دماغ میں بسا کر ماضی کے واقعات کو تاریخی بنادیا۔ آپ کی غزل گوئی کی شہنشاہیت کی یہ غرض یاد دلاتی ہے آپ نے کہا۔

چاہے تن من سب جل جائے سوز دروں پر آنچ نہ آئے
شیشہ ٹوٹے غل مچ جائے دل ٹوٹے آواز نہ آئے

ہائے وہ نغمہ جس کا مغنی گاتا جائے روتا جائے
جس کو کہنی دل کی کہانی سر تا پا دھڑکن بن جائے
عزت دولت آنی جانی مل مل جائے چھن چھن جائے
دنیا کا اپنانا ہی کیا کانٹے اپنے پھول پرائے
کاش ہمارا فرض محبت ایسی محبت پرچھا جائے
میخانہ کی سمت نہ دیکھو جانے کون نظر آ جائے

ان کی غزلوں میں بھرپور لذت، بھرپور جدت، انداز بیاں میں قدامت، لب و لہجہ میں اختصاص، اسلوب تعمیر و تشکیل میں انفرادیت، فرقہ پرستی اور ملک دشمن عناصر سے سخت نفرت کے ساتھ ملی معاشرہ کی اصلاح کے لئے ملک کے باشعور طبقہ سے تخاطب بھی ہے آپ نے کہا۔

دل فروشوں کیلئے کوچہ و بازار بنے
اور جانبازوں کی خاطر رسن و دار بنے
بس یہی دوڑ ہے اس دور کے انسانوں کی
تیر ی دیوار سے اونچی مری دیوار بنے
غیر سے چھین کے اپنوں نے مجھے قتل کیا
آپ ہی ڈھال بنے آپ ہی تلوار بنے
ہوگئے لوگ اپاہج یہی کہتے کہتے
ابھی چلتے ہیں ذرا راہ تو ہموار بنے

مجھکو ممنون کرم کرکے وہ فرماتے ہیں
آدمی سوچ سمجھ کر ذرا خود دار بنے
خود شناسی کے نہ ہونے سے یہی ہوتا ہے
جنکو فنکار نہ بنا تھاوہ فنکار بنے

اردو صحافت وادب کے بام عروج پر کمند ڈالنے والے ڈپٹی نذیر احمد کا نام ملک میں بہت مشہور ہے جو ہندوستان میں اردو ادب کے سب سے پہلے ''ناول'' نویس ہیں تعزیرات ہند کے اردو ترجمہ میں ان کا بڑا حصہ ہے جب کہ علم ہیئت کی ایک مشہور کتاب کا بھی ترجمہ کیا۔ ۱۸۹۸ء میں انکی علمی لیاقت اور صحافت کے باعث ان کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا اردو ادب میں انکی تصانیف کا وقیع ذخیرہ موجود ہے۔

اسی طرح مولانا شوکت علی تھانوی اردو ادب کے بلند پایہ مزاح نگار انسان گذرے ہیں جن کے ملک کے معیاری اخبارات میں مضامین چھپتے رہے ہیں۔ اردو شاعری میں غزلوں کا ایک مجموعہ گہرستان شائع کر کے انہوں نے خود کو شاعر کی حیثیت سے پیش کیا اردو دنیا میں انکی شہرت ومقبولیت ان کی مزاح نگاری وتبسمات کی رہین منت ہے جب کہ سودیشی ریل ان کی شہرت کا سنگ بنیاد ہے پانچ کتابیں ''موج تبسم''، ''بحر تبسم''، ''سیلاب تبسم''، ''طوفان تبسم'' اور ''شیش محل'' اردو زبان و ادب میں ایک وقیع مجموعہ ہے جو اپنی جگہ خود شگفتگی اور تبسم کے دعویدار ہیں۔

شمالی یوپی یا ہندوستان بلکہ عالمی سطح کی شہرت یافتہ شخصیت جگر مرادآبادی اردو

شاعری میں ایک مسلم مقام رکھتے ہیں اپنی غزلیات نظم ونثر اور قصائد کے ذریعہ اردو زبان کو بہت فروغ دیا ان کے اردو ادب کا دائرہ دنیاوی حسن وعشق کے واقعات تک ہی محدود نہیں بلکہ حقائق ومعارف کو بھی نہایت کیف آور معنی طریقہ سے بیان کر کے کلام کی تاثیر کو بڑھا دیتے ہیں جب کہ آپ کے کلام میں کیف ووارفتگی اور بے خودی کی لہر قریب قریب ہر جگہ نظر آتی ہے جو کلام میں امتیازی شان اور شاعر کے انہماک ذوق و جوش فکر کا پتہ دیتی ہے۔

جگرؔ کی شاعری میں اردو ادب کی چاشنی کے ساتھ نئے تخیلات وافکار کی جھلک نظر آتی ہے، ''شعلۂ طور'' اور ''داغ جگر'' آپ کی اردو ادب کے عظیم شاہکار ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جب اردو غزل گو شاعر کا دل جام جم کے بجائے جام غم بن جاتا ہے تو اسکی شاعری میں میرؔ کا رنگ آنا شروع ہو جاتا ہے اسکی مسحور کن نغمگی دل کو گرویدہ بنانے لگتی ہے، اس کا سحر نگار قلم صحیفۂ تغزل پر نقوش آبدار بنانے لگتا ہے غزل کی زبان غنچہ وگل اور نغمۂ بلبل کی زبان ہو جاتی ہے اسے اسی اسلوب میں اپنا درد بیان کرنا ہو تو غزل کا پیرایہ اظہار نظم کی طرح وسیع نہیں ہوتا اس لئے بہت سے شعراء نے جب غم زمانہ کی روداد لکھنے کا ارادہ کیا تو غزل کے معرض اظہار کو محدود پا کر اس سے روگرداں ہو گئے، جگر مرادابادی خاص غزل کے شاعر ہیں لیکن ملک میں جب فسادات کے آتش فشاں پھوٹ پڑے تو انہوں نے غزل کو چھوڑ کر نظم کا لہجہ اختیار کیا پھر صاف صاف کہا۔

فکر جمیل خواب پریشان ہے آج کل
شاعر ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

آنکھیں تمام مشہد عشق و جمال ہیں
سینہ تمام گنج شہیداں ہے آج کل

جگر کی شاعری میں جہاں ذوق سخن کا جھکاؤ اور رنگ تغزل میں انفرادیت پائی جاتی ہے وہیں اپنے زبان و بیان اسلوب میں نازک آبگینوں کے پگھلنے، نرم پھپھولوں کے پھوٹنے اور زخموں کے رسنے کی سرسراہٹ محسوس ہونے کے ساتھ احساسات امید و یاس اور بے پناہ غم و الم بھی محسوس ہوتے ہیں وہ نعت و منقبت کے نازک میدان میں بھی پیچھے نہیں رہے اور بارگاہ نبوی میں ہدیہ نعت اس طرح پیش کیا۔

اک رند ہے اور مدحت سلطان مدینہ
ہاں کوئی نظر رحمت سلطان مدینہ
تو صبح ازل آئینہ حسن ازل بھی
اے صل علی صورت سلطان مدینہ
اے خاک مدینہ تری گلیوں کے تصدق
تو خلد ہے تو جنت سلطان مدینہ
کونین کا غم یاد خدا درد شفاعت
دولت ہے یہی دولت سلطان مدینہ
اس امت عاصی سے نہ منھ پھیر خدایا
نازک ہے بہت غیرت سلطان مدینہ
اے جان بلب آمدہ ہوشیار خبردار
وہ سامنے ہیں حضرت سلطان مدینہ

کچھ اور نہیں کام جگر تم کو کسی سے
کافی ہے بس اک نسبت سلطان مدینہ

اور یہ حقیقت ہے کہ اردو ادب کیلئے اکابر کی بنیادی قربانیاں ہیں جنہوں نے اپنی اردو تصانیف کے ذریعہ اردو زبان کو اعلیٰ مقام عطا کیا چنانچہ حضرت شیخ الہند کی تصانیف اردو زبان و ادب کیلئے عظیم شاہکار ہیں جن میں ترجمہ قرآن پاک اپنی اردو ادبیت کی امتیازی شان الگ ہی رکھتا ہے اور اپنی جامعیت افادیت اور مقبولیت کے اعتبار سے امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمایا تھا کہ اردو زبان میں یہ سب سے اچھا ترجمہ وتفسیر ہے، یہ اردو ترجمہ قدیم و جدید امتزاجی وافادی خوبیوں کے ساتھ اردو زبان وادب اور فکر کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔ "البأساء والضراء وزلزلوا" آیت کریمہ میں "زلزلوا" کا ترجمہ جھڑ جھڑائے گئے فرما کر اردو ادب و صحافت کی ٹکسالی زبان استعمال کر کے موجودہ دور کی ترجمانی فرمائی ہے اور "أسری بعبده لیلا" کا ترجمہ جو لے گیا راتوں رات با محاورہ ترجمہ کر کے اردو ادب کے افق پر قدم رکھ کر اہل علم ودانش کے لئے معیار ادب طے فرمایا ہے۔

حضرت تھانویؒ کا تو بہت بڑا ذخیرہ اردو زبان میں محفوظ ہے جس میں بیان القرآن اور بہشتی زیور آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ بیان القرآن اردو زبان میں ایک علمی سرمایہ ہے جو نہایت محقق مدلل اردو زبان وادب کا ایک وقیع ذخیرہ اور علمی دستاویز کا عظیم مرقع ہے۔ شعر گوئی کا بھی آپکو لطیف ذوق تھا جس میں حمد باری تعالی

اور مناجات کا رنگ غالب تھا خاص طور پر ایام پر جو آپ نے سات منزلیں شعری شکل میں قلمبند کی ہیں وہ آپ کے ذوق ادب کا عظیم شاہکار ہیں۔

اے ہمارے پالنے والے خدا
خوبی دارین ہم کو ہو عطا
کر ہمارا دین و دنیا میں بھلا
اور عذاب نار سے ہم کو بچا
تو وہ داتا ہے کہ دینے کیلئے
در تری رحمت کے ہردم ہیں کھلے
ہے تو ہی حاجت روائے دوجہاں
ہم ترا در چھوڑ کر جائیں کہاں

اسی طرح یہ اور اس جیسے بہت سے اشعار حضرت تھانوی کے یہاں ملتے ہیں۔
بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب تو اردو زبان و ادب کی ایک نہایت معتبر شخصیت ہیں جنہوں نے اسکول کی مدرسی سے ملازمت کی ابتدا کی پھر انجمن ترقی اردو کے سکریٹری منتخب ہوئے بعدہٗ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ ترجمہ میں بحیثیت ناظر کام کیا پھر شعبۂ اردو کے صدر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور آخیر میں پاکستان جا کر انجمن ترقی اردو قائم کی نیز اسکی نشو ونما میں انتھک کوشش کی حتی کہ اردو کالج کی داغ بیل بھی ڈالی اور مرتے دم تک اردو زبان و ادب کی بیش بہا خدمات انجام دیتے رہے مختلف کتابوں پر مقدمات کیلئے جو خامہ فرسائی کی انکی دو جلدیں شائع بھی ہو چکی ہیں جبکہ

انکا مشہور ترین اردو رسالہ علمی حلقوں میں بہت مقبول ہوا اس نے اردو داں طبقہ کی معلومات میں جو علمی وادبی اضافہ کیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔

چند تنقیدات عبدالحق، خطبات عبدالحق اردو داں طبقہ کیلئے ایک بڑا ذخیرہ ہے۔

ملکی اور بین الاقوامی شہرت کی حامل شخصیت مولانا محمد علی جوہر اردو زبان وادب میں اپنے زمانہ کے بہترین انشاء پردازوں میں تھے۔ اردو زبان وادب کے فروغ کیلئے ان کی بہت قربانیاں ہیں، اخبار نویسی، مضامین نگاری اور مقالہ سازی کو انہوں نے کسب معاش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ ان میں بڑودہ کی ملازمت کے دوران ہی قومی وحدت کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا جس کے لئے کلکتہ سے کامریڈ اردو پرچہ جاری کیا۔ دوران ملازمت ان کے قیمتی مضامین ٹائمز آف انڈیا جیسے وقیع اخباروں میں شائع ہوئے پھر آپ نے ایک معیاری رسالہ ہمدرد نکالا یہ سب سے پہلا روزنامہ تھا جو اردو زبان میں ٹائپ ہو کر چھپتا تھا۔ آپ کے اردو زبان میں نہایت قیمتی مضامین دو جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں جو اردو دنیا میں خاص اہمیت کے حامل ہیں اپنے ذوق شاعری کے جذبات بارگاہ الٰہی میں اس طرح پیش کرتے ہیں۔

تجھے تسکین دل پایا تجھے آرام جاں پایا
نہاں بھی ہے تو کیا تجھ کو جہاں ڈھونڈا وہاں پایا
کوئی نامہرباں ہوکر ہمارا کیا بگاڑے گا
کرم تیرا تو ہے ہم پر تجھے جو مہرباں پایا
ترا وہ مبتلاء ناکام سمجھا جس کو دنیا میں
اسی کو سرخرو دیکھا اسی کو کامراں پایا

حرم میں تھا ہر اک کو یوں تو تیرے عشق کا دعوا
جو کی تحقیق تو اکثر وہی عشق بتاں پایا
رہا آوارہ دیر و حرم پہلو سے بیگانہ
دل اسکا عرش و کرسی ہے کہاں ڈھونڈا کہاں پایا
جہاں ایماں ہو واں کیسے گزر ہو یاس و حرماں کا
کسی مومن کو بھی اے دل خدا سے بدگماں پایا
نہیں معلوم کیا ہو حشر جوہر کا پرا تا ہے
کہ ہاں نام محمدؐ مرتے دم ورد زباں پایا

اردو زبان و ادب اور صحافت میں سرزمین دیوبند میں علامہ انور صابریؒ کے بعد دوسرا نام عامر عثمانی کا ہے جنھوں نے اپنی تخلیقی، تنقیدی اور صحافتی صلاحیتوں کا اعتراف کرایا اور تیسرا نام جمیل مہدی کا ہے جنھوں نے اپنی اردو صحافت کا آغاز دیوبند سے کیا اور پھر لکھنؤ میں رہ کر روز نامہ عزائم کے ذریعہ اردو زبان و ادب میں اپنی ذہانت وفطانت کا لوہا منوایا اور چوتھا سید علامہ ازہر شاہ قیصر کا ہے جو اوائل عمری ہی سے اردو صحافت کے دامن گرفتہ ہوئے تو زندگی کے آخری سانس تک اسکی وفاداری سے منھ نہیں موڑا آپ اردو کے معتبر صحافی، شگفتہ قلم ادیب و انشاء پرداز تھے شاعری اور افسانہ نگاری سے بھی شغف رکھتے تھے انکی اردو خدمات پر 'استقلال'، 'صداقت'، 'انور'، 'خالد'، 'ہادی'، 'اجتماع'، 'ترجمان دارالعلوم' وغیرہ مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں اور سیکڑوں رسائل آپکے علمی، قلمی رشتوں کو استوار کرتے ہیں جب کہ ان کی علمی، فکری

۱ نگارشوں، دل کش تحریروں اور علم وقلم سے وابستہ رہ کر ایک بڑا طبقہ متاثر ہوا ہے ان کے قلم نے ہمیشہ کشادہ نظری اور وسیع المشربی سے کام لیا ہے جو عمق اور ٹھہراؤ ان کے مشاہدہ میں تھا وہ بہت کم لکھنے والوں کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔

مشیر جھنجھانوی کی علمی، ادبی شخصیت ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں انکی شاعری میں رنگ تغزل زیادہ ہے گو ملی، قومی نظمیں انہوں نے کہی ہیں انکے مزاج کی سلامت روی مذہبی مزاج کی دین ہے جو مشترکہ تہذیب، مشرقی رواداری اور شرافت کی آئینہ دار ہے۔ انکی شاعری میں نہ فلسفہ طرازی ہے نہ دقت پسندی، نہ تخیل کی بلند پروازی، نہ چیستاں طرازی، وہ مضمون کی بلندی میں تارے بھی نہیں توڑتے بلکہ دل کی بات زبان سے کرتے ہیں سچے جذبات اور واردات قلب کی خوبیاں پیش کرتے ہیں۔ دیگر مضامین کی طرح نعت رسول سے بھی بہت دلچسپی ہے وہ مدحت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں یوں گویا ہوتے ہیں۔

ازل سے ابتداء ہوتی ہے جس دلکش فسانہ کی
حقیقت اس میں مضمر ہے ترے تشریف لانے کی
وہ کلیاں جن کو اذن یک تبسم بھی نہ تھا حاصل
اجازت دی انھیں حضرت نے پیہم مسکرانے کی
نہیں محدود صحرائے عرب تک بارش رحمت
محمد مصطفیٰ نے آبیاری کی زمانے کی
یہ کہہ کہہ کر بہت سے منحرف ایمان لے آئے
کوئی حد بھی تو ہوتی ہے کسی کو آزمانے کی

وہ جب نکلا تو گھر سے پھول برساتا ہوا نکلا
ادائیں پتھروں نے سیکھ لیں دل کو لبھانے کی
مشیر اس خوابِ ہستی کو ذرا تم غور سے دیکھو
حقیقت سے حدیں ملتی ہیں دنیا کے فسانے کی

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی ذات والا صفات سراپا ادب ہی ادب تھی، ان کی زبان ادب کی رعنائیوں سے خوب آراستہ تھی، آپ نے سو سے زیادہ کتابیں تصنیف فرما کر علمی وادبی ذخیرہ میں اضافہ کیا ہے جسکے ہر جملہ سے اردو زبان وادب کی جامعیت ٹپکتی ہے۔ آپ بلند پایہ مصنف وخطیب ہونے کیساتھ قادر الکلام شاعر بھی تھے، جب کبھی شعر کہنے پر آتے تو چار چار سو، پانچ پانچ سو اشعار پر مشتمل نظمیں کہہ ڈالتے، جس پر آپکے شعری مجموعہ **(۱) جنون شباب (۲) عرفان عارف (۳) آنکھوں کی کہانی (۴) ارمغان دار العلوم** مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔

ذوق وادب کی چاشنی کیلئے اصلاح اللسان انجمن میں عربی، فارسی اور اردو کے اشعار سناتے، آپ کے اشعار میں شستگی، شگفتگی، جامعیت، تہذیب وثقافت، درس انسانیت، محبت ومودت کی متاع عظیم، جمالیات مبہم، حسن طرحداری، رعنائی، علامتوں، استعاروں اور تشبیہات کے استعمال کے ساتھ وسعت فکر ونظر، حکمت و سنجیدگی گیرائی، گہرائی اور اظہار معنی کی نزاکتیں بھی موجود ہوتیں تاہم ان کی شعر گوئی میں مدحت رسول کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے عشق رسول سے اپنے جذباتی تعلق کا اس طرح اظہار فرمایا۔

ادا کیوں کر کریں اور کس زباں سے شکر ہم تیرا
کہ تو نے اس نبی کی ہم کو امت میں کیا پیدا
وہ کملی اوڑھنے والا فقیری پر جو نازاں تھا
گدا تھے جسکے کوچہ کے سکندر قیصر و کسریٰ
گدائی جسکے گھر کی بادشاہی سے بھی بہتر تھی
زمیں جس شاہ کے کوچہ کی رشک قصر قیصر تھی
رسل نے امتی ہونیکی جسکے آرزو کی ہو
لقب محبوب دیکر حق نے جس کی آبرو کی ہو
قدم بوسی کی جسکے آسماں نے آرزو کی ہو
بلاکر عرش پر جس سے خدا نے گفتگو کی ہو
وہ شاہ دوجہاں لولاک کی پوشاک تھی جسکی
فقیرایسا کہ ادنی ملک ہفت افلاک تھی جسکی
سرفراز سے چمکا تھا جو خورشید جہاں ہوکر
بتائی راہ جس نے رہنمائے گمرہاں ہوکر
گیا تھا عرش اعظم پر جو حق کا میہماں ہوکر
شرف پایا تھا جس نے انبیاء میں آسماں ہوکر
رہی شیدا چمن پر جس کے فصل بے خزاں برسوں
قدم چوما کیا جسکی زمیں کے آسماں برسوں

یوں تو تمام اکابر کا اردو زبان وادب کے فروغ میں بنیادی کردار ہے مگر اہل قلم حضرات کا اسمیں کلیدی حصہ ہے خصوصا مولانا قاسم، مولانا گنگوہی، شیخ الہند، شیخ الاسلام، حضرت تھانوی، علامہ شبیر عثانی، مفتی عزیز الرحمٰن، مفتی قاری سعید اجراڑوی، شیخ الحدیث مولانا زکریا، مولانا محمد میاں دیو بندی، مولانا بدر عالم میرٹھی، مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، مولانا بدر عالم بلندشہری وغیرہ میدان خطابت وزبان وادب کے بہترین کہنہ مشق سوار ہیں۔

مولانا بدر عالم میرٹھی کا باقاعدہ میرٹھ میں ''خیر المطابع'' نامی پریس موجود تھا، جس سے اردو زبان وادب کی گرانمایہ خدمات انجام دی گئیں اور معیاری تصنیفات و تالیفات اور اردو تراجم کا سلسلہ قائم ہوا اردو زبان میں آپ کی بہت سی معیاری و مستند کتابیں موجود ہیں جو طبقہ علماء میں مراجع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ''تذکرۃ الرشید''، ''تذکرۃ الخلیل'' اور ''اسلام'' آپ کے اردو ادب کے عظیم شاہکار ہیں۔

اسلام حصہ اول صفحہ ۱۲۷ ر پر اپنی اردو زبان وادب کا اظہار اس طرح فرمایا کہ عالمتاب آفتاب اپنا روزآنہ سفر ختم کر چکا اور رات کی سیاہ چادر سطح زمین کے رہنے والوں پر ڈال گیا۔ ایک جگہ فرمایا کہ کہ کفار ٹڈی دل کی طرح آپ کی تلاش میں ادھر ادھر پھیل گئے اور بھڑوں کے مانند چہار طرف دوڑ پڑے تا کہ جس طرح بن پڑے محمدؐ کو گرفتار کریں۔ مولانا محمد میاں دیو بندی نے تو سیاسی، سماجی، مذہبی اور تاریخی تصانیف کے ساتھ اردو ادب کے لئے گرانمایہ ذخیرہ تصنیف فرمایا ہے ''علماء ہند کا شاندار ماضی''، ''علماء حق کے مجاہدانہ کارنامے''، ''سیرت رسول''، ''تاریخ الاسلام''،

''عہد زریں''، ''تحریک شیخ الہند'' وغیرہ آپ کی علمی وادبی معیار کی عظیم شاہکار ہیں۔ اسلامیات کے بنیادی ڈھانچے کی شکل میں اردو زبان وادب کو جلا دینے والے دینی تعلیم کے رسالے آپ ہی کے رشحات قلم کا نتیجہ ہیں یہ رسالے نہ صرف عام مسلمانوں میں مقبول ہوئے بلکہ اسلامی مدارس کے نصاب میں بھی داخل ہیں۔ علماء ہند کا شاندار ماضی (جلد دوم ص ۳۲) میں اردو زبان وادب کی چاشنی کا اظہار اس طرح فرمایا

''اگر اس ہمدردی اور فریاد رسی کا نام جاگیر شاہی ن [illegible]
ہے تو یہ انگڑائی بہت مبارک اور کمیونزم کا فیصلہ کچھ بھی ہو مگر ایشیائی
فطرت تو یہ ہے کہ ایسی انگڑائیوں میں جو بربادی آئے وہ آبادی ہے
اور جو موت آئے وہ سراسر زندگی ہے۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(ص ۱۴۵) پر رقمطراز ہیں کہ جیسے جیسے میرٹھ کے ہنگامے کی خبریں پھیلتی رہیں جذبات کے ہیزم خشک میں بغاوت کے شعلے بھڑکاتی رہیں، اس نے ہر جگہ انگریزوں کو اور بھی زیادہ حواس باختہ بنادیا وہ باغیوں کی سرکوبی کیا کرتے ان کو خود اپنی جانوں کے لالے پڑ گئے اور ہر جگہ نفسی نفسی کا عالم برپا ہوگیا، ہندوستان کی مردم خیز بستی دیوبند کے ادبی وشعری حوالوں سے علامہ انور صابری کا نام بہت معتبر وشہرت کا حامل ہے، جنہوں نے اردو شاعری اور بدیہہ گوئی کے ذریعہ اردو زبان کی بنیادی خدمت، شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ انہوں نے اپنے دور کے سیاسی قائدین کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

دورِ حاضر کے زیاں کار سیاستدانو
نبض ارباب خرد کو بھی ذرا پہچانو
حیرت انگیز نئے وقت کی انگڑائی ہے
اب میسر غم امروز کی تنہائی ہے

جب کہ انہوں نے اپنے خاص انداز میں شیشہ کا پیمانہ، میخانہ اور دیوانہ کی اس طرح بندش کی تھی۔

دوستی نبھ نہ سکی شیشہ کے پیمانہ سے
جب سے ہم لوگ نکالے گئے میخانہ سے
روز آپس میں لڑا کرتے ہیں ارباب خرد
کوئی دیوانہ الجھتا نہیں دیوانہ سے

انہوں نے جہاں سیاسی، سماجی، ملی اور قومی نظمیں کہیں وہیں نعت و منقبت کے میدان میں بھی بہت آگے نظر آتے ہیں۔انہوں نے حضرت شیخ الاسلام کی وفات حسرت آیات پر منقبت و تعزیت کا اظہار اس طرح کیا۔

سُونا سُونا ہے چمن اے باغباں تیرے بغیر
مضمحل کلیاں فسردہ گلستاں تیرے بغیر
تو ہی لے جاتا تھا اس کو منزل مقصود تک
اب کہاں جائے وہ تیرا کارواں تیرے بغیر
سنتے تھے تجھ سے فسانہ قاسم و محمود کا
نا مکمل رہ گئی وہ داستاں تیرے بغیر

علامہ کی آزاد شاعری میں اختصار، جامعیت، نری درد کی آمیزش، بے نیازی، غم ذات کا پرتو، درویشی، قلندری جیسے واضح رنگ نظر آتے ہیں ان کا عشق تصنع و بناوٹ کوروانہیں رکھتا بلکہ ان کا عشق انسانیت کو آگاہی سکھاتا ہے اکابر سے عقیدت ومحبت، خیالات کی بلند حوصلگی، لہجہ وترنم کی انفرادیت، خودآگہی، آفاقی دردمندی یہ تمام عناصر ہیں جو آپکی شخصیت وشاعری کا روشن وتابناک پہلو بنکر ابھرے ہیں جنھوں نے آپ کو ''شاعرملت اور شاعرانقلاب'' کالقب عطا کیا۔

☆☆☆☆☆
☆☆☆

اقبال احمد ندوی
استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

اردو زبان وادب کی ترویج وترقی میں

خطۂ اودھ کا حصہ

جس طرح دنیا کے مختلف خطوں کے رہنے والے انسانوں کا رنگ، ان کی شکل وصورت، طرز معاشرت، بود و باش اور رہن سہن ایک دوسرے سے مختلف ہے، اسی طرح ان کی زبانیں بھی آپس میں مختلف ہیں، جسے اللہ تعالی نے اپنی قدرت کی نشانی بتلایا ہے، ارشاد ربانی ہے: ﴿و من آیاته خلق السماوات و الأرض و اختلاف ألسنتكم و ألوانكم ، إن في ذلك لآيات للعالمين﴾ (سورۃ الروم:۲۲)، پھر یہ زبان اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، جس سے انسان اپنے افکار و خیالات، جذبات واحساسات اور اپنا ما فی الضمیر دوسروں تک منتقل کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿الرحمن ، علم القرآن ، خلق الإنسان ، علمه البيان﴾ (سورہ رحمٰن ۱-۴)

دنیا کے مختلف علاقوں میں مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں، بلکہ ایک ہی ملک کے رہنے والے باشندے بیشمار زبانیں بولتے ہیں جو ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہوتی ہیں کہ ان کا سمجھنا اسی ملک کے رہنے والے دیگر خطوں کے باشندوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زبانیں پیدا ہوتی ہیں اورٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی رہتی ہیں، لیکن ان میں تدریجی طور پر ارتقائی عمل جاری و ساری رہتا ہے، بعض مرتبہ ایک زبان کی شکل وصورت آگے چلکر اس درجہ بدل جاتی ہے کہ اس کو پہچاننا دشوار ہوجاتا ہے۔

یہی صورت حال اردو کے ساتھ بھی پیش آئی، وہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی ہندوستان میں ابتدائی آمد ہی سے بولی جانے لگی تھی ،ابتداء میں مسلمان سندھ میں آئے اس لئے وہاں سے اس کی شروعات ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ مختلف علاقوں میں پھیلے اس لئے مسلمان جہاں جہاں گئے وہاں وہاں یہ زبان بولی جانے لگی، لیکن ابتداء میں اس کا نام اردو نہیں تھا، بلکہ یہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی ہوئی اور مختلف ناموں سے گزرتی ہوئی اخیر میں اردو کے نام سے موسوم ہوئی جب یہاں کی قدیم آریائی اور مختلف علاقوں سے آنے والی قوموں سے ان کا اختلاط ہوا اور اس کے نتیجہ میں اس میں مختلف زبانوں کے الفاظ بکثرت داخل ہوئے۔

محمود شیرانی لکھتے ہیں:

’’اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہوگئی تھی جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر توطن اختیار کیا‘‘۔ (۱)

اور مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ:

"شروع میں اردو کا نام اردو نہ تھا، یہ کہیں دہلوی، کہیں دکھنی، کہیں گوجری، کہیں ہندی و ہندوی اور کہیں قلعۂ معلّٰی کے لحاظ سے اردوئے معلّٰی کہلائی، اس کے ثبوت میں وہ لکھتے ہیں کہ شاہ رفیع الدین دہلوی اور شاہ عبد القادر نے قرآن پاک کا ترجمہ جس زبان میں کیا اس کو انہوں نے ہندی کہا ہے۔ (۲)

دوسری جگہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"موجودہ معیاری اردو، دہلوی زبان اور دوسری زبانوں سے ملکر بنی ہے، آج کل بعض فاضلوں نے "پنجاب میں اردو" بعض اہل دکن نے "دکن میں اردو" اور بعض عزیزوں نے "گجرات میں اردو" کا نعرہ بلند کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ممتاز صوبے کی مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے ان سب کا نام اردو رکھ دیا گیا"۔ (۳)

مذکورہ بالا اقتباسات کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اردو زبان کی پیدائش اور اس کی نشو و نما یہیں ہندوستان میں ہوئی اور وہ یہیں پلی بڑھی۔ اور یہ زبان مختلف قوموں کے درمیان صدیوں کے آپسی میل جول کے نتیجہ میں وجود میں آئی، اور کئی صدیوں تک بلا تخصیص مذہب و ملت اہل ہند کے دلوں پر حکمرانی کرتی رہی، اور آج بھی ملک میں رہنے والے تقریباً اسی فیصد عوام کے رابطہ کی زبان اردو ہی ہے۔ (۴)

اردو زبان و ادب کے ارتقاء کے تاریخی پس منظر میں دہلی کے زوال اور اودھ کے عروج کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دہلی صرف ادبی مرکز نہیں تھا بلکہ سیاسی اور معاشرتی عروج و زوال کا حرارت پیما بھی تھا، جب اس کی مرکزی حیثیت بدلی تو کئی نئے نئے راج دربار پیدا ہو گئے اور شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کر کے خود ادبی مرکزوں کی صورت اختیار کر گئے۔ ان میں حیدر آباد، مرشد آباد، رام پور، بھوپال، ٹونک وغیرہ منظر عام پر نمودار ہوئے اور وہ یا تو دہلی کی مغل حکومت کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے غدر میں ختم ہو گئے یا ایک محدود پیمانے پر شاعروں کی سرپرستی کرتے رہے، ان میں اودھ کی سلطنت کو اور اس میں بھی بطور خاص لکھنؤ کو غیر معمولی ادبی اور تہذیبی حیثیت حاصل ہوئی، حتیٰ کہ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ دو مستقل اور ایک دوسرے کے متوازی دبستان وجود میں آ گئے۔

اٹھارہویں صدی کی پہلی چوتھائی میں برہان الملک نے اودھ میں ایک نیم خود مختار حکومت قائم کی، مگر اس کو حقیقی عظمت اور واقعی اہمیت شجاع الدولہ کے زمانے میں حاصل ہوئی۔ ابتداء میں اودھ کے نواب وزیروں کا پایۂ تخت فیض آباد میں تھا، شجاع الدولہ اور خاص کر ان کی بیوی بہو بیگم نے فیض آباد کو ایک ادبی و ثقافتی مرکز بنا دیا۔ شجاع الدولہ کا زمانہ (۱۷۵۴ء سے ۱۷۷۵ء تک رہا، انہوں نے پلاسی، پانی پت اور بکسر کی لڑائیوں میں حصہ لیکر اودھ کو ایک بار پھر ہندوستان کے نقشہ پر نمایاں کیا، دہلی سے نکلے ہوئے پریشان حال شاعر، فن کار، صناع، امراء سب کو اودھ نے پناہ دی، اور اس طرح اس کا نام چمکا اور روشن ہوا، لیکن اودھ کی عظمت کے اصل معمار آصف الدولہ

(۱۷۷۵ء سے ۱۷۹۷ء) تھے جنہوں نے فیض آباد سے ہٹ کر لکھنؤ کو اپنا مرکز بنایا اور یہاں عظیم الشان عمارتوں کا جال بچھا کر اس کو چمن زاروں اور باغوں کا شہر بنا دیا۔

آصف الدولہ کے بعد ان کے بھائی سعادت علی خاں سولہ سال تک تخت حکومت پر رونق افروز رہے۔ ۱۸۱۴ء میں غازی الدین حیدر نواب وزیر ہوئے جنہیں انگریزی سیاست نے بہت جلد خود مختار بادشاہ تسلیم کر لیا۔ نوابوں اور بادشاہوں کا یہ سلسلہ ۱۸۵۶ء تک جاری رہا یہاں تک کہ انگریزوں نے اودھ کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ کو معزول کر کے انہیں مٹیا برج (کلکتہ) بھیج دیا، اور حکومت اودھ کا خاتمہ ہو گیا۔ (۵)

سلطنت اودھ میں انگریزوں کی مداخلت تو شجاع الدولہ کے زمانے میں ہی شروع ہو گئی تھی، لیکن آصف الدولہ کے زمانے میں بات یہاں تک پہونچی کہ اودھ کا سارا نظام انگریز ریزیڈنٹ کے چشم وابرو کے اشارے کا محتاج ہو گیا، واجد علی شاہ اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے کہ امور سلطنت سے چشم پوشی کر کے خود کو راگ ورنگ میں غرق کر دیں، مگر بے درد انگریزوں نے اس کا بھی انعام نہ دیا اور انہیں معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا۔

انگریزوں کی مداخلت سے اودھ کی آزادی تو چھن گئی لیکن ان سے صلح کے نتیجہ میں اودھ کو ایک پُر امن اور خوش حال زندگی نصیب ہوگئی، عیش وعشرت کی زندگی اس خوشحالی کا لازمی نتیجہ تھی، ہر طرف راگ ورنگ کی بزم آراستہ ہوگئی اور شعر وسخن کی محفل سج گئی۔ ادھر دہلی میں اہل کمال کی گزر مشکل ہوئی تو وہ ایک ایک کر کے لکھنؤ میں جمع

ہو گئے، ان اہل کمال میں بڑی تعداد شاعروں کی تھی۔ میر ضاحک، سوز، سودا وغیرہ تو پہلے ہی اودھ پہونچ کے مشاعروں میں مقبول ہو چکے تھے، میر حسن، جرأت، انشاء اور مصحفی ان کے بعد یہاں پہونچے اور یہیں سے دبستان لکھنؤ کی بنیاد پڑی۔

اس سے اگلی نسل کے شاعروں میں ناسخ کا نام قابل ذکر ہے، اصلاح زبان ان کا اصل کارنامہ ہے، تنقید نگاروں نے ان کو ادبی ڈکٹیٹر کہا ہے کیوں کہ جس لفظ یا جس محاورے کو انہوں نے رد کر دیا وہ ٹکسال سے باہر ہو گیا، لکھنؤ کی انفرادیت انہیں کے دم سے قائم ہوئی۔ آتش صوفی تھے اور بہت خوش گو شاعر۔ انہوں نے ثابت کر دیا کہ شاعری مرصع سازی ہے، اور شعر کہنا موتی پرونے کے برابر ہے۔ (۶)

شجاع الدولہ خود شاعر نہ تھے مگر شاعروں کا احترام کرتے تھے، اور اپنے دربار کی زینت بڑھانے کے لئے انہیں اودھ آنے کی دعوت دیتے تھے، تباہ حال دہلی کے مقابلہ میں یہاں کی رونق نے بہت سے شاعروں اور فنکاروں کو اودھ میں جمع کر دیا، آصف الدولہ نے اس سرپرستی کو اور وسیع کیا، وہ خود بھی اچھے شاعر تھے اور شعراء کی قدردانی میں مغل بادشاہوں کی یاد دلاتے تھے، غازی الدین حیدر بھی شاعر تھے اور واجد علی شاہ تو فنون لطیفہ کی دلدادگی کے ساتھ ساتھ تقریباً سو کتابوں کے مصنف بھی تھے، فارسی اور اردو میں نظم و نثر کی ان کی بعض تصانیف اختراع کا درجہ رکھتی ہیں۔ (۷)

اودھ کے نوابوں کا دارالسلطنت چونکہ ابتدا میں فیض آباد تھا، اس لئے اردو کی نشو و نما اور تراش خراش میں فیض آباد لکھنؤ سے پیچھے نہیں رہا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اردو اور اردو والوں کی خطۂ اودھ میں اولین سرپرستی فیض آباد کے حصہ میں آئی تو یہ بات غلط نہ

ہوگی، چنانچہ اردو کے صاحب طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریابادی اپنے ایک مضمون ''ایک مختصر سا پیام فیض آباد کے اردو ڈے منانے والوں کے نام'' میں لکھتے ہیں:

''اردو کا تعلق فیض آباد سے آج کا نہیں، نسلوں اور قرنوں کا ہے، فخر لکھنؤ میر انیس اسی خاک کے تھے، نازش مثنوی میر حسن اسی سرزمین سے اٹھے، چکبست چمکے لکھنؤ جا کر، لیکن پیدا یہیں ہوئے تھے، پھر آپ کا شہر دارالحکومت بھی تو ملک اودھ کا رہ چکا ہے، اور یہ معلوم ہے کہ زبان کی سرپرستی حصہ تھا ہمارے بادشاہوں کا اور اردو زبان کی تراش خراش نوک پلک حصہ رہ چکی ہے شاہی بیگمات کی۔'' (۸)

حکومت اودھ کا دارالسلطنت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہو جانے کے بعد اودھ میں اردو زبان وادب کی سرپرستی اور آرائش وزیبائش اور حک واصلاح لکھنؤ کے حصہ میں آئی، اور پھر لکھنؤ نے اردو زبان وادب کی جو خدمت کی، اس کے جو گیسو سنوارے اور زبان اردو کو جو تہذیب اور سلیقہ سکھایا وہ اپنی نظیر آپ ہے، علامہ سید سلیمان ندوی دہلی کی بربادی اور لکھنؤ کی بازآبادی کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے مخصوص اسلوب میں رقمطراز ہیں:

''دلی کے باغ میں جب خزاں آئی تو یہاں بہار کا موسم آیا، اس اجڑے باغ کے کتنے مرغ خوش لحن تھے، جنہوں نے اڑ اڑ کر اس چمن پر بسیرا لیا، ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ

اور پنجاب میں ہوئی، نشو ونما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی، لیکن تہذیب اور سلیقہ یہیں لکھنؤ میں سیکھا"۔ (۹)

لکھنؤ کے ادباء وشعراء نے اردو زبان کو کافی ترقی دی اور اس میں وقیع اور بیش قیمت اصلاحات کیں، زبان کی اصلاح اور نوک پلک درست کرنا لکھنؤ والوں کا اردو زبان وادب پر ایک احسان ہے، یہاں کی لسانی خدمات کو سید صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ "ناسخ نے زبان کی نزاکت ولطافت میں وہ کام کیا جو ہر ایک ہوشیار جوہری جواہرات کے نوک پلک نکال کر جلا دینے میں کرتا ہے، ان کے شاگرد والا جاہ میر اوسط علی رشک نے صحیح وغلط اور سبک لفظوں کو اس طرح پرکھ کر الگ کر دیا کہ ان کی پسند فصاحت کا معیار بن گئی، سینکڑوں الفاظ جو بول چال میں رائج تھے مگر شعر وانشاء کی بارگاہ میں ان کو بار حاصل نہ تھا ان کو خود اپنے شعروں میں نظم کر کے پچھلوں کے لئے سند پیدا کی۔ لکھنؤ میں یہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے ۱۲۵۶ء میں اردو لغت ترتیب دیا جس کا نام نفیس اللغہ ہے۔ سید انشاء اللہ خاں کے دریائے لطافت کا دھارا بھی یہیں بہا۔ شیخ امداد علی بحر کی نسبت بھی مشہد ہے کہ انہوں نے کوئی لغت لکھا تھا مگر اس کا سراغ نہیں ملتا۔ حکیم ضامن علی جلال نے زبان کو نہ صرف شاعری بلکہ وضع اصول اور تحقیقات کے لحاظ سے مالا مال کیا ہے، سرمایۂ زبان اردو، مفید الشعراء، مجمع اللغات، گلشن فیض، اور قواعد المنتخب وغیرہ ان کی وہ کتابیں ہیں جو اردو زبان کا سرمایہ ہیں"۔ (۱۰)

ناسخ اور آتش اور ان کے شاگردوں نے شاعری کو صوری اور معنوی اعتبار سے

بالکل بدل دیا اور اس طرح شاعری کا ایک نیا اسکول قائم ہوگیا۔ لکھنؤ اسکول اپنی خصوصیات یا معائب کی بدولت الگ سے پہچانا جاتا ہے، لیکن ان عیوب کے باوجود لکھنؤ اسکول کا ایک ایسا کارنامہ بھی ہے جس کو اردو زبان اور شاعری کبھی فراموش نہیں کرسکتی، اور وہ ہے اصلاحِ زبان۔

نورالحسن نقوی ''تاریخ ادب اردو'' میں لکھتے ہیں:

''دبستان لکھنؤ کی شاعری زبان کے نقطۂ نظر سے زیادہ دلکش اور پرکشش ہے، یہ اودھی کا علاقہ ہے، اس لئے یہاں کی زبان اور زبان سے زیادہ لہجہ نرم اور شیریں ہے۔ اس کا ایک سبب اور بھی ہے، اہل لکھنؤ ہر معاملہ میں دہلی والوں سے الگ اور ممتاز نظر آنے کے خواہاں رہے، زبان کے سلسلہ میں انہوں نے اہل دہلی سے الگ اپنا راستہ نکالا، پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ لکھنؤ کی زندگی میں جو بناؤ سنگھار تھا وہ وہاں کی شاعری میں نمودار نہ ہوتا، شعرائے لکھنؤ نے جذبات سے زیادہ الفاظ کی نوک پلک سنوارنے اور زبان میں لطافت پیدا کرنے پر زور دیا اور اس میں شک نہیں کہ دبستان لکھنؤ کی زبان زیادہ دل آویز ہوگئی۔ (۱۱) نیز اودھ کے نوابوں کا تعلق چونکہ ایران سے تھا اور ان کا مذہب بھی تشیع تھا، اس لئے ان کی زبان و تہذیب پر فارسی زبان اور ایرانی تہذیب کا بھی خاصا اثر پڑا، پھر فارسی زبان اپنی نزاکت کے لئے مشہور ہے،

اس پہلو میں بھی اردو نے اس سے استفادہ کیا''۔

زبان و بیان کی خوبیوں میں نکھار پیدا کرنے، عوام کے فطری جذبات کو صحیح اور کارآمد عملی شاہراہوں پر آمادہ کرنے، رجحانات واحساسات کی راست رہنمائی کرنے، عوام میں قوت ارادی اور قوت عملی کو تقویت فراہم کرنے اور مظلوموں کے شکستہ دل کو سہارا دینے کے لئے صحافت ایک زبردست، مؤثر اور سود مند وسیلہ ہے، لکھنؤ نے جس طرح شعروشاعری اور ادب کی سرپرستی کی، اسی طرح اس نے صحافت کی راہ سے بھی اردو کی خدمت کی، چنانچہ ابھی ''انیسویں صدی کی تین ہی چوتھائیاں گزری تھیں کہ منشی نول کشور کی عنایت سے اور ان کے بعد بابو گنگا پرشاد ورما کی ذات گرامی سے لکھنؤ کی سرزمین پر اردو صحافت کی شگوفہ کاری ہوئی، اور پھر روزنامے ہفت روزہ اور ماہنامے رسائل نکلنا شروع ہوئے جنھوں نے زبان کو ایک نئی جہت اور نئی سمت عطا کی۔ روزنامہ اودھ اخبار کے نام سے ایک ثمر نورس وشیریں کی دھوم مچی۔اردو کے دو بہترین ادیب وافسانہ نگار اسی صحافت کی راہ سے لکھنؤ میں چمکے، ایک عبدالحلیم شرر اور دوسرے فرد فرید رتن ناتھ سرشارؔ۔ان دونوں کے صحت منداثرات نے اردو زبان کو نکھار دیا اور عوام کو متاثر کر کے اخلاق وکردار کو بلند کرنے میں سہارا دیا۔

اودھ پنچ کا ہم عصر اور مدمقابل ایک دوسرا جریدہ ''پیام یار'' تھا جو بہت مقبول تھا، اودھ پنچ کا طرز طنزیہ ومزاحیہ تھا لیکن پیام یار سنجیدہ ادبی میگزین تھا۔اسی دور کا ایک موقر اور بہت مقبول ماہنامہ ''دل گداز'' تھا جو مولانا شرر نکالتے تھے، انہوں نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد اپنی ادبی تخلیقات پیش کرنے کے لئے بیک وقت دو رسالے

شائع کئے تھے، دوسرے کا نام ''مہذب'' تھا، جس دور کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اس زمانے میں بہت سے ہفتہ وار اور ماہنامے نکلے، اور بند ہو گئے، علم وادب کا اتنا ذوق تھا کہ جو جریدہ یا رسالہ شائع ہوتا ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتا۔ (۱۲) اس دور میں مولانا ظفر الملک علوی کا ''الناظر'' اور مولانا عبدالماجد دریابادی کا ہفتہ وار ''سچ'' بہت مقبول تھا اور ان دونوں نے اردو زبان وادب کی کافی خدمت کی۔ ''کارنامہ'' کے نام سے ایک اور ہفت روزہ اودھ اخبار سے بھی قدیم تر لکھنؤ سے نکلتا رہا، جو مولوی محمد یعقوب فرنگی محلی کے سایہ میں داد صحافت دیتا رہا، اور فسانۂ عجائب کی مقفع، مسجع، مطلا اردو کی یاد دلاتا رہا، ایک پندرہ روزہ پرچہ جامع الاحکام بھی اپنی بہار دکھاتا رہا۔ پندرہ روزہ پرچوں میں ہمیں ایک نام ''مرآۃ ہند'' کا بھی ملتا ہے۔ اسی طرح منشی نثار حسین کا ظریف بھی تھا ہفت روزہ پرچوں میں مولانا عبدالحلیم کا النجم، مرزا محمد ہادی مرزا کا الحکم، محمود علی فلک کا رفیق ہند۔ اور پھر ندائے ملت، عزائم، تعمیر حیات، نظارہ اور سرفراز تو بالکل سامنے کی چیزیں ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے مسلم گزٹ نکلا، اس کے اڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم پانی پتی تھے۔ (۱۳)

ماہناموں میں شبلی کا الندوہ بہت نمایاں تھا جس کے لکھنے والوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبداللہ عمادی اور مولانا عبد السلام ندوی تھے۔ شرر کا دلگداز اور مؤرخ، غلام الثقلین کا بلند پایہ عصر جدید۔ نوبت رائے کا خدنگ نظر۔ پیارے لال شاکر میرٹھی کا العصر۔ قاضی تلمذ حسین کا لسان العصر۔ چکبست کا صبح امید۔ نیاز فتحپوری کا نگار۔ عبدالوالی کا معلومات۔ شرر کا رسالہ سخن سنج۔ علی

محسن ابر کا معیار، یہ چند مختصر نام ہیں جنہوں نے اردو زبان کی تشکیل اور اس کی آبیاری میں بڑا اہم کردار کیا ہے۔صحافت کے علاوہ لکھنؤ کے مشاعروں اور ان میں ہونے والی شعراء کی نونک جھونک اور یہاں کی ادبی وعلمی انجمنوں جن میں دائرۂ ادبیہ اور معیار ادب نامی انجمنیں بہت نمایاں ہیں، ان سب نے بھی اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور زبان کی اصلاح میں اہم رول ادا کیا ہے۔ (۱۴)

فیض آباد اور لکھنؤ کے علاوہ پڑوس کے مختلف قصبات اور دیہات کا بھی اردو زبان وادب کی تشکیل اور اس کی نشو ونما میں قابل ذکر خدمات رہی ہیں، ان میں بارہ بنکی، سہالی، سیتاپور، خیرآباد اور موہان وغیرہ قصبات کا نام سرفہرست ہے، ان علاقوں میں بھی بہت سے ادباء وشعراء پیدا ہوئے جنہوں نے گیسوئے اردو کو سنوارا اور اس کی نوک پلک درست کی، یہاں کتب خانے بھی تھے، قدیم مدارس بھی تھے اور انفرادی طور پر علماء وشعراء حضرات بھی تھے جو زبان وادب کی خدمت میں مصروف تھے۔

غرض اردو زبان وادب کی تشکیل میں خطۂ اودھ کا حصہ بہت نمایاں رہا ہے، اور اس کی خدمات اور کارنامے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں زریں حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔

مراجع ومصادر

(۱) علامہ سید سلیمان ندوی: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی ص ۱۶۱

(۲) علامہ سید سلیمان ندوی: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی ص ۱۳۷

(۳) ماہنامہ معارف، جولائی ۱۹۹۳ص ۱۰، بحوالہ اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات از ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صدیقی ندوی

(۴) سہ ماہی حرا کا خصوصی شمارہ: ہندوستان اور مسلمان، مضمون نثار احمد ندوی قاسمی: ہندوستان کی آزادی میں اردو زبان کا کردار ص ۱۰۷-۱۰۸

(۵) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ: سید احتشام حسین ص ۸۳-۸۴

(۶) نورالحسن نقوی: تاریخ ادب اردو ص ۶۱-۶۲

(۷) اردو ادب کی تنقیدی تاریخ: سید احتشام حسین ص ۸۴-۸۵

(۸) انشائے ماجد یا لطائف ادب، مرتبہ حکیم عبدالقوی دریابادی: ۲۶۳

(۹) علامہ سید سلیمان ندوی: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی ص ۱۴۱

(۱۰) علامہ سید سلیمان ندوی: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی ص ۱۴۱-۱۴۲

(۱۱) تاریخ ادب اردو: نورالحسن نقوی ص ۶۲-۶۳

(۱۲) قدیم لکھنؤ کی آخری بہار: مرزا جعفر حسین ص ۲۵۱-۲۵۲

(۱۳) انشائے ماجد یا لطائف ادب، مرتبہ حکیم عبدالقوی دریابادی: ۳۰۴

(۱۴) قدیم لکھنؤ کی آخری بہار: مرزا جعفر حسین ص ۲۶۲

سید علی

بنگال میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء

ملک کی دوسری اردو نواز ریاستوں کی طرح بنگال بھی شروع ہی سے اردو ادب و زبان کے ارتقاء میں ناقابل فراموش کردار ادا کرتا رہا ہے۔ بنگال میں اردو زبان کی ایک مربوط اور ارتقاء پذیر تاریخ رہی ہے، یہ عہد ماضی سے اردو زبان و ادب کا مرکز رہا ہے۔ بنگال میں ۱۳ ویں صدی عیسوی سے مسلم سلاطین کی آمد شروع ہوئی اور اس سے قبل صوفیائے کرام کے ورود مسعود سے مقامی زبان اثر انداز ہوتی رہی جس سے ایک نئی زبان کے تشکیلی عوامل نمایاں ہوتے گئے۔ مقامی زبانوں کے رنگ و آہنگ میں تبدیلی اور نئی زبان کے نشونما میں ایک لمبی مدت لگ گئی۔ ۱۷ ویں صدی کے اوائل سے نئی زبان رابطے کی زبان بن سکی، دھیرے دھیرے اردو زبان و ادب کا رنگ نکھرتا گیا اور اس کی جڑ مضبوط ہوتی گئی۔ گذشتہ ڈھائی سو برسوں میں بنگال میں شعر و ادب کا وسیع سرمایہ جمع ہو چکا ہے۔ اردو نثر نے بطور خاص اتنی ترقی کر لی ہے اور اردو ادب میں وہ مقام حاصل کر لیا ہے جس کی مثال اردو کے دوسرے علاقوں اور مرکزوں میں مشکل

سے ملے گی۔

بنگال میں اردو زبان وادب کی بنیاد تو تیرھویں صدی عیسوی ہی میں پڑ چکی تھی لیکن اس کی صورت گری اور ارتقاء واستحکام میں طویل مدت لگ گئی۔ ۱۳ویں صدی میں بنگال میں مسلم حکمرانوں کی آمد سے پہلے صوفیائے کرام کے خانوادے بنگال کے مختلف علاقوں میں پھیل چکے تھے، جنھوں نے بنگال کے مختلف اضلاع میں اپنے گہرے اثرات چھوڑے۔ ان کا تعلق بغداد، ایران، اصفہان، سمرقند اور شمالی ہندوستان سے تھا۔ ان کی زبان فارسی، عربی اور ترکی تھی۔ ان کو اپنے مشن کی تبلیغ واشاعت کے لئے جب کسی رابطہ کی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی تو انہوں نے مخلوط آسان ہندوستانی زبانوں میں اپنا تبلیغی کام شروع کیا۔ ہندی اور اسلامی ثقافت کے ارتباط سے مشترک زبان وثقافت کی داغ بیل پڑی۔ ہندوستانی بولیوں میں عربی، فارسی اور ترکی زبان کے الفاظ داخل ہوتے چلے گئے۔ الفاظ کے اس ارتباط اور جذب وانجذاب سے اردو کی شکل نکھرتی گئی۔ صوفیائے کرام کے مریدوں کا بڑا حلقہ اردو کے زیر اثر آیا اور یہ لوگ مولوی یا اردو داں مولوی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آج بھی دینی تعلیم کے حصول کے لئے بنگلہ داں طلبہ مسلمان اردو مدارس سے اکتساب علم کرتے ہیں اور عربی کے ساتھ اردو نصاب پڑھتے ہیں۔

مسلم فاتحین جن کی زبان فارسی اور ترکی تھی بنگلہ زبان میں خلط ملط ہونے لگی اور ترسیل خیالات کا ذریعہ اور رابطہ کی زبان بنی۔ مغلوں کے عہد میں مشترکہ تہذیب وثقافت کے اثرات سے بنگال کی سماجی زندگی بھی متاثر ہوئی اور اسی کے ساتھ اردو نما

نئی زبان بھی رفتہ رفتہ بنگال کے گوشے گوشے میں رائج ہوتی چلی گئی۔ پانچ سو سے زیادہ اردو الفاظ بنگلہ زبان میں داخل ہیں۔ اردو کے نشوونما اور تشکیل وتزئین میں شروع ہی سے مسلمانوں کے علاوہ ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کا بڑا موثر حصہ رہا ہے۔ اگر چہ ابتدائی دور میں اردو مسلم حکمرانوں اور نوابوں کی سرپرستی مین پروان چڑھی لیکن اس کی آبیاری میں غیر مسلموں کے احسان کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اردو کی ترقی میں اگر بنگال کے میر امن دلی والے، میر شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، حیدر بخش حیدری کی کدوکاوش کو خراج تحسین پیش کیا جائے گا تو نہال چند لاہوری، بنی نارائن جہاں، تارانی چرن مترا، راجہ جنم جئے مترا، راجہ رام موہن رائے، گل کرسٹ، ڈاکٹر ولیم تھامس روبک، جیمس کارکرن اور فرانسس کا بھی احسانمند ہونا پڑے گا۔ اس اعتبار سے اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہندوؤں، عیسائیوں اور دیگر فرقوں کی زبان بھی ہے۔ یہ ایک سیکولر زبان ہے اور ہندوستان کی مشترک وراثت ہے۔

۱۳ ویں صدی عیسوی میں قطب الدین ایبک کے جنرل اختیار الدین بن بختیار خلجی نے بنگال فتح کیا اور بنگال کے علاقہ گوڑ پر قبضہ کیا تو اس کے بعد ہی سے بنگال کے علاقوں میں مسلمان پھیلتے چلے گئے۔ اور بنگال میں مسلم کلچر کی جڑ مضبوط ہونے لگی لیکن اردو کو راجہ رام موہن رائے، راجہ ارمان، راجہ کرشنا، منشی تارانی چرن اور کشیب چندر جیسے ادیب، شاعر اور عالم نے فروغ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کلکتہ شروع ہی سے بنگال کا سب سے بڑا شہر اور تجارتی مرکز رہا ہے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں ہندوستان کی راجدھانی ہونے کے سبب اس کی حیثیت بین

الاقوامی شہر کی ہوگئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے قیام کے بعد انگریز حاکموں نے محسوس کیا کہ حکومت کرنے اور عوام میں مقبول ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہندوستانی زبان سیکھیں، انہوں نے اس مقصد کے تحت خود بنگلہ اور اردو زبان سیکھنا شروع کیا۔ بنگلہ زبان چونکہ مشرقی ہندوستان کے ایک حصہ تک محدود تھی، لہذا انہوں نے ہندوستان گیر زبان پر دسترس حاصل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اسی منصوبہ کے تحت ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا۔ مشہور مستشرق ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے صدر شعبہ کی حیثیت سے چارج سنبھالا۔ ان کے اس انتخاب سے شعبہ میں چار چاند لگ گئے۔ گل کرسٹ نے نہ صرف ہندوستانی زبان کی تعلیم کا بہتر سے بہتر انتظام کیا بلکہ تصنیف وتالیف اور ترجمہ کرنے اور ان کی طباعت کی طرف بھی توجہ دی۔ مصنفین کی ہمت افزائی کے لئے کتابوں پر انعامات دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا ۔گل کرسٹ نفسیات کا ماہر تھا وہ ہندوستانی عوام کے جذبات کو بخوبی سمجھتا تھا۔ اس کو یہ بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ ہندوستان کے عوام زیادہ تر غیر تعلیم یافتہ ہیں لیکن ان کو اپنے مذہب، اپنے رسم ورواج اور اپنے ماضی سے بے پناہ محبت وعقیدت ہے، اس لئے اس نے فارسی، عربی اور سنسکرت کے قصے، کہانیوں اور داستانوں کا آسان اور عام فہم اردو و ہندی ترجمہ کرنے کے لئے ہندوستان کے قریب قریب ہر علاقے کے ۳۸/ادیبوں اور مصنفوں کی خدمات حاصل کیں جنہوں نے مختلف موضوعات پر ۱۲۱/کتابیں تصنیف وتالیف اور ترجمہ کیں۔ حامد حسن قادری کے بموجب ڈاکٹر گل کرسٹ کا اردو زبان پر کتنا بڑا احسان ہے کہ انہوں نے اردو کا سب سے پہلا لٹریچر گویا ایجاد کیا۔ ہندوستان

کے ذی علم واہل زبان لوگوں کو جمع کیا اور اردو کتابیں لکھوائیں۔

تاریخ کی روشنی میں بنگال میں شعر و ادب کی تاریخ کا باقاعدہ آغاز ۱۸ویں صدی سے محمد شاہ کے عہد سے ہوتا ہے۔ عہد اسلامی سے پہلے بھی شمالی ہند میں جب کوئی عظیم نظریہ جنم لیتا تھا یا کسی تحریک کی لہریں اٹھتی تھیں تو اتر پردیش اور بہار کی سرحدوں کو پار کرتی ہوئی بنگال تک پہنچتی تھیں اس لئے اردو کا ارتقاء جس انداز سے گجرات یا دکن میں ہوا اس طرح بنگال میں نہیں ہوا۔ اس کے چند تاریخی اسباب تھے۔ اردو بولنے والے دہلی اور اطراف دہلی کی طرح دوسری ریاستوں کے لوگ جتھے بنا کر بنگال میں آتے تھے۔ معاش اور تجارت کے سلسلے میں آتے اور چلے جاتے جب کہ محمد تغلق کے عہد میں اطراف دہلی کی بہت بڑی آبادی دکن منتقل ہوگئی۔ یہی کیفیت گجرات کی تھی۔ علاؤالدین خلجی نے گجرات فتح کیا تو اسکے نظم ونسق کو کافی حد تک بدل دیا جو اردو کے لئے سازگار بن گیا۔ ابتدا میں بنگال میں اردو کی ترقی تیزی کے ساتھ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بنگال کے مسلم سلاطین وامراء اور صاحبان اقتدار نے سماجی وثقافتی تقاضوں اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر اردو یا ہندی کے بجائے بنگلہ زبان کی سرپرستی کی۔ تاہم مغربی بنگال کے مرشد آباد میں جن نوابوں کی حکومت تھی وہ علم وادب کے رسیا تھے۔ تلاش معاش کی غرض سے وہاں آنے والوں میں شعراء، ادبا اور فضلا بھی ہوتے تھے۔ ۱۷۹۸ء میں شیر علی افسوس مرشد آبادی کلکتہ آئے تو دو برسوں کے بعد فورٹ ولیم کالج کے قیام ساتھ وہ اس سے وابستہ ہوکر ہندوستانی شعبہ کے میر منشی مقرر ہوئے اور ڈاکٹر گل کرسٹ کے ساتھ ترجمہ وتالیف میں لگ گئے۔

تھوڑے دنوں بعد حیدر بخش حیدری بھی فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہوئے اور انہوں نے قصہ مہر و ماہ کو اردو میں منتقل کیا جو انکی اردو میں پہلی تصنیف مانی جاتی ہے۔ انہوں نے بعد میں کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جن میں لیلی مجنوں کی فارسی مثنوی، طوطا کہانی جو محمد قادری کے طوطی نامہ کا اردو ترجمہ ہے۔ ۱۸۰۱ء میں شائع ہوئی اسی دور میں آرائش محفل کا فارسی سے اردو میں ترجمہ بھی ہوا۔ ۱۸ویں صدی کے آخر میں مرشد آباد سے جو بنگال میں اردو کا پہلا مرکز بن گیا تھا، وہاں سے قدرت اللہ قدرت اتالی نواب مخلص، ماشاء اللہ خاں مصدر، انشاء اللہ خاں انشاؔ وغیرہ کی شاعری کی شہرت بنگال سے نکل کر شمالی ہند میں پھیل چکی تھی۔ مرشد آباد کے ساتھ مٹیا برج، ہگلی، کلکتہ بھی ادبی مرکز بنتے گئے۔ مغلیہ سلطنت کا چراغ جب ٹمٹمانے لگا تو دہلی سے بڑے بڑے ادباء و شعراء کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا نتیجہ یہ ہوا کہ شرفاء، امراء اور شعراء کی محفلیں اجڑنے لگیں۔ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں دوسری ترقی پذیر ریاستوں میں منتقل ہونے لگے۔ ان کے قافلے لکھنؤ، عظیم آباد اور مرشد آباد بھی پہونچے۔ جب بنگال پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور کلکتہ راجدھانی بن گیا تو مرشد آباد کے شعراء اور ادباء نے کلکتہ کا رخ کیا۔ کلکتہ کا ماحول اردو ادب کے فروغ میں خصوصاً نثری ادب کے لئے بیحد سازگار ہوگیا۔ ایسے ہی حالات میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا جو اردو نثر کا پہلا مرکز قرار پایا۔ فورٹ ولیم کالج کے ۵۴ سالہ عہد میں تذکرہ نویسی، قصہ، کہانی، تاریخ، علم و ادب اور مذہبی موضوعات پر تقریباً ۱۵۰ کتابیں ترجمہ، تالیف اور تصنیف ہوئیں۔

۱۹ویں صدی میں اردو کا فروغ عام شروع ہوا۔ جس کی اشاعت و ترویج میں

غیر مسلم بنگالیوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور درجنوں شعراء وادبا اور صحافیوں نے اردو کا نام روشن کیا۔ اردو کا پہلا اخبار ۱۸۲۲ء میں جام جہاں نما ہری دت منشی سدا سکھد یو کی ادارت میں شائع ہوا۔ ۱۹ویں صدی کی پہلی دہائی میں بنگال میں اردو نثر نے اتنی ترقی کر لی اور ادب میں وہ مقام حاصل کر لیا جس کی مثال اردو کے دوسرے علاقوں اور مرکزوں میں نہیں ملتی۔ اردو نظم بھی اپنے عروج کو پہونچ چکی تھی۔ غرض کہ دوسرے علاقوں کی طرح بنگال بھی شروع ہی سے اردو زبان وادب کے ارتقاء میں نا قابل فراموش کردار ادا کرتا رہا ہے۔ حالانکہ بنگال کی علاقائی زبان بنگالی ہے لیکن بنگلہ زبان کے پہلو بہ پہلو اردو ادب نے بھی ارتقائی مراحل طے کئے ہیں اور اپنا خاص مقام بنایا ہے۔ سب سے پہلی انگریزی اردو ڈکشنری اور اردو کے قواعد کی کتاب یہیں لکھی گئی۔ فارسی، عربی اور سنسکرت زبان کے ترجمے اردو میں یہیں ہوئے۔ بنگال کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اردو میں پہلی بار ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی پر ہندو ڈاکٹروں نے کتابیں لکھیں اس کے ساتھ قانون، ریاضیات، جغرافیہ اور سائنسی علوم پر بھی نصابی کتابیں لکھیں اور ترجمہ کی گئیں۔

۲۰ویں صدی میں جدید علوم وفنون اور سائنس وٹکنالوجی کی ترقی نے جو فطری اور ذہنی انقلاب پیدا کیا اس کا اثر عالمی ادب پر بھی پڑا اور اردو ادب پر بھی۔ یہ وہ دور تھا جب خلافت عثمانیہ کے تحفظ کے لئے ہندوستان میں تحریک خلافت چل رہی تھی جس میں ہندو اور مسلمان دونوں حصہ لے رہے تھے۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک بھی زور پکڑ رہی تھی اور بڑے پیمانے پر ہندو اور مسلمان انگریزوں کے عتاب کے شکار

ہو رہے تھے۔ ۲۰ ویں صدی کی دوسری دہائی کے آغاز میں اردو صحافت نے پوری انقلابی حرارت کے ساتھ آزادی کا پرچم اٹھایا۔ انقلاب کا نعرہ دیا اور اپنے الہامی قلم اور زلزلہ خیز تحریروں سے ایسا صور پھونکا کہ انگریزی حکومت کی چولیں ہلنے لگیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ کے جاہ وجلال سے انگریزوں کے خیموں میں زلزلہ آ گیا اور ہندوستانیوں کی رگوں میں حریت کی لہر دوڑ گئی۔ الہلال اور البلاغ بیک وقت اخلاقی اقدار اور صالح نظریہ کے ترجمان بھی تھے۔ آزادی وطن کا صور بھی اور اردو ادب وصحافت کا اعلیٰ نمونہ بھی۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک ان جریدوں میں ان گنت بلند پایہ علمی وادبی اور مذہبی وسیاسی مضامین شائع ہوئے آج بھی صحافتی دنیا میں ان کا نام احترام وادب سے لیا جاتا ہے۔ مولانا آزاد نے اس جریدہ کے ذریعہ قرآن حکیم کی تعلیم کی روشنی میں مسلمانوں کے اندر ایک نئی ذہنی بیداری پیدا کر دی۔ مشہور ادیب وصحافی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی بھی الہلال سے وابستہ تھے، انہوں نے علم وادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دیں وہ اردو تاریخ کا اہم حصہ ہے۔ مولانا ملیح آبادی نے ۱۹۳۱ء میں الہند نکالا جو اس وقت آزاد ہند کے نام سے احمد سعید ملیح آباد ی کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ الہلال کے علاوہ ۱۹۱۲ء میں حکیم رکن الدین نے انوار الاخبار، ۱۹۱۸ء میں کیفی چریا کوٹی نے جمہور اور ۱۹۲۰ء میں چراغ حسن حسرت نے آفتاب نکالا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان کلکتہ سے جتنے اردو اخبارات وجرائد نکلے، ہندوستان کے کسی دوسرے شہر سے اتنی تعداد میں شاید ہی نکلے ہوں، اسکے بعد بھی تا حال بہت سارے روزنامہ اور ہفت روزہ نکلے جن میں کئی ایک تو بند ہو گئے اس

وقت اردو کے چار معتبر روز نامے آزاد ہند احمد سعید ملیح کی ادارت میں، اخبار مشرق وسیم الحق کی، آبشار سالک لکھنوی کی اور عکاس کریم رضا مونگیری کی ادارت میں مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ پندرہ روزہ بخشیات محمد یوسف بخشی کی ادارت میں اور ماہنامہ رہبر صنعت وتجارت محمد حنیف کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

آج بنگال میں ارد وزبان و ادب کے کامیاب ارتقائی منزلوں اور ادبی سرمایوں کا جائزہ لیتے ہوئے غیر معمولی طمانیت کا احساس ہوتا ہے اور اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے اردو کی خدمات میں بنگال کسی دوسری ریاست سے پیچھے نہیں رہا ہے۔ اردو بنگال کی دوسری سب سے بڑی زبان ہے اور ادبی ذخیروں کے اعتبار سے سرمایہ دار بھی۔ بنگال کے اردو دانوں نے ہر دور میں اردو ادب و تاریخ کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ساتھ دیا ہے۔ علمی و ادبی، تحقیقی وتنقیدی، مذہبی و اخلاقی، سائنسی وطبی کون سا ایسا موضوع ہے جس کو اردو ادب نے اپنے دامن میں نہیں سمیٹا ہے۔ شاعری، افسانے، ناول، ڈرامہ نگاری، تذکرے، سفرنامے، ترجمے الغرض کون سی صنف ادب و تاریخ ہے جس پر بنگال کے اردو دانوں نے کام نہیں کیا۔ ۲۰ویں صدی کے نصف اول میں آرزو لکھنوی، ناطق لکھنوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، وحشت کلکتوی، عباس علی خاں بیخود، عندلیب شادانی، جمیل مظہری، رضا مظہری، حسرت نعمانی، پرویز شاہدی جیسے اکابر نے یہاں علم وادب کی شمع روشن رکھی اور اردو کے مشعل برادروں کا قافلہ آج بھی محو سفر ہے۔ کتنے ہی اردو کے اشاعتی ادارے اور مطابع قائم ہو چکے ہیں اور کمپیوٹر کا چلن عام ہونے لگا ہے۔ انجمن ترقی اردو

اور اردو اکیڈمی مغربی بنگال بھی اپنے محدود وسائل کے مطابق اردو کی خدمت انجام دے رہی ہے۔سیکڑوں اردو میڈیم اسکول اور مدارس ومکاتب قائم ہیں۔

اردو کے ساتھ حکومت کا عدم تعاون اور بے التفاتی اور اردو زبان کا تعلق معاش سے جڑا نہ ہونے کے باوجود اردو کی روشنی پھیلتی جارہی ہے، بجھی نہیں ہے دھیمی نہیں ہوئی ہے۔اردو ایک جاندار اور روادار زبان ہے۔کسی کی سرپرستی کی محتاج ہے نہ معاش کے تابع۔ اس میں زندہ رہنے کی قوت وتوانائی، اپنی خودی کے تحفظ ،عصری تقاضوں کی تکمیل اور رہنمائی کی قوت ہے۔ وہ زبان کبھی نہیں مرسکتی جس میں عصری حسیت، انسانی اقدار اور زمینی تقاضوں کا شعور پایا جاتا ہو اور اسے برتنے کا سلیقہ جانتی ہو اور جس کا اسلوب ولہجہ عصری قبولیت کی وسعت رکھتا ہو۔ مایوسی، شکوہ سنجی اور ماتم کا ماحول ختم ہونا چاہئے۔کسی کی سرپرستی کی محتاجی کے بجائے خون جگر سے زبان کی آبیاری کا حوصلہ ہونا چاہئے۔اردو میں ہمارا تہذیبی سرمایہ اور ہمارے ماضی کا وقار و افتخار سمٹ آیا ہے۔اردو زبان کی پوری فضا مسلم تہذیب سے آتی ہے اور اس زبان کی تمام تر جدت، ندرت اور بصیرت اسلامی تہذیب کی ممنون ہے۔اب ضرورت ہے کہ ہمارے ادیب وشاعر، صحافی و نقاد آج کے گھٹے، کراہتے ماحول کو بدلنے کی کوشش کریں۔خالص مادی نظریات اور سفلی جذبات کی بھول بھلیوں سے باہر نکلیں اور اردو ادب کو زندگی کی امنگوں سے ہم آہنگ اور روحانی اور اخلاقی قدروں سے مربوط کریں۔ زندگی صرف معدہ اور شرمگاہ سے عبارت نہیں ہے۔ زندگی ایک ٹھوس اور سنجیدہ حقیقت ہے۔

مولانا صباح اسماعیل ندوی
(علیگ)

اردو زبان وادب کی تشکیل میں ارضِ بنگالہ کا حصہ

''اردو ادب کا لہلہاتا ہوا باغ تنہا ایک باغبان کی محنت کا ثمرہ نہیں ہے، اس کی آبیاری مختلف جماعتوں، مذاہب اور ممالک نے مل کر کی ہے''۔ جناب آل احمد سرور کا یہ بیان بلاشبہ لازوال حقائق پر مبنی ہے۔ زبان اردو جس کا وجود ہی مختلف زبانوں کی منتخب شیرینیوں کا رہین منت ہے، اس کی ترقی و کامیابی اور ترویج و تشکیل کا سہرا کسی فرد واحد، کسی اکیلے مذہب یا کسی خاص علاقہ کے سر نہیں باندھا جا سکتا، اسکے داستان عر[illegible] میں جہاں دلی، لکھنؤ، پنجاب، اور دکن کا نام سنہرے حرفوں سے لکھا جاتا ہے وہیں ا[illegible] بنگالہ کا نام بھی زریں حروف کا حقدار ٹھہرتا ہے۔

میں اپنے مقالے میں اردو زبان وادب کی تشکیل [illegible] بنگالہ کا حصہ کی

وضاحت کے لئے اردو زبان وادب کی ترویج میں ارض بنگالہ کی قدرے وضاحت کرنا چاہوں گا کیونکہ اردو زبان وادب کی تشکیل میں ارض بنگالہ کا حصہ اس وقت تک سمجھا نہیں جاسکتا ہے جب تک اردو کی اس ترویج کا ذکر نہ کیا جائے، جس کا بڑا اور قابل قدر حصہ مشرقی اور مغربی بنگال سے جڑا ہوا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جہاں تک بات اردو زبان وادب کی ترویج کی راہ میں بنگال کی کوششوں کی ہے تو وہ طویل ہے مگر اس کی تشکیل میں اس نے کچھ خاص اثر نہیں ڈالا ہے، اسی لئے میں بنگال میں ترویج اردو کا ذکر قدرے تفصیل سے کرنا چاہتا ہوں، اور ارض بنگالہ اس کی حقدار بھی ہے۔

اس راہ میں جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے تو تاریخ ادب اردو میں سترہویں صدی عیسوی سے ہی بنگال کے رامیشور بھٹا چاریہ جیسے محبّ اردو کا نام دکھائی دینے لگتا ہے، جنھوں نے اپنی مادری وعلاقائی زبان بنگالی کے مقابلہ میں نوزائیدہ اردو کو قابل توجہ سمجھا اور اپنی پوری زندگی اس ننھے پودے کی آبیاری میں صرف کردی۔ مختصر سی مدت کے بعد تاریخ نے انہیں صفحات میں تاریخ ادب اردو (بنگال) کے عظیم سپوت مولوی عبدالغفور نساخ اور ان کے ہم عمر شاگرد رشید سید عصمت اللہ ناسخ المقلب بہ ملک الشعراء نظر آتے ہیں، جنھوں نے نہ صرف تشبیہات واستعارات کے حسین ترین استعمال اور حیران کن و پرکشش طرز ادا کے ساتھ سرزمین بنگال کے شعرا کو عزت کا مقام بخشا، بلکہ اپنے پیچھے گوناگوں صفات سے متصف شاگردوں کی ایک ایسی لمبی جماعت بھی چھوڑی جنھوں نے اپنے اساتذۂ کرام کی طرح ادب اردو کی خدمت کو اپنا شعار بنایا اور چمن اردو کو مسلسل اپنے خون جگر سے سینچتے رہے۔ اس کے بعد نساخ کے

صاحبزادے ابوالقاسم محمد مظہر الحق شمس (حامل ''دیوان شمس'') نے بھی اپنی لازوال شاعری سے اردو دنیا کی بھرپور داد اصول کی، جنہیں ایک جانب داغ دہلوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا تھا تو دوسری جانب طوطیٔ بنگال علامہ رضا علی وحشت کے استاذ ہونے کا بھی اعزاز حاصل تھا۔ ان کے شاگرد امام الشعراء رضا علی وحشتؔ بلاشبہ ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری نے پوری اردو دنیا کی آنکھوں کو خیرہ کر کے رکھ دیا اور وہ دنیائے شاعری میں ''غالب ثانی'' کے نام موسوم کئے گئے۔ اس سچائی میں کوئی دورائے نہیں کہ بنگال کی ادبی فضا نے شاعری کی دنیا میں اتنے سارے معتبر نام دئے ہیں جن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ حافظ اکرام احمد ضیغمؔ، جنم جئے متر اارمان، ہری ہردت، کیشب چندر، کشن دیب بہادر کنورؔ، کرشنا دیب شفقؔ، سید محمود آزادؔ، خواجہ عبدالغفار اخترؔ، مولوی سید حیدر علی طباطبائی، قاضی عبدالحمید اور دردمندؔ، مخلصؔ، قدرتؔ، آشناؔ، جودتؔ، شائقؔ، اشرفؔ، مستؔ، طپشؔ، وصلؔ، دردؔ، صباؔ، ضیاؔ، علیؔ، حیدرؔ، شیداؔ، برقؔ، ابدؔ، نورؔ، واحدؔ، حیرتؔ، مخمورؔ، اور اسی طرح ان کے بعد سید غلام محمد مستؔ، ظاہر علی شاکرؔ، محمد یونس احمدؔ، حرمت الاکرام، پرویز شاہدی، علقمہ شبلیؔ، قیصر شمیمؔ، واحد آرویؔ اور اعزاز افضلؔ تاریخ شاعری کے ایسے درخشندہ اور تابندہ ستارے ہیں جن پر صرف ارض بنگالہ ہی کو ناز نہیں بلکہ پوری دنیائے شعر و سخن کو بجا طور پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے۔ ان تمام شعراء نے اپنی مساعی جمیلہ سے اپنا اور اپنے خطہ کا نام بھی بلند کیا اور ترقی اردو کے لئے کی جانے والی محنتوں میں برابر شریک بھی رہے۔

نظم کے بعد نثر کا وہ عظیم میدان ہے جو کسی بھی زبان کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی

حیثیت رکھتا ہے۔اس میں کمال حاصل کیئے کوئی بھی ادب نہ تو زندہ رہ سکتا ہے اور نہ ہی مختلف جہات زندگی کا آئینہ بن سکتا ہے۔بنگال کی خوش بختی یہ ہے کہ زبان اردو میں نثر کی ترقی کے تعلق سے جس خطہ کا نام سب سے زیادہ عزت واحترام کے ساتھ لیا جاسکتا ہے وہ اسی کا ہے۔یہی وہ سرزمین ہے جہاں اردو نثر نے اپنے ہاتھ پاؤں نکالے اور کاملین فن کے سایہ عاطفت میں ایام شیرخواری گزار کر اس لائق بنی کہ میدان کارزار میں اتر کر اپنے حریفوں سے ٹکرائے اور ترقی یافتہ زبانوں کے شانہ بشانہ چل کر دکھائے۔

یہ ایک مسلمہ سچائی ہے کہ انیسویں صدی سے قبل کی جتنی ساری نثری کاوشیں نظر آتی ہیں سب کی سب مذہبی موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں،مگر انیسویں صدی کے اوائل ہی میں تاریخ نے ایک نیا موڑ لیا اور رفتہ رفتہ نثر تمام شعبہ ہائے حیات کی ترجمان بن گئی۔نثر کو عوامی مقبولیت بخشنے میں جس ادارہ یا تحریک نے سب سے پہلے نمایاں کردار ادا کیا وہ بلا شبہ کلکتہ کا فورٹ ولیم کالج ہی تھا۔کالج کے ناظم اعلی جان گلکرسٹ نے سب سے پہلے اس تعلق سے منظّم اقدام کیا۔انہوں نے میر امن،حیدر بخش حیدری،مظہر علی خاں ولا،بنی نرائن جہاں،نہال چند لاہوری اور مرزا علی لطف جیسے مشہور زمانہ ادیبوں کی خدمات حاصل کر کے ترجمہ وتالیف کا ایسا سلسلہ قائم کیا جو اردو دنیا کے لئے مثال بن گیا۔فورٹ ولیم کالج کے سائے میں نثر اردو کے کارواں کو آگے بڑھانے میں میر بہادر علی حسینی،تارنی چرن متر،مرزا کاظم علی جوان،حفیظ الدین احمد بردوانی،خلیل خاں اشکؔ،مولوی امانت اللہ شیداؔ،مولوی محمد اکرام علی،مرزا مغل

نشاںؔ، سید حمید بہاری، سید بخش علی فیض آبادی، محمد علی اور منصور حسینی وغیرہم کے نام بھی عزت واحترام کے حقدار ہیں، جنھوں نے خزائن اردو کو ان عظیم المرتبت کتابوں کے تراجم وتالیف سے مالامال کیا جن پر زبان اردو آج بھی نازاں ہے۔

بلا مبالغہ ارض بنگالہ ترقی اردو کے لئے ہمیشہ ہی کوشاں رہی ہے۔اس نے نظم کے ساتھ نثر کی بھی تمام اصناف کی طرف بھرپور توجہ دی ہے اور کسی بھی میدان میں اپنے آپ کو پیچھے نہیں رکھا ہے۔اس نے صحافت کی وادی میں قدم رکھا بلکہ سب سے پہلے رکھا کہ اسی سرزمین سے ۱۸۲۲ء میں اردو کا سب سے پہلے ہفت روزہ اخبار ''جام جہاں نما'' ہری ہردت کی ادارت میں جاری ہوا اور اردو کا سب سے پہلا روزنامہ ''اردو گائیڈ'' بھی کبیرالدین بنگالی کی ادارت میں ۱۸۵۸ء میں کلکتہ ہی سے نکلا۔اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں یہیں سے مشہور زمانہ ''الہلال'' جاری کیا اور پھر کچھ عرصہ بعد ''البلاغ'' کے عنوان سے دنیائے صحافت میں چار چاند لگاتے رہے۔ان دونوں اخبارات نے دنیائے صحافت میں ایسی دھوم مچائی اور مولانا کے طرز نگارش نے عوام وخواص کے دل ودماغ پر ایسا جادو کیا کہ اس کا اثر آج تک برقرار ہے۔ارض بنگالہ کی اس عظیم روایت کو توسیع دینے میں جہاں موجودہ اخبارات آزاد ہند، اخبار مشرق، آبشار اور عکاس وغیرہ نے اہم رول ادا کیا ہے وہیں الہند، عصر جدید، آفتاب، نقاش، ہنگامہ، اردو، مخدوم، خادم، چندن، ماہ تمام، آئینہ، نغمہ ونور، صبا، جدید اردو، نورتن، عبرت، نئی منزل، نیا سنسار، ضرب کلیم اور اقراء جیسے مشہور اخبارات نے بھی اس بات کی بھرپور کوشش کی ہے کہ اردو ایک مقبول عام زبان

بن جائے اور زندگی کے تمام شعبوں کی بھرپور ترجمانی کرے۔

الغرض ارض بنگالہ جس کی اپنی علاقائی زبان بنگالی ہے نہ صرف یہ کہ مستقل اور مسلسل ترقی اردو کے لئے کوششیں کرتی رہی ہے بلکہ اس نے بہت سارے محاذ پر ہراول دستہ کی شکل میں نمودار ہوکر اپنی ہمت و جوانمردی اور دانشمندی و جانثاری کا ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ وہ اگر ترجمہ وتالیف اور صحافت کے میدان میں آگے ہے۔ اگر لغت، قواعد تاریخ جغرافیہ، طب اور سائنس پر اردو میں لکھی جانے والی کتابوں کی اولین مخرج ہے تو سب سے پہلے مطبع اردو کے قیام کا اعزاز بھی اسی کو حاصل ہے۔ تاریخ مطابع کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انیسویں صدی میں کلکتہ ،مرشد آباد، ڈھاکہ، سیرامپور اور ہگلی میں بے شمار اردو مطابع وجود میں آگئے تھے جن میں سے لگ بھگ تین درجن پریس تو صرف کلکتہ میں قائم تھے۔ تصنیف وتالیف کو سرعت بخشنے اور زبان اردو کی تخلیقات کو گھر گھر پہونچانے میں جن چھاپے خانوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا ان میں کوپر پریس، ایسٹ انڈیا کمپنی پریس، کرائیکل پریس، ہندستانی پریس، مطبع طبی یا میڈیکل پریس، مطبع محمدی، مطبع رئیس الاخبار، مطبع سلطانی، مطبع مخزن القوانین، ستارۂ ہند پریس، مطبع مظہر العجائب، ایشیا ٹک لیتھو گرافک پریس، بپٹسٹ پرمشن پریس، مطبع گلدستۂ نشاط اور مطبع سلطان الاخبار کے نام ناقابل فراموش ہیں۔

بنگال میں اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لئے کی جانے والی کوششوں کو مختصراً سراہتے ہوئے اگر افسانہ نگاری، ناول نگاری اور ڈرامہ نگاری کی بابت کچھ عرض

نہ کیا جائے تو زیادتی ہوگی کہ ل' احمد، عندلیب شادانی، سلیمان واصف جمیل مظہری، یونس احمد، راحت آرا بیگم اور نشاط الایمان ایسے نام ہیں جنھوں نے افسانہ نگاری کی دنیا میں بہت بلند مقام حاصل کیا ہے۔اس کے علاوہ جرم محمد آبادی، ابراہیم ہوش، رضا مظہری، نظر جمیل، حسن نجمی، شائستہ اختر، ساجن پردیسی، ناشر بلیاوی، ظفر اوگانوی، انیس رفیع اور فیروز عابد کے اسماء بھی دنیائے افسانہ نگاری کے معتبر نام ہیں۔ناول نگاری کی دنیا میں مقبولیت دوام حاصل کرنے والوں میں خواجہ عتیق اللہ شیدا، خواجہ محمد اشرف، بدرالزماں بدر، رضا مظہری، جمیلہ بیگم، محمودہ بیگم اور خواجہ محمد اعظم کی شخصیتیں ایسی ہیں جن کے قابل قدر ناولوں نے ارض بنگالہ کی ادبی خدمات میں نہایت وقیع توسیع کی ہے۔جہاں تک ڈرامہ نگاری کا تعلق ہے تو اس میں انڈین شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری کی بلند قامت شخصیت بنگال کا سر فخر سے اونچا کرنے کے لئے کافی ہے۔ان کے علاوہ آرزو لکھنوی، وحید النبی وحید، محمد سلیمان واصف اور راحت آرا بیگم کے بعد کمال احمد اور ظہیر انور کے ڈراموں نے بھی دائمی مقبولیت حاصل کی ہے۔اردو زبان وادب کی ترویج کے لئے ارض بنگالہ کی جانب سے کی جانے والی کوششوں کا یہ مختصر ترین جائزہ اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کردیتا ہے کہ زبان اردو کو مقبول خاص وعام بنانے میں اسکے کارنامے کسی بھی علاقے سے کم نہیں ہیں۔آج بھی سرزمین کلکتہ واطراف سے نکلنے والے مختلف رسالے اور ادبی ونیم ادبی ادارے اس کوشش میں مصروف ہیں کہ زبان اردو کو ہر دھڑکتے دل کی پکار بنادی جائے۔

اب میں اردو زبان وادب کی تشکیل میں ارض بنگالہ کے حصے کا ذکر کرتے

ہوئے یہ اعتراف کرنا چاہوں گا کہ اردو زبان وادب کی ترویج میں تو ارض بنگالہ کا حصہ بہت بڑا اور نمایاں ہے۔ اور سب اس کے معترف اور قدرداں بھی ہیں، مگر اس کی تشکیل میں اس کا کچھ خاص حصہ واثر صاف طور پر نظر نہیں آتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ جس علاقے نے اردو زبان وادب کی بے مثال خدمت کی ہے اور مسلسل اس کی ترویج وتوسیع میں مصروف رہا ہے، اس کی علاقائی زبان کے اثرات بھی اس میں منتقل ہوتے اور اردو کی تشکیل میں بھی اس کا نمایاں کردار وحصہ ہوتا مگر ایسا نہیں ہے اور عام طور پر اس کی بنیادی وجہ یہاں کی علاقائی زبان بنگالی کی اردو سے وہ دوری بتائی جاتی ہے جو بعد المشرقین کی حیثیت رکھتی ہے۔

بنگالی زبان میں ہمیں اردو کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں کہ ہم اس میں بہت سارے ایسے الفاظ موجود پاتے ہیں جو بانگ دہل یہ اعلان کرتے ہیں کہ اردو نے بنگالی زبان پر ناقابل تردید اور کثیر اثرات مرتب کئے ہیں۔ اس میں کچھ الفاظ ایسے ہیں جو اصل اردو تلفظ کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ مثلاً، درخوست، خوراک، تاریخ، زمین، میدان، خون، خبر، بدمزہ، شہر، حیران، جانور، کاہل، شروع، آب ہوا، دفتر وغیرہ۔ عربی وفارسی زبان کے یہ الفاظ بلاشبہ اردو ہی کے راستے سے بنگالی میں داخل ہوئے ہیں یہ بات اس لئے بھی حقیقت سے قریب تر ہے کہ یہ الفاظ قریبی ادوار ہی میں بنگالی میں زیادہ رائج ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں جو بنگالی زبان کے تلفظ کی وجہ سے بادی النظر میں اردو نظر نہیں آتے مگر درحقیقت وہ اردو ہی سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً چھارہ

(چہرہ)، دوپر (دوپہر)، جروری (ضروری)، دورجا (دروازہ)، آلادا (علیحدہ)، وکالتی (وکالت)، اوروجوہت (وجوہات) وغیرہ۔اس کے برعکس اردو پر بنگالی زبان کے اثرات ہمیں دکھائی نہیں دیتے،لیکن یہ پورا سچ نہیں ہے۔اصل بات تھوڑی وضاحت چاہتی ہے۔اوروہ یہ ہے کہ اردو پر بنگالی نے اپنے اثرات توڈالے ہیں مگروہ قابل ذکرنہیں رہے ہیں۔

ان اثرات میں سے ایک تو وہ ہے جواس علاقے میں رہنے والوں نے اپنے طور پرقبول کیا ہے۔ایسے ڈھیر سارے الفاظ ہیں۔مثلاً درکار، باڑی، کاج وغیرہ۔مگر یہ ادب کا حصہ نہیں بن سکے ہیں اس لئے ان کی کوئی دستاویزی حیثیت بھی نہیں ہے اور دوسرے اثرات وہ ہیں جوادب کا حصہ تو بن گئے مگراس کے باوجودانھیں بنگالی کے کھاتے میں نہیں ڈالا گیا ہے اور ہم یہ کہنے پر بظاہر مجبور ہیں کہ اردو کی تشکیل میں بنگالی نے کچھ خاص اثر مرتب نہیں کیا ہے۔اس کی بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ بنگالی دراصل ڈارڈ اور سنسکرت سے وجود میں آئی ہے۔اس میں اکثر الفاظ سنسکرت کے ہیں،مگر یہاں اس کا تلفظ اور لہجہ بدلا ہوا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ ہر وہ لفظ جوارض بنگالہ کے ذریعےاور بنگالی زبان کے راستے اردو میں داخل ہوا ہے وہ بنگالی کے بجائے سنسکرت کے حصے میں چلا گیا ہے۔

اس طرح یہ کہنا انصاف سے خارج ہوگا کہ اردوزبان وادب کی تشکیل میں ارض بنگالہ کا سرے سے کوئی حصہ ہی نہیں ہے۔میں نے بنگال میں اردو کی ترویج کا ذکر قدرے تفصیل سے بطورخاص اس لئے کیا ہے کہ ہرعالم وفاضل، ہرادیب وشاعراور ہر

مفکر و ناقد یہ سوچے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ جس علاقے نے اردو زبان وادب کی اتنی طویل اور لازمی خدمت کی ہے اس کے اثرات اردو میں منتقل نہ ہوں اور اس کی تشکیل وترتیب میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو۔ جہاں اردو نے چلنا نہیں تو دوڑنا ضرور سیکھا، جہاں اس نے جوانی کے لمبے ایام گزارے اور جس سے وہ کبھی بھی پوری طرح جدا نہیں ہوئی وہاں کے اثرات اس نے قبول نہ کئے ہوں۔ اور وہاں کے آب ودانے سے اس نے استفادہ نہ کیا ہو، یہ کیسے سوچا جاسکتا ہے۔ یہ غیر فطری اور انوکھی بات ہے۔

میں اپنی ناگزیر مصروفیات کے سبب جو بلاشبہ اسی اہم اجلاس سے وابستہ تھیں اس راہ میں زیادہ تحقیق نہیں کرسکا اور اس عنوان کا حق بھی ادا نہیں کرسکا ہوں، مگر یہ مقالہ اگر چند محققین کو اس جانب سوچنے اور کچھ جویائے علم وادب کو اردو زبان وادب کی تشکیل میں ارض بنگالہ کا حصہ ڈھونڈ نکالنے میں مصروف کرسکے تو بھی میں سمجھتا ہوں کہ میری حقیر کوشش رائیگاں نہیں گئی، بلاشبہ اردو زبان وادب کی تشکیل میں بنگال کا حصہ ہے، مگر وہ کیا ہے اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے، اور یہی اعلان اس مختصر مقالے کی دریافت اور اس کم مایہ مضمون کا حاصل ہے۔

☆☆☆☆☆

☆☆☆

محمود حسن حسنی ندوی
(رائے بریلی)

بنگال و آسام میں اردو زبان و ادب کی تشکیل

(مولانا کرامت علی جونپوری کے حوالہ سے)

بنگال و آسام یہ دو ایسے خطے ہیں جہاں انکی اپنی علاقائی زبان کا ہی پورا چلن ہے، انکے سارے کام کاج انہیں زبانوں میں ملتے ہیں۔ اپنی مادری زبان اور اس کے ادب سے محبت ہونے کا احساس طبعی ہے۔ مگر اس علاقہ میں یہ احساس کچھ زیادہ ہے، اس اعتبار سے یہ بات ایک تاریخی معمہ سے کم نہیں کہ اردو زبان یہاں کس طرح داخل ہوئی اور اندرون خانہ داخل ہوتی گئی۔ علم و تجارت اور دعوت یہ تین بڑے راستے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کے ذریعہ اردو نے اپنی جگہ ان خطوں میں بنائی۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ بنگال کے لوگ اردو سے خاصا شغف رکھتے ہیں۔ دینی معلومات وہ اردو مطالعہ سے نہ صرف حاصل کرتے ہیں بلکہ وہ اردو میں ہی اس سلسلہ میں اپنا اظہار مافی الضمیر کرتے ہیں۔ یہی صورت حال کچھ آسام کی بھی ہے۔ اور یہ دونوں خطے

ایسے ہیں جہاں مسلمان بڑی تعداد میں اور بنگال کے غیر منقسم حصہ کو لے کر بات کی جائے تو بھاری اکثریت میں بستے ہیں۔اس صورت حال کے پس منظر میں جایا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس طرح ہندوستان کے وسطی حصہ کی آبیاری خواجہ معین الدین چشتی نے کی اور کشمیر کی آبیاری امیر کبیر سید علی ہمدانی نے کی۔تو بنگال و آسام کو بھی عالموں اور داعیوں نے جا کر سینچا۔تاریخ پر نظر ڈالنے سے جو نام اس سلسلہ میں ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں اکثر و بیشتر ائمۃ المؤمنین سید المجاہدین حضرت سید احمد شہیدؒ کے خلفاء اور ان کی تحریک جہاد و اصلاح سے وابستہ افراد کے ہیں،جن میں سرفہرست حضرت مولانا کرامت علی جونپوریؒ ہیں،کہ جن کو حضرت سید احمد شہیدؒ نے کچھ وقت اپنے تکیہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلی میں رکھ کر بنگال کا رخ کرنے کی ہدایت کی تھی۔باوجود یہ کہ وہ جہاد میں حصہ لینے کے بڑے متمنی اور شائق تھے مگر آپ نے ان کے لئے دعوتی ولسانی جہاد اور قلمی جہاد کو اختیار کرنے پر معمور کیا اور انہوں نے اپنے حق میں اس فیصلہ کو مبارک جان کر اپنی تمام صلاحیتوں اور پورے تن من دھن سے اس کام کو حسن وخوبی سے انجام دینے کی ایسی مثال اور حیرت انگیز کوشش کی کہ وہ کارنامہ انجام پایا جس کی مثال خال خال نظر آتی ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ رقمطراز ہیں:

”مولانا کرامت علی جونپوری سے آپ نے بیعت لینے کے بعد ہی اول ہی ہفتہ میں فرمادیا کہ آپ ہدایت کے کام لگ جایئے ....مولانا کرامت علیؒ کو جہاد بالسیف کا ازحد شوق تھا،چنانچہ

اسی شوق میں آپ نے فن سپہ گری و شمشیر زنی کو محنت سے حاصل کیا تھا۔ جب سید صاحبؒ نے جہاد کے لئے روانگی کا قصد کیا تو مولانا مرحوم نے بھی آمادگی ظاہر کی۔ آپ نے اس کا مشورہ نہیں دیا بلکہ جہاد باللسان کے لئے حکم دیا اور فرمایا کہ تم سے خدا کو وراثت نبوی ﷺ اور تبلیغ دین کا کام لینا منظور ہے، اور تمہارے اندر اس کی استعداد و دیعت فرمادی ہے۔ تمہارے لئے یہ تبلیغی کام جہاد اکبر ہے اور تمہاری زبان وقلم میری ہدایت کی توسیع اور ترجمانی کرینگے۔ یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ مولانا کرامت علیؒ کی تبلیغ و دعوت سے بنگال کے لاکھوں آدمی ہدایت یاب ہوئے اور انہوں نے اسلام کی راہ پائی۔'' (سیرت سید احمد شہید، جلد دوم ص ۵۲۲/)

اپنے شیخ و مرشد کا ایماء پاکر آپ نے اصلاح و ہدایت کے کام میں اپنی تگ ودو لگادی۔ پچاس سال سے زائد کا عرصہ گویا تا حیات آپ دعوت و ہدایت کے کام میں مصروف عمل رہے۔ مولانا مجیب اللہ ندوی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

''مولانا نے ۷۵/ سال کی عمر پائی۔ جس میں تقریبا ۵۱/ سال بنگال اور آسام اور ان کے قرب و جوار میں دعوت و تبلیغ کا کام کرتے ہوئے گذارے۔ مولانا کے بعض بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا قدم جزائر تک بھی گیا ہے۔ اس درمیان ایک دو بار جون پور بھی آنا ہوا، مگر یہاں زیادہ مدت تک قیام نہیں رہ سکا۔ مولانا نے

اصلاح و تبلیغ کا جو وسیع کام بنگال اور آسام میں کیا اس کی پوری تفصیل ہمارے سامنے نہیں آسکی ہے، مگر بعض تذکرہ نگاروں اور بعض دوسرے بیانات سے ان کے کام کی وسعت اور سعی مشکور کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے''۔ (مقدمہ طبع جدید انوار محمدی)

خود مولانا نے اپنے کار دعوت کے میدان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فقیر کا حال تو یہ ہے کہ ہندوستان سے کلکتہ اور چاٹ گام سے سندیپ تک اور ڈھاکہ سے سلہٹ تک سارے شہر اور گاؤں میں جو دیار مشرق میں ہیں ہمیشہ سیر کرتا اور محافظت دین کرتا پھرتا ہے، اسی کام میں پچاس برس سے زیادہ مدت گذر گئی''۔ (مراد المریدین)

مولانا کے یکے از احفاد مولانا عبد الباطن صاحب مولانا کی مجاہدانہ و داعیانہ سرگرمیوں کے تعلق سے گویا ہیں کہ:

''حضرت مولانا جونپوری نے کلکتہ سے بنگال و آسام کا دورہ بذریعہ بوٹ (دخانی کشتی) شروع کیا، اس وقت ریل و جہاز کی سہولتیں جو اب ہیں بالکل نہ تھیں۔ جونپور سے کلکتہ پہونچنے میں ایک ماہ لگ گئے۔ سفر میں ہزاروں قسم کی دقتیں اور رکاوٹیں حائل تھیں۔ ہر مشکل و آزمائش کا مقابلہ مردانہ وار کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ دشمنان دین اور مخالفین شریعت راہ میں

روڑے بن کر آئے مگر سید صاحبؒ کی دعاء خاص اور مولانا کے خلوص نیت کی برکت نے تبلیغی کام میں کہیں رکاوٹ اور تزلزل پیدا ہونے نہیں دیا۔ رفتہ رفتہ دشمن درست اور مخالف شریعت پابند شریعت ہوگئے۔ مولانا کا صبح وشام کا مشغلہ ردشرک وبدعت تھا۔ جس کو تقریر وتحریر سے ظاہر فرماتے رہے۔ اس طرح ارکان دین اور احکام شریعت کو بسط کے ساتھ لوگوں کو سمجھاتے اور اس کا پابند کرنے کی کوشش کرتے۔ جس جگہ مسجد نہ ہوتی وہاں مسجد بنانے میں جدوجہد فرماتے۔ جس جگہ مدرسہ یا مکتب کی ضرورت سمجھتے وہاں مدرسہ ومکتب قائم کراتے تاکہ لوگوں میں دینی ترقی کی بنیاد مستحکم ہو اور ہدایت وتبلیغ کی جڑیں مضبوط اور دیرپا ہوں، جس کا واحد ذریعہ دینی علم اور مدرسہ ہے۔ اس ضمن میں بے شمار غیر مسلم آپ سے متاثر ہوتے اور حلقۂ بگوش اسلام ہوجاتے''۔

مولانا مجیب اللہ ندوی کا یہ استعجاب، استعجاب بے جا نہیں کہ مولانا کو تبلیغ دین اور اصلاح معاشرہ کی اتنی بڑی کامیابی کیسے حاصل ہوگئی جب کہ وہ بنگلہ اور آسامی زبان سے واقف نہیں تھے۔ مولانا اپنے استعجاب کو خود ہی دور کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''اس کمی کو دور کرنے کے لئے مولانا نے دو طریقے اختیار کئے۔ ایک تو اس دیار میں اردو زبان (جسے اس وقت عام

طور پر ہندی کہا جاتا تھا) کو رواج دیا اور لوگوں کو اسی سے مانوس کیا، اور اپنی کتابوں کے ذریعہ ان کی اصلاح کی چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی اردو اور بنگال کی شدید عصبیت کے باوجود بنگالیوں کی دینی مجلسیں اردو زبان ہی میں ہوتی ہیں"۔

دوسرے یہ کہ انہوں نے بہت سے بنگالی علماء کو اردو زبان سکھا کر اپنی ترجمانی پر مامور کیا اور بہت سے لوگوں کو دور دراز مقامات پر تبلیغ کے لئے روانہ فرمایا جو بنگالی اور آسامی زبان میں اسلام کی خوبیاں عوام کے سامنے بیان کرتے تھے۔(مقدمہ انوار محمدی)

چنانچہ افراد سازی، وعظ وتقریر، تصنیف وتحریر کے ذریعہ مولانا نے بنگال اور آسام کے لوگوں کو اعلی انسانی اقدار سے متصف کرنے کی تگ ودو کی جہاں آپ خود تشریف نہیں لے جاسکتے تھے وہاں وہ کسی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیج دیتے۔ مولانا جب بات کرتے تو پھول جھڑتے تھے۔ وہ پھول زمین پر نہیں گرنے پاتے تھے، سینے اس کو محفوظ کر لیتے تھے، دل ودماغ میں وہ جگہ بنا لیتے تھے۔ مولانا سادہ اور صاف زبان بولتے بھی تھے اور تحریر بھی کرتے تھے۔ نہ بھاری بھرکم الفاظ لاتے تھے اور نہ ہی تکلفات سے کام لیتے تھے وہ وہی طرز واسلوب اپناتے تھے جو دلنشیں ہوسکے اور بآسانی اس سے مانوس ہوا جاسکے۔ مولانا نے اس وقت اردو زبان کو رائج کرنے کا کام کیا جب عمومی طور پر لوگ ادھر متوجہ نہ تھے۔ کہنے والے نے صحیح کہا ہے کہ جہاں حضرت سید احمد شہیدؒ کے قدم مبارک پہونچے اور انکی جماعت کی تشریف آوری ہوئی وہاں

اردو نے بھی پڑاؤ ڈالا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ نے خود سورہ فاتحہ کی تفسیر اردو زبان میں لکھی، جس کو پروفیسر عبدالحلیم چشتی کراچوی اپنی تحقیق کے ساتھ شائع کر چکے ہیں، اور نماز پر ایک مختصر رسالہ لکھا جو ماہنامہ بینات کراچی میں شائع ہو چکا ہے۔ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے تقویۃ الایمان اور مولانا خرم علی بلوریؒ نے نصیحۃ المسلمین عقیدہ کے موضوع پر اور شرک و بدعت کے رد میں اردو میں لکھیں جس کا پورے ہندوستان میں ایک غلغلہ مچ گیا۔ مولانا کرامت علی صاحب جونپوری نے اردو میں متعدد رسالے اور کتابیں ایمانیات، اخلاقیات، اسلامیات کے تعلق سے لکھیں، جن میں مفتاح الجنۃ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مزید انہوں نے حدیث کے کتابوں کے تراجم اردو زبان میں کئے۔ مولانا کرامت علی صاحب جونپوری کی تحریر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو، جس میں وہ حضرت سید احمد شہیدؒ سے اپنی عقیدت و تعلق کا اظہار کرتے ہیں، اور معاشرہ کے فساد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی اصلاح کے لئے اللہ تعالی کے خصوصی نظم کو بتاتے ہیں، وہ "نور علی نور" میں لکھتے ہیں:

> "جب دین میں طرح طرح کے فساد ظاہر ہوتے ہیں تب اللہ تعالی دین کو تازہ کرنے کے واسطے ایک شخص کو پیدا کرتا ہے اور اسکے اعوان و مددگار بہت سے ہوتے ہیں۔ سو اس وقت کے مجدد صاحب طریقت حضرت امیر المؤمنین سید احمد قدس سرہ ہوئے اور انہوں نے دین کو تازہ کیا"۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تحقیق ہے کہ:

''حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کار نے عام فہم اردو زبان میں دینی واصلاحی خطاب کرنے، سہل اور روزمرہ زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعہ اصلاح عقائد و رسوم اور اصلاح معاشرہ کا وہ زبردست انقلاب انگیز اور عہد آفریں کام کیا جسکی مثال اس سے پیشتر کی اصلاحی تحریکوں میں ملنی مشکل ہے۔ انہوں نے عین میدان جنگ میں بھی شاعری کی ضرورت اور جوش آفریں کلام کے ذریعہ جذبۂ جہاد کو فروزاں کرنیکی صلاحیت کو نظر انداز نہیں کیا۔ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی "تقویة الایمان"، مولانا خرم علی بلوری کی "نصیحة المسلمین" اور انکا قصیدہ جہادیہ (جو فوجی صف آرائی کے موقع پر پڑھا جاتا تھا) اور مولانا کرامت علی صاحب جونپوری کی عقائد و دینی مسائل کی اردو کتابیں بطور مثال پیش کی جاسکتیں ہیں، جن سے لاکھوں نہیں کروڑوں انسانوں نے مجموعی طور پر فائدہ اٹھایا اور انکی زندگیوں میں انقلاب آیا''۔ [۱]

قطع نظر اس سے کہ مولانا کرامت علی صاحب جونپوری نے بنگال وآسام کا کب اور کیوں کر رخ کیا؟ یہ ایک طبعی اور فطری امر تھا کہ مولانا کرامت علی صاحب جونپوری سب سے پہلے توجہ اپنے وطن وشہر جونپور کی طرف کرتے۔ انہوں نے جونپور

---

(۱) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے یہ بات رابطۂ ادب اسلامی کے سمینار (نومبر ۱۹۸۱ء) منعقدہ ندوۃ العلماء بعنوان ''اردو ادب پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا اثر'' میں اپنے افتتاحی خطاب میں کہی تھی۔ ملاحظہ ہو کاروان زندگی حصہ سوم

کے معاملات کو بہت جلد نمٹانے کی کوشش کی ۔ اپنے مواعظ وارشادات سے توحید و سنت کی آواز گھر گھر پہونچائی۔ متعدد فرائض وارکان وشعائر اسلام کا احیاء کیا۔ مثلا جمعہ کی نماز، پنج وقتہ اذان وغیرہ کی تاکید کی۔ مدارس ومساجد قائم کئے۔ مدرسہ حنفیہ و مدرسۃ القرآن انکی خاص یادگار ہیں۔ مدرسہ حنفیہ میں مدرس اول مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی کو رکھا اور اسی مدرسہ میں علامہ عصر، فخر ہند مولانا عبدالحئی فرنگی محلی نے اپنی ابتدائی تعلیم پائی اور حفظ قرآن مجید کیا۔ پھر وہ جبل علم بن کر سامنے آئے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب کا مضمون)

خطہ بنگال میں مولانا کی کوششیں ایک حیرت انگیز کارنامہ سے کم نہیں ہیں۔ کیسے نامساعد حالات میں مولانا نے اپنے دورے کئے۔ جہاں کہیں ذرا بھی پیاس محسوس کی ادھر کا رخ کیا۔ ورنہ اپنے کسی معاون کو روانہ کیا۔ ان کا یہ جہاد قلمی ولسانی اور جسمانی تو جاری رہا ہی "وجاهدوا في الله حق جهاده"، "وجاهدوا في سبيل الله بأموالكم وأنفسكم" پر بھی عمل پیرا رہے۔ "لانسئلك عليه أجراً" کے مطابق رہا۔ آپ کہیں تنہا، کہیں جماعت کے ساتھ رخ کرتے اور خرچ کا مطالبہ وتقاضہ نہ کرتے ہوئے قرض لینا گوارہ کرتے، پھر بعد میں ان قرضوں کی ادائیگی کرتے۔ زبان وہی اردو رہتی۔ اردو سے انس وقرب وہاں اتنا بڑھ گیا تھا کہ مولانا کی کتابوں کو جو اردو زبان میں ہوتی ہیں اس پورے خطہ بنگال خصوصا آسام اور مشرقی بنگال کے حصہ میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ آسام کے تعلق سے لیا جائے تو ان کے ایک خلیفہ قاری محمد جاوید صاحب کے ذریعہ جو نفع پہونچا اسے بھلایا نہیں جاسکتا۔

سلہٹ کے رہنے والے تھے۔ ان کے صاحبزادے شمس العلماء ابونصر صاحب صوبہ آسام میں وزیر تعلیم ہوئے۔ مشرقی بنگال کے تعلق سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا یہ تأثر بالکل صحیح ہے جو انہوں نے اپنے بنگلہ دیش کے پہلے دورہ ۱۹۸۴ء کے موقع پر ایک خطاب میں ظاہر کیا تھا کہ:

''حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے خلفاء کی تحریک ودعوت کا مشرقی بنگال (ڈھاکہ اور چاٹگام) سے قدیم تعلق ہے۔ سید صاحب ہی کے ایک نامور خلیفہ مولانا کرامت علی صاحب جونپوری نے حضرت سید صاحب کی ہدایت اور ایماء سے مشرقی بنگال کو اپنی تبلیغی واصلاحی جدوجہد کا میدان بنایا اور ان کو اس میں ایسی کامیابی حاصل ہوئی جو صرف "مؤید من اللہ" داعیوں اور مصلحین کو حاصل ہوئی ہے۔ میرے کانوں نے نواب بہادر یار جنگ کو ایک تقریر میں کہتے ہوئے سنا کہ ''میری معلومات یہ ہیں کہ جن لوگوں کو مولانا کرامت علی صاحب جونپوری کے ذریعہ مشرقی بنگال میں ہدایت نصیب ہوئی یا ان کی اصلاح ہوئی ان کی تعداد دو کروڑ تک پہونچتی ہے''۔ (کاروان زندگی حصہ سوم ص ۵۴)

خلفاء واخلاف

مولانا کے خلفاء ومتوسلین میں مولانا انوار اللہ صاحب چاٹگامی مصنف شوارق ملکیہ، مولانا سید محمد رام پوری، مولانا عبدالعزیز فرید پوری، منشی نعمت اللہ صاحب احمد

پوری، مولانا احسن اللہ صاحب، حاجی عبدالرحیم صاحب ان کے علاوہ مولانا فیض اللہ صاحب نواکھالی، مولانا الٰہی بخش صاحب، مولانا عبدالقادر صاحب مصنف خلاصۃ المسائل وغیرہ جنہوں نے مولانا کے دعوتی مشن کے آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا کے خلفاء و متوسلین کے ساتھ ان کے افراد خاندان خصوصاً صاجبزدگان مولانا حافظ احمد صاحب (متوفی ۱۳۱۶ھ) اور مولانا عبدالاول صاحب (متوفی ۱۳۴۹ھ) کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں، ان حضرات کے ذریعہ بھی اردو کا اسلامی لٹریچر خوب عام ہوا۔اور باقی کسر جورہ گئی تھی بڑی حد تک ان حضرات کے ذریعہ پوری ہوئی۔مولانا حافظ احمد صاحب کی ولادت کلکتہ میں ہوئی اس زمانہ میں جب مولانا کلکتہ کو اپنا مرکز بنائے ہوئے تھے، یہ علم وفضل زہد وتقوی اور تبلیغ ودعوت میں مولانا کے نقش ثانی تھے۔مولانا مجیب اللہ ندوی کا بیان ہے:

> ''ان کے عقیدتمندوں میں ہندو، مسلمان اور عیسائی سب ہی شامل تھے، ان کے کاموں اور دوروں کی خبریں کلکتہ اور بنگال کے سارے اخبارات جلی سرخیوں سے شائع کرتے تھے۔ایک بار کلکتہ میں مولانا کے گرد دعا کرانے والوں کا غیر معمولی مجمع ہوا اور مولانا نے ہزاروں کو پانی میں کالا زیرہ دم کرکے دے دیا، جس سے نہ جانے کتنے مریض شفایاب ہوئے۔ایک شاعر نے اسی پر یہ شعر کہا۔

دکھایا اثر کالے زیرے نے جب
پرستش گئے بھول کالی کی سب [1]

---

(۱) کلکتہ میں کالی کی پرستش کی جاتی تھی اور شاید اسی لئے اس شہر کا نام کلکتہ کہا گیا۔

مولانا عبدالاول صاحب کے ذریعہ بھی بڑا فیض پہونچا اور وہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں، جن میں بعض عربی میں بھی ہیں۔آپ نے کلکتہ میں وفات پائی جہاں آپ کے بھائی پیدا ہوئے تھے اور جو آپ کے والد کا کار دعوت وارشاد کے لئے مرکز اول تھا۔مولانا کرامت علی صاحب کا کام اور مشن ان کی اولاد در اولاد منتقل ہوا اور اس خطہ سے ان حضرات کا آج بھی دعوتی وعلمی تعلق قائم ودائم ہے۔

تصنیفات وتراجم

مولانا کرامت علی صاحب علیہ الرحمۃ کو حضرت سید احمد شہیدؒ سے خلافت اس وقت ملی جب حضرت شہیدؒ سفر حج سے واپسی کے بعد ہجرت وجہاد کی مہم کا آغاز کرنے والے تھے۔اور مجاہدانہ وسرفروشانہ جذبہ سے مولانا حاضر خدمت ہوئے،اس سے قبل وہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور ان کے عم نامدار سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز سے علمی استفادہ کر چکے تھے۔روحانی تربیت اور سلوک کی تکمیل رائے بریلی میں حضرت سید صاحب شہید سے چاہی چند ہی دنوں میں بتوسط مولانا شاہ اسمٰعیل شہید خلافت واجازت پاکر دعوت وہدایت کے کام میں مصروف ہو گئے۔کلکتہ سے اپنے کام کا آغاز کیا۔مولانا کے سوانح نگاروں نے ان کی دعوتی سرگرمیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ایک کا تعلق جونپور اور اسکے گردونواح سے ہے دوسرے کا تعلق بنگال اور آسام سے ہے۔مولانا نے اس سلسلہ میں اپنی قلمی صلاحیت سے جو کام کیا اس نے ہمارے لئے اردو زبان وادب کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔حیرت ہوتی ہے کہ آج سے

دوسو سال پہلے مولانا کو اردو پر ایسی دسترس حاصل تھی کہ ان کی اس وقت کی تحریر آج بھی تازہ معلوم ہوتی ہے۔ان کے ذخیرۂ تصنیفات وتراجم میں **"انوار محمدی"** اس سلسلہ میں خاص طور سے قابل ذکر ہے۔یہ حدیث کی مشہور کتاب شمائل ترمذی کا ترجمہ وشرح ہے جس کو مولانا نے شوال ۱۲۵۲ھ میں مطبع محمدی سے کلکتہ میں چھپوایا تھا،بقول مولانا مجیب اللہ ندوی:

> "اس کتاب کے ذریعہ نہ صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل کی ترویج ہوئی بلکہ اس سے اردو زبان کو بھی غیر معمولی فائدہ پہونچایا۔سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے مسلمانوں میں جو شیفتگی ہے اس کے نتیجہ میں یہ کتاب عوام اور خواص دونوں میں بار بار پڑھی گئی اس طرح اس کے ذریعہ حدیث نبوی اور اردو زبان دونوں کا ذوق ہندوستان میں عام ہوا۔خود ہندو شعراء نے حمد ونعت میں جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ تر اسی طرح کی کتابوں سے ماخوذ ہے"۔ (از مقدمہ انوار محمدی)

مولانا کا دور وہ دور ہے جسے اردو نثر کا چوتھا دور کہا جاتا ہے۔یعنی ۱۸۳۰ء سے ۱۸۷۰ء کا زمانہ جس میں ہندوستان نے اردو کو ممتاز نثر نگار وسخن آور دیئے۔اس وقت ہندوستان کے افق پر ایسے باکمال اصحاب علم وفن اور ارباب زبان وادب تھے،جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔اس دور سے ملحق دور یعنی اسکے ماسبق اور مابعد عہد کو لے کر بات کی جائے تو اس پورے زمانے کا جو اردو زبان کا وادب پورا ذخیرہ پایا جاتا ہے چند استثنیات کے ساتھ دیکھا جائے تو اردو زبان کو کوئی سنجیدہ لٹریچر اور صالح

ادب فراہم نہ کیا جا سکا۔ ان حالات میں مولانا کرامت علی صاحب علیہ الرحمہ کی ترجمہ وتصنیف کے زاویہ سے خدمات نہ صرف لائق تحسین نظر آتی ہیں بلکہ ان کو دیکھ کر اور پڑھ کر اس عہد کی زبان وبیان کی داد دینی پڑتی ہے۔ اور لکھنے والے کو یہ لکھنا پڑتا ہے کہ ''ان کی مذہبی کتابوں اور خاص طور پر شمائل ترمذی کے ترجمہ اور اس کی شرح میں سلاست اور روانی اور زبان کی صفائی کی جو خوبیاں موجود ہیں اس عہد کے ناول اور افسانہ اور طوطا مینا کی کہانی لکھنے والوں کی کتابوں میں اس سے زیادہ خوبیاں نہیں ہیں بلکہ بعض گھٹیا نمونے ہیں مگر افسوس ہے کہ مولانا اور ان کے دوسرے معاصر علماء کی اردو نثر کی خدمات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے''۔

مولانا نے مشکوۃ شریف کا بھی ترجمہ کیا، مگر یہ اسوقت نایاب ہے۔ تصنیفات میں ان کی چند کتابیں عربی میں بھی ہیں مگر اکثر اردو میں ہیں، جن میں مفتاح الجنہ زیادہ مشہور اور متداول رہی۔ اسکے متعدد ایڈیشن نکلے۔ پہلی بار ۱۲۴۳ھ میں چھپی پھر ۱۴۔۱۵ برس کے اندر ہی اس کے چار پانچ ایڈیشن شائع ہو گئے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ اس کے قلمی نسخے بھی پھیلتے رہے۔ جن مقاصد کے پیش نظر اس کتاب کی تالیف عمل میں آئی تھی اس کا بڑا مقصد دین کی اشاعت اور نجات کا راستہ بتانا تھا۔ ان دنوں اس کا نیا ایڈیشن ان ہی کے خانوادہ کے ایک بزرگ وعالم مولانا ظفر احمد صاحب مدظلہ کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

مولانا کرامت علی صاحب کی ان علمی، دینی وادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے صوبہ بنگال جو اس وقت منقسم نہیں ہوا تھا آسام کے باشندگان نے مولانا کا ساتھ

دیا۔ان کی آواز پر لبیک کہا ان کی زبان کو سمجھنے کی کوشش کی، ان کی قربانیوں کا اعتراف کیا، ان کی تحریروں کو عام کیا، ان کی تقریروں پر کان دھرا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کا گڑھ کہے جانے والے علاقے جیسے دہلی، لکھنؤ، لاہور، حیدرآباد اس اردو لٹریچر کی فراہمی نہیں کر پا رہے تھے تو اس دور میں کلکتہ اردو کی خدمات میں مصروف تھا۔

اللہ تعالی کو مولانا کے ذریعہ رشد و ہدایت کا ایک عظیم کام لینا تھا اس کے لئے جن اوصاف و خصوصیات کی ضرورت پڑتی ہے وہ اللہ نے ان کی ذات میں ودیعت فرمادی تھیں۔مزید کرامات اور خوارق عادات باتوں کا ان سے وقتاً فوقتاً ایسا صدور ہوتا تھا، کہ دین سے بالکل بے بہرہ بلکہ متنفر شخص بھی اپنی رائے بدلنے، اپنی فکر میں تبدیلی لانے اور اپنے عقیدہ کو درست کرنے پر مجبور ہو جاتا۔مولانا کا نام علی تھا چونکہ مولانا سے اس عہد میں بہت سی کرامات کا ظہور ہو چکا تھا اس لئے وہ کرامت علی کے نام سے مشہور ہو گئے، اور لفظ ''کرامت'' نام کا ایسا جزء بنا کہ اصل نام اور علی جزء معلوم دینے لگا۔مولانا جونپور کے محلہ ''ملاٹولہ'' میں ایک علمی گھرانہ میں پیدا ہوئے۔وہ ایک بہترین خطاط، ماہر قاری، ممتاز فقیہ اور کہنہ مشق مصنف وادیب تھے۔خطاطی میں انہیں اس قدر مہارت تھی کہ ایک چاول یا ایک چنے پر پوری سورہ اخلاص لکھ دیا کرتے تھے۔حضرت سید احمد شہیدؒ سے استفادہ کا حال انہوں نے اپنی کتاب "نور علی نور" میں لکھا ہے۔جود و سخاء، زہد و تقوی، ہمت و جرأت، صداقت و شجاعت، جوش ایمانی اور حرارت اسلامی، عزیمت پر عمل کتاب و سنت کی پیروی میں وہ سلف کی بہترین یادگار تھے، وہ جہاد بالسیف کو اختیار کرنا چاہتے تھے۔اپنے شیخ و مرشد کے حکم سے جہاد بالقلم اور جہاد باللسان اختیار کیا۔اور اس کے لئے انہوں نے وہ وہ صعوبتیں

اٹھائیں اور وہ وہ مخالفتیں سہیں کہ جنہیں برداشت کرنا بغیر تائید الٰہی کے ممکن نہیں۔مولانا جونپوری نے اپنی ذاتی عزت ووجاہت کو خیر باد کہہ کر بنگال وآسام کے گاؤں گاؤں کی خاک چھانی یہاں تک کہ صدائے ایمانی کو اہل بنگال وآسام کے دل کی گہرائیوں تک پہنچادیا۔اوراسی دیار غیر میں یہ مبارک کام انجام دیتے ہوئے ۳ /ربیع الاول ۱۲۹۰ھ کو بمقام زنگ پور وفات پائی۔

خدمات کا اعتراف

ان کی خدمات کا اعتراف مختلف طبقات کے لوگوں نے کیا ہے۔"بنگال میں اردو" کے مصنف نے لکھا ہے کہ:مشرقی بنگال میں اردو کے شیدائی مولانا کرامت علی صاحب نے مذہبی واصلاحی موضوعات پر بیشتر مفید کتابیں لکھی ہیں"۔(ص ۲۹)

"مشاہیر جونپور" کے مصنف نے اعتراف کیا ہے:

"اسلام کی اشاعت میں انہوں نے پورے طور پر کمر ہمت باندھی اور پھر پوری زندگی اس کار عظیم میں صرف کردی"۔

تذکرہ علمائے ہند کے مصنف کہتے ہیں:

"بنگال کے لاکھوں آدمی ان سے مستفیض ہوئے اور اس دیار میں ان کی برکت وسعادت سے اسلام کی خوب اشاعت ہوئی"۔

محمد اجمل خاں ایم اے اپنی کتاب "خواجہ معین الدین چشتی" میں لکھتے ہیں:

"زوال سلطنت اسلامیہ کے باوجود بلکہ اس کے بعد کثرت سے مسلمان ہونا شروع ہوگئے کہ مشرقی بنگال پورا پورا مسلمان ہو چکا

ہے۔ یہ کوشش صرف جونپور کے ایک بزرگ کی تھی جنہوں نے تھوڑے ہی دنوں میں ایک کروڑ سے زیادہ غیر مسلموں کو مسلمان بنادیا۔ آپ کا نام نامی مولانا کرامت علی جونپوری تھا''۔

مشہور عالم دین وممتاز محقق ومصنف مولانا مجیب اللہ ندوی مدیر''الرشاد''اعظم گڑھ مولانا کرامت علی صاحب جونپوری کے متعلق اپنے ایک تفصیلی مضمون میں ان روایات کا ذکر کرتے ہوئے جن میں ان کے ذریعہ ہدایت یافتگان کی تعداد کا ذکر کیا گیا ہے رقمطراز ہیں کہ''یہ تو واقعہ ہے کہ مشرقی بنگال کو مسلمان صوبہ بنانے میں مولانا کی کوششوں کا بڑا دخل ہے''۔ مولانا کی اس بات پر تعلیق کرتے ہوئے یہ بات کہی جائے کہ یہی بات آسام پر صادق آتی ہے کہ وہاں مسلمانوں کی اکثریت مولانا ہی کی سعی بلیغ کا نتیجہ ہے تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ(اردو) پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد ۱۷/ میں جناب عبداللہ یوسف علی صاحب کے قلم سے مولانا کی خدمات اور کارناموں کا تعارف کرایا گیا ہے۔ انہوں نے مولانا کرامت علیؒ کا حضرت سید احمد شہیدؒ سے خصوصی تعلق کا ذکر کیا ہے۔ مگر حیرت ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ انہوں نے یہ خلاف واقعہ بات کیسے لکھ دی کہ حضرت سید صاحب کی شہادت کے بعد ان کے معمر استاد شاہ عبدالعزیز ان کے خلیفہ ہوئے اور بہار و بنگال میں تجدید اسلام کی تحریک بڑی سرگرمی سے شروع ہوئی۔ اس پرامن تحریک میں کرامت علی بھی بدل وجان شامل ہوئے۔ یہ بات اس لئے صحیح نہیں کہ شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ علیہ کی وفات ۱۲۳۹ء میں ہوگئی تھی۔ اور حضرت سید صاحب کی شہادت ۱۲۴۶ھ میں ہوئی۔ بہار و بنگال حضرت سید صاحب خود تشریف لے گئے

اور پھر اپنے خلفاء کو ان جگہوں پر مقرر کیا۔ البتہ ان کی یہ بات مولانا کرامت علی کے تعلق سے بالکل بجا ہے کہ ''انہیں اس تحریک کا سب سے کامیاب حامی اور داعی کہا جا سکتا ہے۔ اور یقیناً وہ اس تحریک کے لائق ترین نمائندے تھے''۔ اس بات میں بھی وہ حق بجانب ہیں کہ ''مولانا کرامت علی صاحب کے متبعین کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ بنگال میں بمشکل کوئی ایسا گاؤں ہوگا جہاں ان کے شاگرد نہ ہوں''۔ یورپین مصنفین پر ان کی تنقید بجا ہے کہ ''مولانا کرامت علی صاحب کے جو حالات یورپی مصنفین کے یہاں ملتے ہیں وہ غیر تسلی بخش ہیں''۔ ان کی تصنیفات کے تعلق سے دس کتابوں کا تعارف کرا کے ۴۶ رکا اشارہ دیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی تصنیفات زیادہ تر اردو میں ہیں۔ مولانا عبدالحی حسنی نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب جو ہندوستانی رجال کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ نزھتہ الخواطر میں بڑے بلند الفاظ میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اور بتلایا ہے کہ بنگال کے خطہ میں ان سے ہدایت وارشاد اور اصلاح و تربیت کا کام انجام پایا۔ کس طرح مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے کاروان ایمان وعزیمت میں آپ کی خدمات اور کارناموں کو مزید اجاگر کیا ہے، جبکہ مولانا واضح رشید حسنی صاحب ندوی نے اپنی زیر طبع عربی تصنیف الامام احمد بن عرفان الشهيد میں آپ کا تعارف کرایا ہے۔ کشکول باطن از مولانا عبدالباطن صاحب جونپوری اور سوانح مولانا کرامت علی جونپوری از مولانا ظفر احمد صاحب جونپوری بھی مفید مراجع ہیں، مگر مولانا مجیب اللہ ندوی مدیر الرشاد و ناظم جامعة الرشاد اعظم گڑھ کا خراج عقیدت ان کی تحریر میں ہی نہیں ان کے متعلق تمام تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔

شریف احسن مظہری
(رانچی)

خطۂ جھارکھنڈ میں اردو زبان وادب کا ارتقاء

گھنے جنگلات اور اونچی نیچی پہاڑی وادیوں پر مشتمل خطۂ جھارکھنڈ جو جغرافیائی لحاظ سے ملک کے میدانی علاقوں سے مختلف ہے وہیں تہذیبی، ثقافتی ولسانی اعتبار سے بھی یہ خطۂ ارض ملک کے دوسرے علاقوں سے کافی الگ ہے۔ ہزاروں سال سے یہ علاقہ ملک کے قدیم باشندوں کول، منڈا اور سنتھال آدیباسی قبائل کا مسکن رہا ہے۔ جو اپنی زبان، اپنی تہذیب وثقافت کے ساتھ ساتھ جداگانہ شناخت رکھتے ہیں، یہاں بولی جانے والی زبانوں میں منڈاری، کڑوکھ اور ناگپوری یا سادری خاص ہیں جو لسانی نقطۂ نظر سے دراوڑ، آریان اور پروٹو آسٹرولائڈ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ منڈاری اور کڑوکھ زبانیں دراوڑ نسل سے تعلق رکھتی ہیں تو ناگپوری کا تعلق ہند آریائی نسل کی

زبانوں سے ہے، اور یہی وہ زبان ہے جو اس پورے خطے میں رابطے کی زبان مانی جاتی ہے۔ یہ زبان موجودہ ریاست جھارکھنڈ کے بیشتر علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور تھوڑے سے فرق کے ساتھ الگ الگ ناموں سے پہچانی جاتی ہے۔ مثلاً اسے متصل علاقوں میں پنچ پرگنیا کہا جاتا ہے تو ہزاری باغ، گریڈیہہ اور دھنباد کے علاقے میں اسے کھورٹھا سے موسوم کیا جاتا ہے۔ رانچی، سنگھ بھوم، لوہردگا، گملا اور پلاموں کے اضلاع میں یہ سادری زبان کے نام سے رائج ہے۔

ناگپوری یا سادری زبان دراصل غیر آدیباسیوں کی زبان ہے اور مگہی یا بہاری زبان کا اس پر کافی اثر رہا ہے مگہی زبان کے اثرات، تاریخی شہادتیں کافی قدیم ہیں۔ اختر اورینوی کے تحقیق کے مطابق خاص مگہی زبان کا قدیم ترین نمونہ رام گڑھ کے پہاڑ کے ایک غار میں ملتا ہے۔ اس غار کو جوگی مارا کہتے ہیں یہ چھوٹا ناگپور کی سرگجا ریاست میں واقع تھا، اسی طرح دھنباد کے گوبند پور علاقے سے بھی دستیاب قدیم کتبوں سے مگہی زبان کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے، یہ تمام شہادتیں قبل مسیح کی ہیں اس سے یہ بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ناگپوری زبان کی تشکیل میں مگہی زبان کا عمل دخل کافی گہرا رہا ہے۔

ناگپور زبان کو ادبی معیار و مرتبہ سے روشناس کرانے میں غیر مسلم شاعروں اور تخلیق کاروں کے ساتھ بہت سے مسلم شاعروں نے بھی گنواروں کی اس بولی کو ادب آشنا کرنے میں اپنا تخلیقی جوہر کے کرشمے دکھائے ہیں اگرچہ ان میں سے بیشتر نے لوک گیتوں اور رقص و سرود کی محفلوں کو گرم کرنے کے لئے اپنی سطحی جذبات کا ہی اظہار

کیا ہے لیکن ان میں بعض ایسے شاعر اور تخلیقی کار بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اس زبان کو بھی مشرف بہ اسلام کر کے کوئلے کی کانوں سے نکلنے والی اس زبان کو شعور سفید پوشی سے آشنا کیا ہے ان میں رحمت اللہ رحمت، ناگپوری زبان کے وہ مایہ ناز شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف اس ناگپوری زبان کو زیور اسلام سے آراستہ کیا بلکہ بعض ایسی انقلابی نظمیں بھی تحریر کیں جنہیں پڑھ کر مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن ندوی، مولانا ابواللیث اصلاحی اور مولانا مجیب اللہ ندوی جیسے علمائے عصر سے بھی داد تحسین حاصل کی خصوصاً ان کی یہ نظم کافی مقبول ہوئی۔

ایکھن ہمن جوان ہی
گرب ہولے چٹان ہی
اٹھپ ہولے طوفان ہی
ایکھن ہمن جوان ہی
ہاں توپ کر زبان ہی
ہمالہ کر چڑھان ہی
ایکھن ہمن جوان ہی

یا پھر انسانیت کی جو موجودہ پستی پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے انسانیت پر جو طویل مرثیہ لکھا ہے وہ کسی زمانے میں زبان زد خاص وعام تھی۔ نمونہ کے طور پر یہاں چند اشعار پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

وہ رے کہاں گرل انسان
دھرتی گوٹے تھر تھر کانپے

گرک میں ہے آسمان
ڈگک ڈگک پاپک نیا
بیچ پڑل طوفان
پھر بھی ادمی نیندک ماتل
سوتل ہے انجان
وہ رے کہاں گرل انسان

(افسوس کہ انسانیت کہاں گر چکی ہے) رحمت اللہ رحمت نے نہ صرف شعر وشاعری کے ذریعہ اسلامی افکار ونظریات کو عام کرنے کی کوشش کی بلکہ ''مورل پاچھے جنگی'' کے نام سے ایک مختصر کتابچہ بھی تحریر کیا ہے، جو تصور آخرت کو ناگپوری زبان میں پیش کرنے کی پہلی کوشش تھی۔ اگر چہ ناگپوری زبان کا ادبی سرمایہ دیوناگری رسم الخط میں موجود ہے لیکن رحمت اللہ رحمت نے اپنی تخلیقات کو فارسی رسم الخط میں تحریر کر کے اسے دکنی یا گرجری کی طرح اردو کی ایک شاخ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جھارکھنڈ کی اس مقبول ترین زبان کے رگ وپے میں اردو وفارسی کے بے شمار الفاظ تازہ خون کی طرح دوڑ رہے ہیں۔

جن مسلم فنکاروں نے ناگپوری زبان وادب کی ترویج میں اہم کردار ادا کیا ہے ان میں مولانا آزاد کے ایک رفیق شیخ علی جان کی تخلیقات بھی کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ لیکن شیخ علی جان کی تخلیقات کا دائرہ بھی لوک گیتوں تک ہی محدود رہا۔ ان کی تصنیفات میں ڈمکچ ۳۶ ؍رنگ، ناگپوریہ ۳۶ ؍رنگ اور بھگوا گیت ۳ ؍جلدوں میں آج بھی دستیاب ہیں۔ شیخ علی جان نے بھی اس زبان کو اردو زبان وادب سے قریب تر

کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

پلاموں سے راج محل تک اس وادی کوہ بیاباں کی ادبی دبستانوں سے دوری اور دشوار گزار پہاڑی راستوں نے شاید عندلیبان اردو ادب کو قدرت کی اس حسین وادی میں نغمہ سرائی سے باز رکھا یہی وجہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی چاشنی سے یہ علاقہ بہت دیر میں آشنا ہو سکا۔ اگر چہ سقوط جون پور کے بعد ہی اکا دکا مسلمانوں نے اس علاقہ میں آنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن محمد شاہ کے عہد تک ایک بڑی تعداد یہاں آ کر آباد ہو چکی تھی جن میں ٹھیکیدار، پیشہ ور، فوجی اور کچھ خاص جاگیردار بھی تھے، یہی وہ دور تھا جب اردو نے اس پہاڑی خطے میں بھی اپنی باقاعدہ حسن و جمال اور شکل و شباہت کے جلوے بکھیرنے شروع کر دئے۔ لیکن اردو کا یہ خاموش قدم تھا اسکے لئے کوئی تحریک نہیں چلائی گئی تھی، بقول رشید احمد صدیقی ''یہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں وجود میں آئی لیکن اس کو شروع کرنے اور ترقی دینے یا اس کو کسی کے سر تھوپنے میں نہ مسلمان حکمرانوں کا دخل رہا ہے نہ مسلمان باشندوں کو، یہ وقت کے نئے ناگریز طبعی لسانی اور سماجی تقاضوں کی پیداوار ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ بغیر کسی کوشش کے ملک کے دور دراز خطوں میں پہنچی اور مقبول ہوئی۔ دوسری زبانوں کو یہ بات اب تک نصیب نہیں ہوئی تھی''۔

رشید احمد صدیقی کے مذکورہ قول سے اتفاق کے باوجود اردو زبان و ادب کو بعض جاگیرداروں کی سرپرستی ہمیشہ حاصل رہی۔ چنانچہ خطہ جھارکھنڈ کے جن جاگیرداروں کی سرپرستی اسے ابتداء ہی سے حاصل رہی۔ ان میں پلاموں (حسین آباد) اور رست گاواں کے جاگیرداروں کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ حسین آباد کے

اورسیرۃ المتاخرین کے مؤلف نواب ہدایت علی خاں ایک علم دوست انساں تھے ۔ان کی ادبی وعلمی خدمات سے تو دنیا واقف ہے لیکن اس خانوادے سے علم وادب کے ایسے متعدد لعل وگہر پیدا ہوئے جنھوں نے زبان وادب کے گیسوسنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔انسائیکلوپیڈیائی ذہن کے مالک اور کاشف الحقائق کے مصنف مولانا امام امداد اثر کا نانیہالی رشتہ بھی اسی خانوادے سے تھا۔

اردوزبان وادب کے ارتقاء وتشکیل میں صوفیانہ کلام،ملفوظات ومکتوبات کو بنیادی وکلیدی اہمیت حاصل رہی ہے۔مناظر فطرت سے بھرپور جھارکھنڈ کی اس حسین وپرسکون وادی میں بھی متعدد صوفیائے کرام نے درس وارشاد کی مسندیں بچھائیں۔بندگان خدا کو دولت ایمانی سے بھی مالا مال کیا اور تہذیب وثقافت زبان وادب کی بساط کو بھی وسیع تر کیا۔لیکن بدقسمتی سے ان کے ناموں اور مزاروں پر سالانہ اعراس کے سوا مرتب شکل میں ان کی خدمات کے شواہد اب تک ناپید ہیں۔لہذا ان میں بعض کے ناموں کے ذکر پر یہاں اکتفا کیا جاتا ہے۔جھارکھنڈ کے دشت ودمن میں جن صوفیائے کرام نے وحدت ومحبت کے ترانے گنگنائے ہیں،ان میں حضرت دکھن شاہ بابا (لوہردگا) حضرت شاہ علی داتا (پلاموں) شاہ بابا (پلاموں) حضرت داتا مدارشاہ (جمشید پور) منیر شاہ بابا (دھنباد) مشیح الدین غازی (ہزاری باغ) چوڑی بابا لاہوری (گریڈیہہ)۔

حضرت قطب الدین مدراسی عرف رسامدار باباج کا مزار رانچی کے ڈرونڈہ میں موجود ہے۔بعض روایتوں کے مطابق ان کی تعلیمات سے اس علاقے کی متعدد آبادیاں مشرف بہ اسلام ہوئیں لیکن ان کے ملفوظات ومواعظ کی تحریری شواہد بھی

دستیاب نہیں ہیں۔

۱۹۳۲ء میں جب برٹش حکومت نے بعض انتظامی ضروریات کے پیش نظر اس علاقے کو آزاد انتظامی علاقہ قرار دے دیا تو عدلیہ انتظامیہ اور دیگر سرکاری محکموں کے قیام عمل میں آئے۔ چونکہ سرکاری کام کاج کی زبان اردو تھی اس لئے ملازمین کی شکل میں متعدد اصحاب علم وفن نے اس علاقے کا رخ کیا۔ اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے زبان وادب کی آبیاری کی۔

۱۸۵۷ء کے خوں چکاں واقعات نے جب دلی، لکھنؤ اور عظیم آباد کی سرزمین کو خون شہیداں سے لالہ زار کر دیا تو بہت سے لوگوں نے نقل مکانی اور مہاجرت کی راہ اختیار کی، تلاش معاش اور پرسکون ماحول کی جستجو میں بڑی تعداد میں لوگوں نے چھوٹا ناگپور کی پرسکون وادیوں میں پناہ ڈھونڈی۔ ان میں کچھ صاحب علم وفن بھی تھے اور زبان وقلم کے دھنی بھی، ان نو واردین کے اثر سے یہاں کے ادبی ماحول میں بھی ایک انقلاب برپا ہوگیا۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر بندی خود موصوف کے لئے سزا رہی ہو لیکن اس خطے کے لئے ان کی یہ اسیری کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی، اگرچہ مولانا کی مدت قیام محض پونے چار سال رہی، لیکن اس مختصر سی مدت میں انہوں نے بعض قومی وملکی سرگرمیوں کے ساتھ ہی بالواسطہ طور پر زبان وادب کی جو بنیادیں قائم کیں، اس نے میں کاروان ادب کے لئے بھی مشعل راہ کا کام کیا۔ مولانا آزاد نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف تذکرہ اردوئے مبین کی شاہکار، ترجمان القرآن اور جامع الشواہد کی تصنیف

رانچ کے مضافات میں مورابادی کی انہیں پہاڑیوں پر بیٹھ کر کی جس کی ایک چوٹی پر بیٹھ کر رابندر ناتھ ٹیگور نے گیتانجلی کے بعض حصوں کی تخلیق کی تھی۔ مولانا خود فرماتے ہیں:

''یہ تمام علاقہ ہندوستان کی وحشی اقوام کا مسکن ہے جو کول، اراؤں، منڈاناموں سے مشہور ہیں، اس گاؤں میں بھی تمام تر وہی لوگ آباد ہیں۔ صرف چار پانچ بنگلے چند بنگالیوں نے بنالئے ہیں کبھی کبھی گرمیوں میں آکر رہتے ہیں۔ انہیں میں سر رابندر ناتھ ٹیگور مشہور بنگالی شاعر کا خاندان بھی ہے اور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر آباد ہے۔ ایک مدت سے جس فراغ خاطر اور آزادئ فکر وعمل کو طبیعت ڈھونڈتی تھی مگر اشغال وعلائق کی کثرت سے نہیں ملتی تھی حتی کہ اس کی وجہ سے صحت جسمانی نے بھی جواب دے دیا تھا۔ اب ملی بھی تو کس بھیس میں۔ دنیا نے جلاوطنی اور نظر بندی کی خبر سنی اور دل نے خلوت گزینی اور گوشہ گیری کی دولت وسعادت پائی اس خلوت گزینی اور گوشہ گیری کی دولت وسعادت کو مولانا نے کس طرح استعمال کیا اسکا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''الحمد للہ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک نہ کوئی صدا ذوق سماع میں مخل ہے اور نہ کوئی منظر مشغولیت میں حارج، غالب وقت تصنیف وتالیف میں صرف ہوتا ہے، کہ تمام تر کتاب

عزیز وسنت مطہرہ کی شرح وتفسیر پر مشتمل ہے۔اس سے جس قدر مہلت ملتی ہے وہ بھی ضائع نہیں جاتی،میدان دور دور تک ہیں اور پہاڑ چاروں طرف''۔

تصنیف وتالیف کی مصروفیتوں کے باوجود انجمن اسلامیہ رانچی اور مدرسہ اسلامیہ کے قیام سے مولانا نے علم وآگہی کا جو چراغ جلایا اس کی روشنی سے وحشی اقوام کا یہ مسکن بھی آشنائے علم وادب ہوا۔

محترم حضرات!

چھوٹا ناگپور یا جھارکھنڈ کے اس دور افتاد خط میں اردو زبان وادب کی تشکیل وارتقاء میں جن افراد نے بیش بہا خدمات انجام دیں ان کی فہرست کافی لمبی ہے لیکن ہم طوالت کے خوف سے محض چند ادبی وعلمی شخصیات کے عظیم کارناموں کا محض اجمالی ذکر کر کے ساتھ ہی اپنی بات کو ختم کرنا چاہیں گے۔

اردو کے معروف افسانہ نگار اور نقاد اختر اورینوی اپنی طویل مدت قیام (اٹکی) کے دوران نہ صرف اپنے افسانوں کے ذریعہ اردو ادب کے ذخیرے میں اضافہ کیا بلکہ ادب کو تحریک کی شکل دینے میں قابل ذکر خدمات انجام دیں۔اختر اورینوی نے اپنے افسانوں خاص طور پر ''کلیاں اور کانٹے'' اور ''سنگھوریم کا فقیر'' میں جو پلاٹ تیار کیا ہے اور کردار پیش کئے ہیں وہ اٹکی کے ہی اطراف میں گردش کرتے نظر آتے ہیں۔

چھوٹا ناگپور میں اردو کی تحریک کو عام کرنے میں سہیل عظیم آبادی کی تاریخی خدمات رہی ہیں۔اور زبان وادب کے ارتقاء کا کوئی بھی باب ان کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔انہوں نے اردو مرکز کے ذریعہ اس علاقے کے قبائلی آبادی میں اردو کی تعلیم کو

عام کرنے کے لئے جو بیش بہا خدمات انجام دیں خود انہیں کی زبان میں ملاحظہ فرمائیے:

"بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ہدایت کے مطابق میں نے رانچی میں اردو مرکز قائم کیا اور آدی باسیوں میں اردو میں اردو زبان کو پھیلانے اور مقبول بنانے کا کام شروع کیا اس وقت چھوٹا ناگپور میں اردو کا چلن کم تھا صرف مسلمان ہی اردو پڑھتے تھے، صرف سرکاری دفتروں میں اس کی رسائی نہیں تھی اور تعلیم بھی کم تھی، البتہ وہاں عیسائی آبادی میں تعلیم عام تھی، عیسائی مشن کررہے تھے، لیکن عیسائی مشنوں نے اپنی مصلحتوں کی بنا پر ذریعہ تعلیم ہندی کو بنا رکھا تھا۔ یہ میرے لئے بڑے مشکل کی بات تھی لیکن چند ہی دنوں میں میری یہ مشکل آسان ہوگئی۔ میرے ایک عیسائی ملاقاتی مسٹر تھیوڈا منجنی نے بتایا کہ دو آدی باسی خواتین ہیں، جنہوں نے اردو پڑھی ہیں۔ یہ خبر میرے لئے قدرتی طور پر خوش کن تھیں"۔

ان دونوں آدی باسی بہنوں کی مدد سے سہیل عظیم آبادی نے اردو کو آدی باسی اقوام میں عام کرنے کے لئے گھر گھر جا کر انکے لڑکے اور لڑکیوں کو اردو پڑھنے پر آمادہ کیا اور ان کی کوششوں سے جو نتائج برآمد ہوئے اسے دیکھنے کے لئے خود بابائے اردو مولوی عبدالحق رانچی تشریف لائے۔

خوشگوار ماحول اور مناسب آب و ہوا مہاجر پرندوں کو بھی ہزاروں میل کی مسافت طے کرنے پر مجبور کردیتی ہیں۔ جس سے خود اس علاقے کا قدرتی حسن بھی

دوبالا ہوجاتا ہے۔ چمنستان جھارکھنڈ کے خوشگوار ادبی ماحول نے بھی مرغان علم وادب کو اپنی طرف مائل کرنے کا کام کیا اور ملک کی عظیم ادبی شخصیات نے یہاں آکر ادب کے قافلے کو آگے بڑھانے کا کام کیا۔ مشاعروں کے شرکاء سے قطع نظر پروفیسر آل احمد سرور، معین احسن جذبی، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم کرہانی، مظہر امام، جمیل مظہری اور ڈاکٹر عبدالمغنی کا نام قابل ذکر ہیں۔

ریاست جھارکھنڈ میں اردو کی تشکیل و ارتقاء غیاث احمد گدی اور الیاس گدی کے افسانوی ادب کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں کے مدارس دینیہ، اخبارات و رسائل، شعراء وادباء کی ادبی ولسانی خدمات کو اس مختصر مقالہ میں سمونا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہوگا۔ آج ملک کے دیگر علاقوں کی طرح ہی اردو مخالف ماحول میں بھی زبان وادب کا قافلہ جھارکھنڈ میں بھی رواں دواں، اور اس قافلے میں رونق شہری، شان بھارتی، اسلم بدر، منظر امام، پرکاش فکری، سید احمد شمیم، نام بلخی، شعیب راہی، ظہیر غازی پوری، احمد سجاد، ابوذر عثمانی اور وہاب دانش (جو ابھی خدا کو پیارے ہوچکے) جیسے شعراء وادباء شامل ہیں۔ دوسری طرف دارالعلوم ندوۃ العلماء ودارالعلوم دیوبند اور ملک کے دیگر مدارس و دانشگاہوں کے فضلاء کے ذریعہ قائم کئے جانے والے مکاتب و مدارس اردو زبان وادب کی زندگی کی ضمانت بن کر ابھر رہے ہیں۔

سید مشتاق علی ندوی
(بھوپال)

اردو زبان وادب کی تشکیل میں بھوپال کا حصہ

شہر بھوپال اردو کا گڑھ، اردو تہذیب وتمدن کا مرکز اردو شعروادب کا گہوارہ، تعلیم وتعلم کا خطہ، ماضی سے حال تک اردو کی خدمت گذاری میں اپنی نمایاں پہچان اور قابل فخر شناخت رکھتا ہے۔اس سرزمین نے ماضی میں اس شیریں زبان کو حکومت کی زبان قرار دے کر تاج اور تخت سے حکومت اور سلطنت سے، شان وشوکت، خلوص اور محبت سے مالا مال کیا۔جس کے نتیجہ میں یہاں شعروشاعری کی خوبصورت محفلیں جمنے لگیں، ادب اور ادیب کی، منفرد مجلسیں آراستہ ہونے لگیں۔اسی وجہ سے یہاں عہد رفتہ میں سرسید، شبلی، امیر مینائی، سرراس مسعود، نیاز فتح پوری، عبدالسلام ندوی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا مودودی، علامہ اقبال، عبد الرحمان بجنوری، علامہ محوی

صدیقی، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین، جگر مرادآبادی اور ڈاکٹر گیان چند وغیرہ نہ جانے اردو کے کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب آتے رہے اور اس سرزمین کو اپنے علم وعرفان، آگہی وباخبری، تجربات ومشاہدات سے سیراب کرتے رہے، تو کوشی ومسرت، سکون طمانیت واعتماد کی دولت سے فیضیاب بھی ہوتے رہے ہیں۔

آج بھی یہ خطہ سرزمین ماضی کی ان تمام روایات کی امین بنی ہوئی ہے اور مکتلف پہلوؤں اور گوشوں سے اسے وسعت بھی دے رہی ہین، گہرائی وگیرائی سب عطا کر رہی ہے، خاص طور سے جہاں تک زبان وادب کا مسئلہ ہے اور اسکی خدمات کا تقاجہ ہے اس میں یہ علاقہ ہمیشہ نمایاں رہا ہے اور آج بھی پیش پیش ہے۔

خطۂ بھوپال کو اردو کی تشکیل وترقی میں دوسرے علاقوں پر بعض اعتبار سے سبقت حاصل ہے، ۱۱۱۹ھ ۱۷۰۷ء میں قاضی محمد صالح بن محمد مصلح (قاضی بیرسیہ) نے مثنویٔ اخلاق تصنیف کی، قاضی صاحب پیشوائے دین ہونے کے ساتھ ساتھ اردو، فارسی اور ہندی کے شاعر بھی تھے۔ڈاکٹر سلیم حامد رضوی صاحب اپنی محققانہ کتاب ''اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ'' میں تحریر کرتے ہیں ''اس مثنوی کو دیکھنے کے بعد یہ کہنا پڑتا ہے کہ شمالی ہند کے ان علاقوں میں جہاں مسلمان زمانۂ قدیم سے آباد تھے اردو، ادب کی منزلیں دلی سے بہت قبل طے کر چکی تھی۔اور یہاں شعر وشاعری ولی اورنگ آبادی کے اثرات وتحریکات کی مرہون منت نہیں ہے، قاضی صاحب کی مثنوی خالص مذہبی رجحانات کی ترجمان ہے۔جہاں تک ان کی تخلیقات کا تعلق ہے ان کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ وہ شاعری کو محض مذہبی تعلیم کا درجہ قرار دیتے تھے۔ان کی زبان جو اس مثنوی

میں نظر آتی ہے ۱۱۱۹ھ ۱۷۰۷ء کی وقتی پیداوار نہیں ہے بلکہ کم از کم دوسو سال کے ادبی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ یہ وہی صاف اور سادہ زبان ہے جو ہمیں دلی میں پچاس سال کے بعد ملتی ہے۔ ان کی زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دکنی اثرات نفی کے برابر ہیں۔ دوسری اہم خصوصیت تسلسل ہے جو قاضی صاحب کے تربیت یافتہ ذہن کا پتہ دیتی ہے''۔ (صفحہ/۷۵۔اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ)

نمونہ کلام

ہے دھوکا یہ دنیا کا سب کاروبار
نہیں اس میں کچھ بھی ثبات قرار
ہے کچھ آج اور کل تماشہ ہے کچھ
کہوں کیا کہ اس کا سراپا ہے کچھ
طریقہ عجب اس کا دیکھا یہاں
کہ اس میں گرفتار ہوگا جہاں
نہ آسودہ اسم میں ہوا ہر کوئی
گرفتار خواری رہا ہر کوئی

اسی طرح بھوپال کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اردو میں قرآن مجید کا پہلا ترجمہ ''تفسیر ہندی'' کے نام سے شہر کے سب سے پہلے قاضی، قاجی محمد معظم صاحبؒ نے ۱۱۳۳ھ میں یعنی ۱۷۲۰ء سے قبل کیا۔ سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی تفسیر اردو نثر میں لکھی۔ قاضی صاحب کی نثر صاف، زبان سادہ اور دکنی کی آمیزش سے پاک ہے۔ البتہ اس میں

ہندی کے عام فہم الفاظ زیادہ استعمال کیئے گئے ہیں۔(صفحہ ۷۷، اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ)

۱۸۶۰ء میں نواب سکندر جہاں بیگم نے فارسی کے بجائے اردو کو ریاست کی سرکاری زبان قرار دیا۔ریاست حیدر آباد میں اس کے ۲۴ سال بعد ۱۸۸۴ء میں قدیم ریاست جموں اور کشمیر میں اسکے بھی بعد میں اردو کو یہ رتبہ ملا۔چنانچہ بھوپال میں جملہ سرکاری قوانین کا ترجمہ ''انضمام'' (۱۹۴۹ء) تک اردو میں ہوتا رہا۔ہائی کورٹ کی زبان اردو تھی، وکالت وطبابت کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی اور اردو ہی میں امتحانات پاس کر کے سندیں ملا کرتی تھیں۔اور سب سے بڑھکر بھوپال نے ایک ایسی مخلوط زبان کی آبیاری کی، جو اردو خمیر کی روایت کے عین مطابق تھی۔

دوست محمد خاں بانی ریاست بھوپال نے (۱۷۰۹ء) میں جب قدیم بھوجپال کی ایک نیم ویران بستی کے کنارے ایک پہاڑی پر قلع فتح گڈھ ''اپنی بیوی کے نام پر'' کی تعمیر شروع کی تو بھوپال کی تشکیل کا آغاز ہوا۔آباد کار پٹھان تھے جو پاکستان کے شمالی مغربی سرحدی صوبہ سے آئے تھے، جن کی زبان فارسی اور پشتو تھی۔قلعہ اور شہر پناہ کی دیواریں اٹھانے والے آس پاس کی آبادیون کے لوگ تھے جو مالوی، گونڈی اور گوجری، بندیلی زبانیں بولتے تھے۔ریاست، مراٹھا ریاستوں اندور (ہلکر) گوالیار (سندھیا) ناگپور (بھونسلہ) اور پیشوا کے نہ صرف علاقوں سے گھری ہوئی تھی بلکہ ان ے آئے دن کے حملوں کی زد میں بھی تھی اور مراٹھا سپاہیوں کا اردگرد کے لوگوں سے میل جول تھا جن کی زبان مراٹھی تھی۔شہر کے محلات، مساجد اور عمارتیں بنانے

والے صناع اور کاریگر دلی اور آگرہ کے تھے جن کی زبان اور لب ولہجہ پر عوامی کرخنداری کی گہری چھاپ تھی۔باہر سے آنے والے علماء فضلاء پر عربی اور فارسی کا غلبہ تھا۔اس طرح آپس کے میل جول، لین دین اور شادی بیاہ سے ایک مخلوط زبان کی تخلیق ہوئی۔لیکن چونکہ اس مواہل زبان نے درخور اعتنا نہ سمجھا،لہذا مقامی شعراء اور ادیبوں نے بھی اس کو منہ نہ لگایا۔سوائے مزاحیہ شعراء کے جن کے یہاں اس کو بھی مزحیہ رنگ دے دیا گیا البتہ عوام میں مقبول رہی۔

ملا رموزی نے اردو ادب میں گلابی اردو کا ایک نیا رنگ نکالا جو نظم ونثر دونوں میں بہت چوکھا آیا۔اس میں لطافت وظرافت اور طنز کی چاشنی بھی ہے۔اسی رنگ میں متعدد تصانیف بھی کیں جو مقبول عام ہوئیں، ہندوستان کا شاید ہی کوئی اچھا اردو اخبار ہو جو ان کے مضامین اور نظموں کا منتظر اور خواہش مند نہ رہا ہو۔ان کے طرز کا اور بھی کئی لوگوں نے تتبع کیا۔مگر ''وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی''۔

(فکر آگہی بھوپال نمبر۔۶۹۹)

بھوپالی اردو میں جہاں مراٹھی، ہندی، پشتو، بلوچی، فارسی، عربی، دلی اور آگرہ کے الفاظ اخذ کر کے ان کے اندر صوتی ،نحوی اور معنوی تصرف کیا وہی بعض نئے الفاظ کی ایجاد کا سہرہ بھی اس کے سر ہے۔جیسے ارنڈ ککڑی (پپیتا) کک صاحب کا تام لوٹ (مسٹر کک یہاں کا پہلا انگریز چیف انجینئر تھا) انگریزوں کی نسل میں انگریزی لباس بے ڈھنگے پن سے پہننے والے کے لئے یہ اصطلاح وضع کی گئی ،بعض وقت ایسے آدمی کو پلپلی صاحب بھی کہا جاتا تھا۔

''بیا'' بمعنی بیگم یا بانو یہ لفظ عموماً ہر شریف شادی شدہ خاتون کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ملازمین، آنے جانے والے خاتون خانہ کو''بیا'' سے مخاطب کرتے ہیں۔ بعض وقت نام کے ساتھ بیا لگاتے ہیں جیسے ذکیہ بیا، رفیعہ بیا وغیرہ اگر گھر میں کئی خواتین ہوں تو وہ بڑی بیا، منجھلی بیا، چھوٹی بیا، دلہن بیا وگیرہ کہلاتی ہیں۔ اسی طرح ''اپن'' لفظ جو واحد جمع دونون میں بولا جاتا ہے جیسے اپن تو اب سونے جارہے ہیں (واحد) اتوار کو ''اپن'' باغ چلیں گے، (جمع) اب تو یہ لفظ برصغیر میں عام ہوگیا ہے۔ جس طرح گفتگو میں ارے میاں یا ارے بھائی وغیرہ استعمال ہوتا ہے اسی طرح میاں خاں کا استعمال عام ہے۔ بڑے بھائی کو دادا کہتے ہیں۔ مگر یہ اپنے سے ہر بڑے شخص کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ''نواب'' اور ''سرکار'' دونوں لفظ یہاں مردوں اور عورتوں کیلئے استعمال کئے جاتے تھے۔ جیسے نواب صدیق حسن خاں صاحب اور نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ، اخوان ریاست یا جاگیر داروں کے نام سے پہلے ''میاں'' لگاتے ہیں جیسے میاں سعادت محمد خاں صاحب یا میاں خالد وغیرہ۔

کسرہ یعنی زیر کا استعمال عام ہے جیسے پے سا (پیسہ) مجھے میں نے، اسی طرح الف کے بجائے واو کا استعمال جیسے وس کو (اس کو) ون کو (ان کو) بعض الفاظ جمع میں استعمال ہوتے ہیں جیسے ''رمضانوں'' میں روزہ رکھتے ہیں ''محرموں'' میں تعزیہ نکلتے ہیں۔ بعض محاورے بھی عجیب ہیں جیسے ''قسم ہے تیس قرآن مجید کی'' یا ''پانچ ...... بجائے ''بیس پچیس'' کے۔

اور یہ کہاوت تو بہت عام ہے ''چہار چیز است تحفۂ است بھوپال، گٹکا، بٹوہ،

ورومال''۔

ایسے الفاظ اور محاوروں کی تعداد کافی ہے جو بھوپالی اردو میں شامل ہیں۔ اور ان کی فہرست کافی طویل ہے۔ صرف محمد احمد سبزواری صاحب کہتے ہیں کہ ''میں نے دو ہزار کے لگ بھگ ایسے الفاظ جمع کئے ہیں جن کو بھوپالی اردو میں شامل سمجھنا چاہئے''۔

(فکر و آگہی ص/۵۵۳)

دراصل مقامی اور مسخ شدہ الفاظ کو اردو لغات میں آنا چاہئے مگر ابھی تک اردو کی کوئی ایسی جامع لغت مرتب نہیں ہوئی ہے۔

☆☆☆☆☆
☆☆☆

مولانا محمد الیاس ندوی
(بھٹکل)

اردو زبان وادب کی تشکیل میں سلطنت خداداد کا حصہ

عام طور پر جب علمی دنیا میں اردو زبان کی تشکیل اور اردو ادب کی خدمات کا تذکرہ ہوتا ہے تو بالعموم اس سلسلہ میں شمالی ہند ہی کا تذکرہ ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں جنوبی ہند کے مختلف علاقوں اور وہاں کے علماء ادباء کی خدمات کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی موجودہ صدی اور اس سے قبل صدیوں کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جنوبی ہند بعض حیثیتوں سے اردو زبان وادب کی خدمات کے سلسلہ میں شمالی ہند سے بڑھا ہوا ہے، اس سلسلہ میں ہم صرف جنوبی ہند کی مشہور اسلامی سلطنت ''سلطنت خداداد'' کا تذکرہ کر رہے ہیں، جس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے، کہ آج سے دوسو سال قبل یہاں کے مسلمانوں اور عام لوگوں میں اردو کے

سلسلہ میں کس قدر دلچسپی پائی جاتی تھی۔

سلطنت خداداد اور سلطان ٹیپو کی مادری زبان اگر چہ اردو نہیں تھی لیکن وہاں کے عوام دیگر زبانوں کی طرح آسانی کے ساتھ اس زبان میں بھی تقریر و تحریر کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ٹیپو کے عہد ۱۷۸۲ء تا ۱۷۹۹ء میں اردو اپنے ابتدائی مرحلہ میں تھی اور یوں بھی ریاست میسور جنوب میں واقع ہونیکی وجہ سے اس کے اصل مرکز شمالی ہند سے بہت دور تھی، اردو بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد ۱۴۰۰ء میں اس وقت پہلی دفعہ شمال سے میسور کی طرف منتقل ہوئی جب بہمنی بادشاہ فیروز شاہ نے وجے نگر کے ہندو راجہ کی شہزادی سے شادی کی، یاد رہے کہ اس وقت میسور وجے نگر کی ہندو ریاست میں شامل تھا، اس کے بعد شمال سے جنوب کی طرف اردو بولنے والوں کی آمد کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ سلطنت خداداد کے ابتدائی دور میں اردو کی اہمیت، اس کے بولنے والوں کی تعداد کی کثرت کی وجہ سے فارسی، کنڑ یا مراٹھی سے کچھ کم نہیں تھی، خود نواب حیدر علی بھی اردو میں گفتگو کرتے تھے۔ ٹیپو کے عہد میں اردو نے خوب ترقی کی، سرکاری زبان فارسی ہونے کے باوجود پوری سلطنت میں اردو کا عام رواج تھا، لیکن یہ عام طور پر عوام میں دکھنی زبان کے نام سے مشہور تھی، خود سلطنت خداداد میں اردو کے بلند پایہ شعراء اور مصنفین پیدا ہوئے، جن کی سرکار کی طرف سے سرپرستی بھی کی جاتی تھی۔ اردو کے کئی شعراء و ادباء نے بیرون سلطنت سے آکر سلطنت خداداد میں سکونت اختیار کر لی تھی، خود سلطان کے حکم سے کئی کتابیں اردو میں لکھی گئی تھیں جس میں خلاصۂ سلطانی، احکام النساء اور جلوہ نامہ وغیرہ شامل ہیں۔ سلطنت خداداد میں

فوجی ترانہ کی زبان بھی اردو ہی تھی، جہاد کے موضوع پر فارسی میں ٹیپو کی لکھوائی ہوئی کتاب تحفۃ المجاہدین میں بھی اردو اشعار شامل تھے جس کے بعض نمونے کچھ یوں تھے ۔

برق جاں کوہ گراں پیک اجل دست قضا
تیغ و گرز و خنجر کے ترے ہیں چار نام
ہر ملک کو ورد ہو انا فتحنا دم بدم
جب تو ہو پا برکاب از بہر قصہ کارزار

یہ سن کر قارئین کو حیرت ہوگی کہ اردو کا سب سے پہلا اخبار جاری کرنے کا سہرا بھی ٹیپو ہی کے سر تھا، عام طور پر یہ مشہور ہے کہ ''دہلی اردو اخبار'' کے نام سے سب سے پہلے محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر نے ۱۸۵۷ء میں پہلا اردو کا اخبار جاری کیا تھا حالانکہ ۱۷۹۴ء میں اس سے ۶۳ سال قبل ہی اس معاملہ میں خاموشی سے ٹیپو ان سے سبقت لے چکا تھا، شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اپنے ایک مضمون میں علی گڑھ سے نکلنے والے ایک اخبار ہماری زبان کے یکم جولائی ۱۹۵۷ء کے حوالہ سے تفصیل سے اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے اور دلائل کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ ٹیپو ہی دراصل اردو اخبار کا بانی تھا، ۱۷۹۴ء میں اپنی شہادت سے پانچ سال قبل جب اس کی سلطنت کا نصف حصہ انگریزوں کے قبضہ میں جا چکا تھا اور وہ اپنی مملکت کی از سرِ نو تنظیم میں مصروف تھا، اس نے اسی دوران ایک دن ایک سرکاری حکم جاری کیا کہ ایک ایسا مطبع قائم کیا جائے جو عربی رسم الخط میں چھپائی کا کام انجام دے، جب پریس قائم ہوا تو اسی سال وہاں سے اردو میں ''فوجی اخبار'' کے نام سے سلطان کی ذاتی نگرانی اور سر

پرستی میں ایک ہفت روزہ جاری کیا گیا، بڑی تختی (تقطیع) میں شائع ہونیوالے اس اخبار میں سلطنت کے مختلف علاقوں میں پھیلے ہوئے فوجیوں کے نام اور سلطان کی ہدایات شائع ہوتی تھیں، اس طرح یہ اخبار عام طور پر سپاہیوں ہی کے لئے تھا، اس میں جہاد کے متعلق مضامین اور وطن کے دفاع سے متعلق مختلف لوگوں کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں، یہ ہفت روزہ سلطان کی شہادت تک مسلسل پانچ سال پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ سقوط سری رنگا پٹنم کے بعد انگریزوں نے اس اخبار کی فائلوں کو چن چن کر جمع کر کے آگ لگا دی۔

یہ اور اس طرح کی دیگر بہت سی باتیں ہیں جو اس بات کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں کہ ملک کے دیگر اہم علاقوں کی طرح سلطنت خداداد کا بھی اردو زبان و ادب کی تشکیل میں اہم رول رہا ہے۔

☆☆☆☆☆
☆☆☆

عبدالباسط ندوی

اردو زبان وادب کی تشکیل میں دکن کا حصہ

زبان و بیان اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ہے جس سے اس دنیا میں صرف انسان ہی کو اللہ تعالیٰ نے نوازا ہے، اور یہ شرف تمام مخلوقات میں صرف انسان ہی کو ملا ہے، ”الرحمن، علم القرآن، خلق الانسان، علمه البیان“، (الرحمٰن:۱۔۴) (خدائے رحمٰن ہی نے قرآن کی تعلیم دی، اسی نے انسان کو پیدا کیا، اس کو گویائی سکھائی) اور پھر بیان کی قدرت و بلاغت اور اس میں اس طرح مہارت پیدا کرنا کہ اپنی قوت بیانی سے دوسروں کو متاثر کرلیں اور اپنا ہم نوا بنالیں یہ ایک مسلمان اور صاحب ایمان داعی کے اوصاف میں بتلایا گیا ہے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منافقوں کے بارے میں جو آپ کی نافرمانی کیا کرتے تھے حکم خداوندی ہوتا ہے ”فأعرض عنهم وعظهم وقل لهم فی انفسهم قولا بلیغا“ (النساء:٦۳) علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبی:۴/۳۵۴ میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ

(تو ان سے درگزر کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کر جو ان کے دلوں میں اثر کرے) یعنی گفتگو کا وہ مؤثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہئے جو دلوں میں گھر کر جائے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان و بیان میں قدرت و مہارت پیدا کرنا ایک دینی و اسلامی فریضہ ہے، اللہ تعالیٰ نے مختلف زبانوں کو پیدا کیا اور انسان کے اندر اس کی صلاحیت رکھی کہ وہ مختلف زبانوں میں اپنی بات دوسروں تک پہونچا سکے، اور یہ زبانوں کا اختلاف خود اپنی جگہ ایک نعمت قرار پایا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "ومن آیاته خلق السماوات والارض واختلاف السنتکم وألوانکم وان فی ذلك لآیات للعالمین "(الروم:۲۲) (اور اس کی نشانیوں میں سے بتانا ہے آسمانوں اور زمین کا، اور الگ الگ ہونا تمہاری زبانوں اور رنگوں کا، بیشک اس میں بھی نشانیاں ہیں علم والوں کے لئے)

چنانچہ زبان چاہے کوئی بھی ہو وہ خود اپنی جگہ مافی الضمیر ادا کرنے اور لوگوں کو متأثر کرنے کا ذریعہ ہے اور مسلمانوں کے لئے ہر زبان کا سیکھنا اور اس میں اپنے دینی پیغام کو پہونچانا فرض کفایہ ہے، ہاں البتہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسانوں کے مابین ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اسی طرح زبانوں کو بھی بعض زبانوں پر فضیلت دی ہے، عربی زبان قرآن وحدیث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان ہونے کی وجہ سے تمام زبانوں میں سب سے زیادہ فضیلت واہمیت کی حامل ہے، اس کے بعد اگر کسی زبان کی اہمیت ایک مسلمان کے لئے ہو سکتی ہے تو وہ اس زمانہ میں اردو ہی ہے، برصغیر ہند وپاک میں اسلامی تمدن کا سب سے بڑا مظہر اردو زبان ہی ہے، اور یہ زبان اپنی

فطری صلاحیت کی بنیاد پر پوری دنیا میں چھا چکی ہے، ملک ہی نہیں بیرون ملک بھی دنیا کے ہر گوشہ وخطہ میں اس زبان کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اکثر علوم وفنون اور خاص کر دینی علوم وفنون کا ایک بڑا سرمایہ اور ہر قسم کے بلند خیالات وافکار کا ذخیرہ اس زبان میں موجود ہے، اس لئے اردو زبان اپنی بڑائی وگیرائی اور عالمگیر مقبولیت کی بنا پر دنیا کی متمدن اور ترقی یافتہ زبانوں میں شمار ہونے لگی ہے، قطع نظر اس کے کہ اردو کی ابتدا و پیدائش سندھ میں ہوئی یا دکن میں، پنجاب میں ہوئی یا دوآبہ گنگ وجمن میں، دراصل اس کی تشکیل وتعمیر ہر جگہ اور ہر خطہ میں ہوئی، اور اپنی اپنی مناسبت اور زبان ولہجہ کے اعتبار سے ہر علاقہ نے اردو کے ارتقاء وتشکیل میں اپنا اہم وخاص رول ادا کیا، اور چونکہ زبان انسانی خیالات واحساسات کے اظہار کا ایک اہم ذریعہ ہے اس لئے زمان ومکان اور انسانی ضروریات وخواہشات کے اعتبار سے ہر خطہ وعلاقہ کا قدرے اختلاف ناگزیر رہا، لیکن اس اختلاف کے باوجود اردو زبان تمام ہندوستانیوں کے اتحاد ویکجہتی کی آئینہ دار بھی ہے، یہ زبان بلاتفریق مذہب وملت ہر قوم کی دلچسپی کا ذریعہ رہی ہے، اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، چنانچہ سندھ، پنجاب، کشمیر، دلی، یوپی، بہار، بنگال، حیدرآباد، مدراس، میسور، بمبئی، گجرات، کون ایسا علاقہ ہے جہاں اس نے محبت کی شمع روشن کر کے نفرت کی تاریکی کو دور نہیں کیا، اس کے شیریں ودلکش نغموں نے وطن کے سپوتوں کے دلوں کو موہ لیا، اس کی فطری رواداری نے مسجد ومندر، کنشت وکلیسا ہر جگہ اپنا سکہ جمایا۔ (تعارف تاریخ اردو ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی صفحہ ۶) اسی طرح اردو

زبان وادب کی تعمیر وترقی صرف مسلمانوں ہی کے رہین منت نہیں بلکہ غیر مسلم اورخصوصاً ہمارے برادران وطن ہندو بھی اس میں تقریباً برابر کے شریک رہے ہیں اور بقول حامد حسن قادری ''سچ یہی ہے کہ مسلم اور ہندو کوئی قوم بھی اردوئے قدیم، اردوئے جدید اور اردوئے مستقبل کے لٹریچر سے بے نیاز نہیں ہوسکتی، اردو میں ہندوؤں کا مذہب ہے، ہندوؤں کا تمدن ہے، ہندوؤں کی تاریخ ہے، ہندوؤں کا قانون ہے، ہندوؤں کے علوم ہیں، ہندوؤں کی شاعری ہے، ہندوؤں کی انشاپردازی ہے اور ہندوؤں کی صحافت ہے'' (تاریخ وتنقید ادبیات اردو صفحہ ۱۶) ہم اپنے اصل موضوع کی طرف رخ کرتے ہوئے دکن میں اردو زبان وادب کی تشکیل پر ایک سرسری جائزہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگراس نظریہ کوتقویت نہ بھی مل سکے کہ اردو دکن میں پیدا ہوئی تو اس سے کسی کو انکارنہیں ہوسکتا کہ اس کے نشر وارتقاء اور تشکیل میں اس سرزمین نے بہت اہم کردار ادا کیا ہے، عظیم الحق جنیدی اپنی کتاب ''اردوادب کی تاریخ'' میں لکھتے ہیں کہ: ''علاء الدین خلجی کے زمانہ سے شمالی ہندوستان کے بادشاہوں نے دکن پر حملے شروع کردئے تھے، اوراس کا شمالی ہندوستان سے ایک رابطہ قائم ہوگیا تھا، ۱۳۲۹ء میں محمد تغلق نے دیو گیر کو اپنا دارالسلطنت بنایا، اور شمالی ہندوستان سے لوگ جوق درجوق آنے لگے اہل دکن اور شمالی ہند کے باشندوں کے میل ملاپ سے زبان ہندوی (قدیم اردو) وجود میں آئی جسے دکنی اردو بھی کہا جاتا ہے، بزرگان دین نے اسی دکنی اردو میں رشد وہدایت کا کام کیا، اوراس طرح اس زبان کو مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوئی اور پھر تو اس کی

رفتار ترقی دکن میں اتنی تیز ہوگئی کہ جب دکن میں مستقل تصانیف اور تحریری نمونے ملتے ہیں اس وقت شمالی ہند میں کوئی ادبی کارنامہ نظر نہیں آتا''۔(صفحہ ۵۷)

نصیر الدین ہاشمی تحریر کرتے ہیں ''گلستان ہند کے شمالی چمن میں مغربی دروازوں سے باغباں نے آکر اردو کا بیج بویا، گنگا اور جمنا آبیاری کر کے چھوٹے پودے کو اگایا، اسی کے قریب قریب گلزار دکن میں بھی انہیں ہاتھوں نے اس بیج کو زمین میں ڈالا، کرشنا اور گوداوری وموسی ندی درخت اگانے میں معاون ہوئیں، ہنوز شمالی چمن کا درخت بارآور نہ ہوا تھا کہ دکھنی پودا زمین کی عمدگی اور بروقت آبیاری سے بہت جلد تروتازہ، سرسبز اور شاداب ہوگیا (دکن میں اردو صفحہ ۱) آگے لکھتے ہیں کہ ''سرزمین دکن ہی کو اس امر کا فخر حاصل ہے کہ اردو کا نہ صرف پہلا شاعر اور مذہبی و علمی تصانیف کا موجد یہیں سے جلوہ نما ہوتا ہے بلکہ اردو زبان کی یونیورسٹی قائم ہوکر چاردانگ عالم میں اپنا غلغلہ بلند کرتی ہے، (دکن میں اردو صفحہ ۵)

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی لکھتے ہیں ''شمال ہندوستان کے برخلاف دکن میں اردو کا چلن بہت کم عرصہ میں ہوا، محمد شاہ تغلق کے سردار حسن بہمنی نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر کے دفتری زبان فارسی کے بجائے ہندی کردی جس کی وجہ سے اردو کی جڑیں مضبوط ہوگئیں، بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ سلطنتیں ہوگئیں [1] جنہوں نے اس زبان کی سرپرستی کی، بیجاپور اور گولکنڈہ کے سلاطین علم وفن کے بڑے قدرداں تھے ان کی شاہانہ سرپرستیوں کی وجہ سے دکن میں بڑے بڑے باکمال شاعر

ا۔ یہ پانچ سلطنتیں گول کنڈہ، بیجاپور، احمد نگر، برار اور بیدر میں قائم ہوگئیں اور یہ سلطنتیں قطب شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی اور برید شاہی سے موسوم تھیں، (دکن میں اردو صفحہ ۵۶)

اور ادیب پیدا ہوئے جن کی کوششیں اردو کی ترقی اور بقا کے لئے بہت مفید ثابت ہوئیں''، (تعارف تاریخ اردو صفحہ ۲۴)

ہم اس مختصر سے مضمون میں دکن میں اردو زبان وادب کی تشکیل کا پورا جائزہ پیش کرنے سے قاصر ہیں البتہ ایک اشارتی نوٹس پیش کرنے کی کوشش کررہے ہیں، دکن میں اردو کی ترقی وتشکیل کے سلسلہ میں مختلف مصنفین نے اسے چند ادوار میں تقسیم کیا ہے، محمد حسن ''قدیم اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں دکن میں اردوئے قدیم سے متعلق تین ادوار متعین کرتے ہیں، پہلا دور ۱۳۰۰ء تا ۱۳۵۰ء فتوحات علاء الدین خلجی ومحمد تغلق اور خسرو کی زبان ''دہلوی'' کی ہندی اور ہندوی کے نام سے دکن میں آمد اور انتشار، مرہٹی کے اثرات اردوئے قدیم پر، دوسرا دور گلبرگہ ۱۳۵۰ء تا ۱۴۳۰ء پایۂ تخت کا دولت آباد (علاقہ مرہٹی) سے گلبرگہ (علاقہ کنڑ) میں منتقل ہونا، نیا لسانیاتی ماحول، ۱۳۹۸ء میں فیروز شاہ بہمنی کے زریں عہد میں خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی ۸۰ برس کی عمر میں گلبرگہ تشریف آوری، تیسرا دور بیدر ۱۴۳۰ء تا ۱۵۲۷ء احمد شاہ ولی بہمنی نے ۱۴۳۰ء میں گلبرگہ کی سکونت ترک کر کے سرزمین شنجرف یعنی بیدر کو سلطنت بمنیہ کا پائے تخت قرار دیا...... سلطنت بہمنی کی علم دوستی اور ادب نوازی کے قصے مشہور ہیں (صفحہ ۹۵)

سید احتشام حسین ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' میں ان ادوار کو اس طرح تقسیم کرتے ہیں، پہلا دور جو تمام تر صوفیانہ ادب پر مشتمل ہے وہ لسانیات کے نقطۂ نظر سے بہت اہمیت کا حامل ہے، اور اس کا زمانہ بہمنی سلطنت کے خاتمے تک پھیلا ہوا ہے، جو شخص ہندوستان کی تھوڑی بہت تاریخ سے بھی آگاہ ہے اسے معلوم ہوگا کہ

پندرہویں صدی کا خاتمہ ہونے سے پہلے ہی بہمنی سلطنت ٹوٹ پھوٹ کے پانچ حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی، تخلیق ادب کی نظر سے ان میں بیجاپور اور گولکنڈہ کو بہت اہمیت حاصل ہے، بیجاپور میں عادل شاہی ریاست قائم ہوئی اور گولکنڈہ میں قطب شاہی، ان دونوں ریاستوں میں ادب اور دوسرے فنون کی بہت ترقی ہوئی، بادشاہوں سے لے کر عام لوگوں تک میں شاعری اور ادب کا ذوق دکھائی دیتا ہے، اس طرح ہم بیجاپور اور گولکنڈہ میں ترقی کرنے والے اردو ادب کو اس کی ترقی کا دوسرا دور کہہ سکتے ہیں، یہ دونوں ریاستیں جس طرح تقریباً ایک ساتھ قائم ہوئی تھیں اسی طرح ایک ساتھ ہی مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے ہاتھوں سلطنت مغلیہ کا ایک جزء بن گئیں، ان کے بعد تیسرا دور وہ کہا جا سکتا ہے جس میں مغل دورِ اقتدار میں ادب کا ایک بڑا سرمایہ جمع ہوگیا۔ (صفحہ ۲۶)

نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب ''دکن میں اردو'' کے اندر اس کو سات ادوار میں بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، پہلا دور بہمنی اردو ۷۴۷ھ تا ۹۰۰ھ تا ۱۱۰۰ھ پہلی فصل قطب شاہی اردو، دوسری فصل عادل شاہی اردو پھر اس میں قطب شاہی نظم ونثر اور عادل شاہی نظم ونثر کی تقسیم ہے نیز اسی دور میں نظام شاہی اردو اور برید شاہی دور کا تذکرہ کیا ہے، تیسرا دور ۱۱۰۱ھ تا ۱۱۳۶ھ مغلیہ اردو، چوتھا دور اردو سلطنت آصفیہ ۱۱۳۶ھ تا ۱۲۲۰ھ پانچواں دور سلطنت آصفیہ ۱۲۲۰ھ تا ۱۳۰۱ھ چھٹا دور اردو کا سلطنت آصفیہ کی سرکاری زبان قرار پانا ۱۳۰۱ھ تا ۱۳۳۶ھ اور اسی دور میں شعراء عہد عثمانی اور مختلف انجمنوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، ساتواں دور ۱۳۳۶ھ تا ۱۳۴۷ھ یہ دور جامعہ عثمانیہ اور اس کے شعبہ ترجمہ وتالیف اور فرزندان جامعہ سے متعلق ہے، نصیر الدین ہاشمی

نے ہر دور کے شعراء و نثر نگار کا تعارف وکلام پیش کیا ہے ان ادوار کے تذکرہ کے بعد خواتین شعراء و نثر نگار پر روشنی ڈالی ہے اور اس دور کے اخبارات ورسائل اور انجمنوں کا بھی تعارف کرایا ہے، اس طرح ان کی یہ کتاب اس موضوع پر مکمل حد تک روشنی ڈالتی ہے۔

دکن کے مسلمانوں ہی نے صرف اردو زبان وادب کی آبیاری نہیں کی بلکہ غیر مسلم اور خصوصاً ہندو بھائی بھی اس میں برابر کے شریک رہے ہیں، چنانچہ نصیر الدین ہاشمی ہی نے اپنی ایک کتاب ''دکنی ہندو اور اردو'' میں ایک بڑی تعداد ایسے ہندو مرد وخواتین کی پیش کی ہے اور ان کے حالات کا جائزہ لیا ہے اور ان کے کلام کا نمونہ ذکر کیا ہے، جنہوں نے اردو زبان وادبی کی ایسی خدمت انجام دی ہے جو کسی مسلمان سے کم نہیں، اس کتاب میں انہوں نے ان اخبارات اور رسائل کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ہندوؤں کی ایڈیٹری اور سرپرستی میں نکلا کرتے تھے۔

شعراء و نثر نگاران کے نام، حالات اور کلام، اسی طرح تحریکات وانجمن اور اخبارات ورسائل وجرائد کا تذکرہ طوالت کے خوف سے ترک کرتا ہوں۔

موجودہ دور میں اردو سمٹ سمٹا کر محدود ہوتی چلی جارہی ہے، گرچہ دکن کے بعض اسکولوں اور کالجوں میں قدرے اس کا وجود ہے، اسی طرح بعض انجمن وتحریک اور اخبارات ورسائل کے ذریعہ اس ک وفروغ مل رہا ہے۔مگر سچی بات یہ ہے کہ اب یہ تقریباً ہر علاقہ وہر خطہ میں صرف مدارس اسلامیہ دینیہ کی زبان بن کر رہ گئی ہے، اور وہی اس کے اس وقت اصل محافظ ہیں، بقیہ مسلمان جنہیں مدارس کی ہوا نہیں لگی ہے یا

جو اس سے دور ہی رہنا پسند کرتے ہیں ان کا حال آج بھی وہی ہے جو کئی سال پیشتر علامہ سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ ''ہمارے یہاں بدقسمتی سے یہ حالت ہے کہ ہمارے انگریزی خواں دوست اردو اخبار ملت اور تصنیفات کو ہاتھ تک لگانا جرم سمجھتے ہیں، ترجمہ کے لئے انگریزی کی دوسطریں دیدیجئے تو یہ کہ مغرورانہ انداز سے کاغذ میز پر رکھ دیں گے کہ بڑی مشکل ہے کہ اس کے لئے اردو میں الفاظ نہیں، اردو میں الفاظ نہیں یا آپ کی نظروں میں وسعت نہیں، اصل یہ ہے کہ کچھ تو اس تعلیم کا اثر ہے کہ غور وفکر، دقت بینی اور نقطہ رسی کی قوت نوجوانوں سے مفقود ہو جاتی ہے اور اس لئے علمی دلچسپی اور مذاق سلیم سے بے بہرہ رہتے ہیں، اور زیادہ تر یہ کہ ایک مدت تک اجنبی زبان اور بیگانہ خیالات پڑھتے پڑھتے اور سنتے سنتے اپنی مادری زبان سے قدرتاً ان کو بعد ہو جاتا ہے، اور چار جملے بھی غیر ضروری انگریزی الفاظ کی آمیزش کے بغیر نہیں لکھ سکتے، بلکہ اپنی مادری زبان سے ان کو ایک گونہ نفرت سی ہے، اور اس میں لکھنا پڑھنا اپنے لئے عار سمجھتے ہیں۔ (نقوش سلیمانی: صفحہ ۱۸۶)

ہمارے لئے آج یہ لمحہ فکریہ ہے کہ ہماری آئندہ کی نسل میں چند افراد بھی ایسے مل سکیں گے جو اردو سے واقف ہوں اور اردو لکھ پڑھ سکیں جبکہ ہم نے اپنی نسل کو ایسے اسکولوں اور کالجوں کی نذر کر دیا ہے، جہاں اردو کے وجود سے ہی دشمنی برتی جاتی ہے، اس لئے اگر ہم اپنے دین اور تشخص کے ساتھ اس ملک میں اپنی بقا چاہتے ہیں تو اس کی ضرور تحریک چلائیں کہ ہمارے گھر کا ہر فرد اور ہماری نسل کا ہر شخص اردو سے واقفیت حاصل کرے کہ ہماری تہذیب وتمدن کا بڑا سرمایہ اس زبان میں ہے، بلکہ اس سے

بڑھ کر کفر وایمان کا مسئلہ ہے کہ اگر ہم نے اپنی نسل کو اس طرح چھوڑ دیا تو کوئی اس کی بھی ضمانت نہیں دے سکتا کہ آیا وہ کل کو مسلمان بھی باقی رہیں گے، اور بقول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جنہیں اس کی بڑی فکر تھی اور جنہوں نے اپنی زندگی کا آخری آخری لمحہ اسی فکر اور جدوجہد میں گزارا، فرمایا ''اس کے بغیر میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان مسلمان نہیں رہ سکتا، جب تک وہ کسی نہ کسی درجہ میں اطمینان نہ کرلیکہ میری نسل اسلام کے صحیح راستہ پر رہے گی، صحیح عقیدہ پر قائم رہے گی، خواہ اس کو اس کے لئے کتنی قربانیاں دینی پڑیں''۔(تکبیر مسلسل :۴۷۱)

☆☆☆☆☆
☆☆☆

پروفیسر محمد عبدالوہاب جذبؔ

اردو زبان و ادب کی تشکیل میں اورنگ آباد دکن کا حصہ

اورنگ آباد دکن ہندوستان کا وہ علاقہ ہے جس نے اردو زبان کی تشکیل اور ترقی و ترویج میں نہایت اہم اور تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

سیاسی تقسیم سے اس کی جغرافیائی حدیں بدلتی رہیں۔ تغلق نے ۱۳۲۱ء میں دولت آباد کو پایہ تخت بنایا تب ریاست اورنگ آباد اس کی حدوں میں شامل تھا۔ آصف جاہ اول نے جب آصف جاہی سلطنت قائم کی تو یہ اس کا پایہ تخت تھا پھر دارالخلافہ حیدرآباد منتقل ہو گیا تو اس کی حیثیت ایک ضلع کی رہی لیکن یہ شامل ریاست نظام ہی میں رہا۔

یہاں تک کہ سقوط حیدرآباد کے بعد ۱۹۵۶ء SRC کے تحت ریاستوں کی لسانی بنیادوں پر تقسیم ہوئی تو اورنگ آباد مرہٹی بولنے والا علاقہ ہونے کی وجہ سے

مہاراشٹرا (ممبئی) میں شامل ہوگیا۔

سیاسی حدیں چاہے جو کچھ بھی رہی ہوں، اورنگ آباد نے اردو کی تشکیل وترویج میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

۱۶۸۱ء میں اورنگ زیب جب تیسری مرتبہ دہلی سے اورنگ آباد آئے تو پھر واپس نہ ہوئے اور ۱۷۰۷ء میں احمد نگر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ وہ دور تھا جب اردو زبان کی تشکیل بحیثیت لشکری زبان کی ہورہی تھی۔

اردو کا پہلا شاعر ولؔی اس وقت زندہ تھا، کیونکہ جب شیواجی کے بیٹے سمھاجی نے برہان پور اور اس کے اطراف ونواح کے علاقوں میں ۱۶۸۱ء م ۱۰۹۲ھ میں لوٹ مار مچائی تھی۔

غرض اردو کا پہلا شاعر ولؔی اورنگ آباد کی فضاؤں میں پلا بڑھا اور اس نے گیسوئے اردو کی مشاطگی کی۔

اورنگ زیب کے ۴۴ ویں سن جلوس یعنی ۱۱۳۱ھ میں اپنے عزیز دوست سید ابوالمعالی کے ہمراہ شاہ جہاں آباد دہلی گئے تھے۔ مشہور شاعر غلام ہمدانی مصحفی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ محمد شاہ کے دوسرے سن جلوس یعنی ۱۱۳۱ھ میں ولی اورنگ آبادی کا دیوان دہلی پہنچا تھا۔ دہلی کے شعراء اس کلام کی خوبیوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے فارسی غزل گوئی چھوڑ کر ولی اورنگ آبادی کے رنگ سخن کی پیروی شروع کردی۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ۱۱۳۱ھ سے بہت پہلے ولی نے اپنا دیوان مرتب کردیا تھا۔ ۱۱۳۱ھ میں جب ولی کا دیوان دہلی پہونچا تھا اردو کا دوسرا شاعر

سراج اورنگ آبادی ۵ رسال کا تھا۔ ولی اور سراج نے جو غزل کہی وہی اردو غزل کی بنیاد کا پتھر ہے۔ اور پھر میرؔ و سوداؔ، اور غالبؔ و مومنؔ نے اسے اس طرح سنوارا جس کی اتباع آج تک اردو شاعری میں جاری ہے۔ ولی کا سن وفات ۱۱۴۳ھ ہے۔

ولی کے ہم عصر شعراء میں فراقی اور وجدی کے نام نمایاں ہیں فراقیؔ نے ۱۱۳۳ھ میں ایک طویل نظم لکھی جسکا عنوان مراۃ الحشر ہے اسی نظم میں ان شعراء کا ذکر ملتا ہے جو اس وقت وفات پا چکے تھے۔ وجدیؔ نے ۱۱۴۶ھ میں مثنوی مخزن عشق ر باغ جاں فزا لکھی۔

وجیہہ الدین وجدیؔ شاہ صادق اورنگ آبادی کے شاگرد تھے اور صوبۂ اورنگ آباد کی سرکار دھارورہی کیج نامی قصبے میں رہتے تھے۔ کیج اب ضلع بیڑ اورنگ آباد ڈویژن میں واقع ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی تحقیق کے مطابق ولی کا سن پیدائش ۱۶۶۵ء یا ۱۶۶۷ء ہے اور سن وفات ۱۷۰۷ء یا ۱۷۰۸ء ہے۔ اس طرح ۲۰۰۷ء میں ولی کو گذرے ۳۰۰ رسال ہو جائیں گے۔

۱۷۰۸ء میں جب ولی کا انتقال ہوا ایک تحقیق کے مطابق شاہ سراج ۳ رسال کے تھے اس طرح سراج کا سن پیدائش ۱۷۰۵ء ہوا۔ جس کے مطابق ۲۰۰۵ھ میں ان کو پیدا ہوئے ۳۰۰ رسال ہو چکے ہیں۔

جمیل جالبی نے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں محفوظ ولی اورنگ آبادی کے ایک قلمی نسخے کا حوالہ دیا ہے جو ۱۱۳۸ھ کا لکھا ہوا ہے۔ جس کا کاتب شیخ ثناء اللہ ہے جو ولی اورنگ آبادی کا شاگرد تھا۔ دیوان ولی کا قدیم ترین نسخہ خدا بخش لائبریری میں

ہے۔ جسکا سنہ ۱۱۲۰ھ م ۱۷۰۸ ہے۔ اس مخطوطے میں ولی کا سارا کلام موجود ہے۔ یعنی ولی کا کوئی معلوم کلام اس مخطوطے کے باہر نہیں۔ اس کے علاوہ دیوان ولی کے نسخہ جات حسب ذیل کتب خانوں میں ملتے ہیں۔

۱۔ نسخہ کتب خانہ جامع مسجد بمبئی

۲۔ نسخہ نوشتہ ۱۱۵۲ھ کتب خانہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن جسکا کاتب مہندی تھا۔

۳۔ نسخہ انڈیا آفس لائبریری لندن جس کا کاتب محمد تقی ولد سید ابوالمعالی ہے جس نے ولی کے کئی متداول دیوان سامنے رکھکر یہ نسخہ تیار کیا تھا جس کا کاتب سید ابوالمعالی کا بیٹا ہے۔ سید ابوالمعالی ولی کے مخلص دوستوں میں سے تھے اور ولی کے ساتھ دلی گئے تھے۔ ولی نے ابوالمعالی کا ذکر اپنے کئی اشعار میں کیا ہے۔ محمد تقی نے ۱۱۵۶ھ میں یہ نسخہ تیار کیا تھا۔

۴۔ مشہور فرانسیسی مستشرق گارسان دتاسی نے ۱۸۳۳ء میں دو جلدوں میں دیوان شائع کیا۔ یہی دیوان آٹھ نسخوں سے مقابلہ کر کے تیار کیا گیا جس کا ذکر نورالحسن ہاشمی نے کیا ہے۔

۵۔ ۱۹۲۰ یا ۲۳ء میں حیدر ابراہیم سایانی نے پونہ سے ولی کا ایک دیوان شائع کیا۔

۶۔ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۲۷ء میں مولانا محمد احسن مارہردی سے کلیات ولی کو مرتب کروایا، مارہردی نے یہ کلیات چھ قلمی اور تین مطبوعہ نسخوں کے تقابلی مطالعے کے بعد تیار کیا تھا۔ ولی کا اعتراف میر نے بھی کیا ہے۔

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اس میں شک نہیں کہ ولیؔ نے اردو غزل کی بنیاد رکھی لیکن یہ امر خالی از دلچسپی نہیں کہ داراشکوہ سے وابستہ ایک ہندو شاعر برہمن نے اردو غزل کی ابتدا کر دی تھی۔ اس کا ایک دلچسپ لطیفہ یہ ہے کہ اس نے داراشکوہ کو یہ شعر سنایا۔

مرا دست بکفر آشنا کہ چندیں بار
بکعبہ بروم وبازش برہمن آور دم

داراشکوہ نے شاہجہاں کو یہ شعر سنایا تو شہنشاہ کا اس پر عتاب نازل ہونے ہی کو تھا کہ افضل خاں نے سعدی کا یہ شعر کہہ کر اس کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔

خر عیسیٰ اگر بمکہ ردد
چوں بیاید ہنوز خر باشد

چنانچہ برہمن نے ولی سے بہت پہلے جو غزل کہی اس کے اشعار یوں ہیں۔

خدا نے کس شہر میں برہمن کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے
پیا کے ناوں کی سمرن کیا چاہوں کروں کس سیں
نہ شتمی ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
خوباں کے باغ میں رونق ہوئے تو کس طرح یاراں
نہ دوتا ہے نہ مردا ہے نہ موہنی ہے نہ لالا ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا میں

نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

سراج ولی کے صغر سن معاصر تھے۔ وہ عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف پہونچے تھے۔ ان کے کلام میں بلا کا سوز وگداز ہے۔ سراج کی زبان بالکل آج کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایک اہل دل انسان تھے۔ حضرت مولانا علی میاںؒ سراج کی مشہور غزل ''خبر تحیر سن'' ایک بار سن رہے تھے جب اس شعر پر پہنچے۔

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

تو بے اختیار فرمایا کہ'' سراج صاحب دل شاعر تھا یہ شعر وہی کہہ سکتا تھا۔ غالب عقل کا شاعر ہے اور سراج دل کا''۔

ولی اور سراج نے غزل کا جو مزاج بنایا اور جس منہج پر اسے ڈھالا شمال میں اس کا تتبع ملک الشعراء مرزا محمد رفیع سوداؔ اور میر تقی میرؔ جیسے اردو کے عظیم ترین شعراء نے کیا۔ سراج کی غزل دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کسی آج کے شاعر کا کلام ہے۔ اس کی زبان اتنی صاف اور جدید ہے۔ ولی کو بزرگوں سے جو عقیدت تھی اس کا اظہار شعر میں یوں کرتے ہیں:

''الٰہی رکھ مجھے تو خاک پا اہل معانی کا
کہ کھلتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا''

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد جب آصف جاہ اول نے ریاست حیدرآباد کو ۱۷۲۵ء میں ایک خود مختار ریاست بننے کا اعلان کر دیا تو اس کا پایہ تخت اورنگ آباد ہوا۔

دارالخلافہ کی حیثیت سے اورنگ آباد میں چہل پہل بڑھی تو شمال سے بہت سے علماء یہاں آکر آباد ہو گئے۔ اس زمانے میں آزاد و بلگرامی جیسی جید شخصیت نے بھی اس شہر کو رونق بخشی۔ اورنگ آباد میں ایک علمی فضا بن گئی گو انہوں نے زیادہ تر عربی و فارسی میں لکھا لیکن ساتھ ہی ساتھ اردو کی ترویج و ترقی بھی ہوتی رہی چنانچہ ۱۱۷۵ھ میں مشہور ہندو شاعر لالہ لچھی نارائن شفیق اورنگ آبادی نے ایک فارسی تذکرہ چمنستانِ شعراء لکھا جس میں انہوں نے اردو اشعار بھی درج کیے ہیں۔ غرض دور آصف جاہی میں اردو کو بے حد ترقی ہوئی کیونکہ مغلیہ سلطنت میں تو سرکاری زبان فارسی تھی لیکن دور آصف جاہی میں ریاست حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو قرار پائی۔ اس لحاظ سے شہر اورنگ آباد کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ اور اعزاز ملا۔ حکومت کے دفاتر اور عدالت کے کام کاج سب اردو میں ہونے لگے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر امبیڈکر ریاست حیدرآباد کے انڈین یونین میں الحاق کے بعد اورنگ آباد آئے تو بحیثیت وزیر قانون ان کو تجسس ہوا کہ دیکھیں اردو میں کس طرح عدالت کی کاروائی چلتی ہے اور بحث وغیرہ ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ انگریزی ہی کی طرح اردو میں ساری عدالتی کاروائی اور بحث ہوئی۔ خود راقم سطور کے ایک عزیز مشہور وکیل شیخ لعل پٹیل نے اردو میں جرح کی تھی جنہیں امبیڈکر نے اردو کی اس استعداد پر مبارک باد دی تھی۔

لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے علاوہ ایک اور تذکرہ اسی طرز کا موسوی خاں نے ۱۱۹۴ھ میں تصنیف کیا تھا۔ جس میں جنوبی ہند کے شعراء کے علاوہ شمالی ہند کے

شعراء کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ ان دونوں تذکروں کے قلمی نسخے Manuscripts کتب خانۂ آصفیہ (جس کا موجودہ نام اسٹیٹ لائبریری ہے) میں موجود ہے۔

اردو غزل میں صفی اورنگ آبادی کا جو مقام ہے وہ اظہر من الشّمس ہے۔ جنہوں نے غزل میں اردو کے محاوروں کو نگینے کی طرح جڑ دیا ہے۔ صفی اورنگ آبادی ۱۸۸۳ء میں اورنگ آباد کے مشہور محلے نواب پورہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم نسرالدین صدیقی نے ان کا نام بہاءالدین رکھا تھا بعد میں ایک بزرگ نے ان کا نام بہبود علی رکھا جسے ان کے والدین نے بھی پسند کیا۔ صفی ابتدائے عمر ہی میں والدین کے ساتھ حیدر آباد چلے گئے گو پھر اورنگ آباد لوٹے لیکن ان کا زیادہ تر قیام حیدر آباد ہی میں رہا۔ جب اورنگ آباد لوٹے تو یہ شعر کہا۔

آدھی صدی کو پانچ برس ہی تو کم رہے
شاباش کب صفی کو خیال وطن ہوا

صفی کے رنگ کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

آلائش زمانہ سے دامن بچا صفی
کتا بھی بیٹھتا ہے جگہ اپنی جھاڑ کے

کسی سے التجا تک اے صفی کرنی نہیں پڑتی
مجھے دینا ہے گھر بیٹھے مرا روزی رساں کیا کیا

سرکار غریبوں میں بھی ہوتے ہیں بڑے لوگ
ایسے نہ کیا . کیجئے تحقیر کسی کی!

کسی کو کوئی کیا دنے گا کسی سے کوئی کیا لے گا

صفی ہم تو حساب دوستاں در دل سمجھتے ہیں
کسی کا رزق چھین سکتا نہیں خلاق اکبر سے
صفی پتھر کے کیڑے کو غذا ملتی ہے پتھر سے

شاعروں اور ادیبوں کا کسی زبان کی تشکیل و ترویج میں جو حصہ ہے وہ اپنی جگہ مسلم لیکن انجمنوں اور اداروں کا بھی ایک کردار role ہوتا ہے۔ لہذا یہاں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کا ذکر بھی اورنگ آباد میں اردو کی ترقی کے ذیل میں ضروری ہے اور اس ترقی کا سہرا اس کے روح رواں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے سر جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے اور سچ کہا جاتا ہے کہ یورپ میں کام ایک اکادمی کرتی ہے۔ یہاں مشرق میں صرف ایک آدمی کرتا ہے۔ یہ بات مولوی عبدالحق پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ ۱۹ویں صدی کے آخر میں جب ہندی اردو تنازعہ سنگین صورت اختیار کر گیا تو ۳۱ر دسمبر ۱۹۰۲ء کو مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سولہویں اجلاس منعقدہ دہلی میں انجمن ترقی اردو کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اور انجمن کی کاروائی کا باقاعدہ آغاز ۱۹۰۳ء سے ہوا۔ اس انجمن کے پہلے صدر سر تھامس آرنلڈ اور سکریٹری مولانا شبلی نعمانی مقرر ہوئے، انجمن کے دوسرے سکریٹری حبیب الرحمٰن خاں شروانی ان کے بعد عزیز مرزا سکریڑی ہوئے اور ان کے بعد ۱۹۱۲ء میں بمقام لکھنؤ مولوی عبدالحق کو سکریٹری نامزد کیا گیا۔ اور جب مولوی عبدالحق اورنگ آباد آئے تو انجمن ترقی اردو کا دفتر بھی اورنگ آباد منتقل ہو گیا۔ یہ ۱۹۱۳ء کی بات ہے۔ سرزمین اورنگ آباد کی آب و ہوا انجمن کو ایسی راس آئی کہ ۲۶ر سال تک اس کا مستقل قیام اورنگ آباد ہی میں رہا۔

انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ نایاب اور کم یاب کتب کا اردو میں ترجمہ ہے جو انجمن کے مطبع سے شائع ہوئیں جن میں پلوٹارک کی شہرہ آفاق کتاب Paralled Lives قابل ذکر ہے جس میں مشاہیر یونان وروما کا ذکر ہے۔ اس طرح فرانسیسی پروفیسر ڈوزی کی مبسوط تاریخ مسلم اسپین ہے۔ سرکار نظام نے اس کا فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ کروایا تھا ۱۹۱۳ء میں مولوی عبدالحق نے اردو میں اس کا ترجمہ کروایا، علاوہ ازیں فلسفۂ جذبات، علم طبعات الارض، علم الاخلاق، البیرونی، دریائے لطافت، علم واعمال، حفظان صحت اور تاریخ تمدن وغیرہ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام شائع ہوئیں۔ مسٹر عزیز احمد خاں نے John Stute Mill کی سوانح عمری کا اردو ترجمہ کیا۔ ہر صوبے کے اردو نصاب تعلیم کو زبان کے لحاظ سے جانچنے اور نقائص دور کرنے کا کام بھی انجمن نے کیا۔ مولوی عبدالحق کا مقالہ مرہٹی زبان پر فارسی کا اثر لسانی تحقیق کا ایک شاہکار ہے۔ اردو کا ایک جامع قاعدہ بھی ترتیب دیا گیا جس کے لئے مختلف حضرات سے قاعدے منگوائے گئے جن میں دو قاعدے منتخب کئے گئے، ایک تشنہ فرید آبادی کا اور دوسرا سید احمد علی کا۔

انجمن ترقی کے اردو کے روح رواں مولوی عبدالحق بابائے اردو کی کوششوں سے ممالک محروسہ سرکار عالی کے تمام مدارس کا ذریعہ تعلیم اردو قرار دیا گیا۔ جس کے لئے انجمن نے تمام مضامین جیسے سائنس، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی فلسفہ، پولیٹکل سائنس، اقتصادیات Economics پر اردو میں کتابیں لکھوائیں اور شائع کروائیں۔ یہ اردو کی ترقی وترویج کا سب سے بڑا سنگ میل ہے۔ مولوی صاحب

نے شدت سے اس بات کو عام کیا کہ غیر زبان خواہ کوئی ہو اور کیسی ہی ہو ہماری زبان نہیں ہوسکتی۔ اور اسی بات پر زور دیا کہ بچے کو مادری زبان ہی میں تعلیم دی جانی چاہئے۔ مولوی عبدالحق نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے انگریزی اردو ڈکشنری ۱۹۳۷ء میں انجمن کے زیر اہتمام شائع کی جو آج بھی انگریزی اردو کی بہترین ڈکشنری ہے۔

مولوی عبدالحق نے اورنگ آباد سے رسالہ اردو بھی جاری کیا جس میں اعلی درجے کے تحقیقی اور علمی مقالے اور مضامین شائع ہوئے جس نے پورے ہندوستان میں علمی دھاک بٹھادی، اور جس سے لاکھوں تشنگان علم و دانش سیراب ہوئے۔ یہیں سے ایک رسالہ "سائنس" بھی بابائے اردو نے جاری کیا جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی پر جدید ترین تحقیقات پر مبنی مضامین شائع ہوئے۔

مولوی عبدالحق نے یہاں رہ کر دانشوروں کی ایک ٹیم بھی تیار کی اور خود اپنی زیر نگرانی ان کی تربیت بھی کی۔ کتابوں کا تیار کرنا آسان ہے بمقابلے انسانوں کے تیار کرنے کے۔

چنانچہ ان تربیت یافتہ دماغوں میں شیخ چاند، سید اشفاق حسین اور سکندر علی وجد کے نام نامی نمایاں ہیں۔

بابائے اردو جب اورنگ آباد گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے آپ نے یہاں سے رسالہ نورس جاری کیا تو شیخ چاند اس کے مدیر مقرر ہوئے۔ شیخ چاند نے ایم۔اے اور ایل ایل۔بی کرنے کے بعد مولوی عبدالحق کی نگرانی میں سودا پر تحقیقی مقالہ دو سال

کے عرصے میں تکمیل کیا۔ چونکہ شیخ چاند کم عمری میں وفات پا گئے اور بقول شاعر ؎

''خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود''

ان کے انتقال کے بعد بابائے اردو نے ۱۹۳۶ء میں اسی مقالے کو اپنے مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد سے شائع کیا۔

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے انگلش اردو ڈکشنری مولوی عبدالحق کا لاثانی کارنامہ ہے اس کی تیاری میں بھی شیخ چاند نے بابائے اردو کے معاون کی حیثیت بڑی دیدہ سوزی اور عرق ریزی سے کام کیا۔

سودا پر تحقیق کے صبر آزما کام کے علاوہ انہوں نے مشہور ہندو سنت ''ایکناتھ'' اور اورنگ آباد کے معمار اول ملک عنبر کے سوانح حیات بھی لکھے۔ مولوی عبدالحق کی مشہور تصنیف ''چند ہم عصر'' کو شیخ چاند ہی نے مرتب کیا اور انجمن کے پریس سے شائع کیا۔ اردو مرکز لاہور سے شائع ہونے والے نسخۂ ''ہم عصر'' کے دیباچے میں یہ تحریر ہے کہ ''اس کتاب کے مضامین سب سے پہلے شیخ چاند مرحوم نے جمع کر کے کتاب کی صورت میں شائع کئے۔ (مطبوعہ ۱۹۵۹ء مطبوعہ باب الاسلام پریس کراچی)

سودا پر شیخ چاند کا مقالہ اردو تحقیق میں ایک اضافہ ہے، انہوں نے بڑی محنت سے سودا کی زندگی کے نامعلوم گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً یہ کہ سودا کا ایک غلام تھا جس کا نام ''غنچہ'' تھا۔ اس کا ذکر محمد حسین آزاد نے یوں کیا ہے، ایک غلام ہر وقت خدمت میں رہتا اور ساتھ قلمدان لئے پھرتا تھا۔ سودا تنک مزاج آدمی تھے جب کسی پر بگڑتے تو فوراً پکار اٹھتے ارے غنچے لا تو قلمدان اس کی خبر تو لوں یہ مجھے سمجھا

کیا ہے؟ اور واقعی پھر اس کے وہ بخیے ادھیڑتے تھے کہ توبہ ہی بھلی ہے۔ پھر شرم کی آنکھیں مونددے اور بے حیائی کا منہ کھول کر وہ بے نُقط سناتے کہ شیطان بھی امان مانگے۔

شیخ چاند نے یہ بھی روایت درج کی ہے کہ مرزا عارف الدین خاں عاجز جب دہلی گئے تو سودا سے ملے اور اپنی ایک غزل سنائی جس کا مطلع ہے ؎

اگر کہن سخن میرا نہال تاک کو پہونچے
صراحی شاخ ہو جائے شراب انگور سے ٹپکے

سودا نے کمال خلوص اس کی داد دی اور عاجز کو ریختہ کا استاد تسلیم کیا اور اپنا دیوان دستخط خاص سے ان کی نذر کیا۔

سودا کو کتیاں پالنے کا شوق تھا چنانچہ میر نے اپنی ہجو میں یوں پھبتی کسی کہ ؎

دلی میں تین کتیاں کہیں لے کے پالیاں

ہمسایوں کو ان کتیوں سے تکلیف پہونچتی تو سودا ان کی گالیاں بھی کتیوں کی وجہ سے سہہ لیتے، جب وہ مر گئیں تو سودا کو بے حد قلق ہوا۔ شیخ چاند کی تحقیق میں ان کے نام یوں ہی پستی، لونگی اور برفی۔ افسوس شیخ چاند کی عمر نے وفا نہ کی ورنہ وہ ایک عبقری اور نابغۂ روزگار شخصیت ثابت ہوتے۔

مولوی عبدالحق مردم شناس تھے۔ انہوں نے سکندر علی وجد کے جوہر کو بہت پہلے پرکھ لیا تھا۔ وہ ویجاپور تعلقے سے اٹھ کر اردو کے ایک عظیم شاعر کے مقام پر فائز

ہوئے۔ وجد نے تاریخی مقامات اور تاریخی عمارات پر جو نظمیں لکھیں وہ انہیں کا حصہ ہے، اردو میں نہ ان سے پہلے نہ ان کے بعد کسی نے ان موضوعات کو شعری جامہ پہنایا تھا۔ ان کی مشہور نظمیں اجنتہ اور ایلورہ ہیں۔ نظم اجنتہ میں انہوں نے غار ہائے اجنتہ میں ۳۰۰۰ رسال پہلے اتاری گئی تصویروں کا شعر میں کچھ ایسا نقشہ کھینچا کہ ساری Paintings نظر کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔ اسی طرح ایلورہ کے غاروں میں جو دیو قامت پیکر تراشی کی گئی اس کا نقشہ بھی شعر میں اس طرح پیش کیا گیا کہ وہ سنگ تراشی ہماری نظروں کے سامنے گھومنے لگتی ہیں۔ نظم اجنتہ میں وہ مشہور مصرعہ ملتا ہے جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس میں بتایا گیا کہ کس طرح ذوق عریانی نے مذہب کا چولا بدلا ہے۔ وجد کہتے ہیں ''تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوق عریانی'' انہوں نے تاج محل اور دکن کے تاج بی بی کا مقبرہ پر بھی نظمیں کہی ہیں۔ شہر اورنگ آباد پر انہوں نے ایک معرکۃ الآرا نظم کہی ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

دکن کی سرزمیں پر موجزن ہے جوئے خوں تیری
اگلتی ہیں ہزاروں لعل خاک تیرہ گوں تیری

زمانے مین تری تاریخ کا خورشید روشن ہے
تری آغوش حکمت ہند کے پھولوں کا گلشن ہے

ترے کہسار میں ہے عزم خلجی بے قرار اب تک
فضا میں ہمت تغلق کا اڑتا ہے غبار اب تک

جواہر خیز میدانوں پہ قبضے کے لئے اکثر
ہوا ہے امتحان بُرّش تیغ ملک عنبر
ترے دامن میں عالمگیر میٹھی نیند سوتا ہے
جلال قطب شاہی اپنی بربادی پہ روتا ہے
ولی کے نغمۂ جاں سوز گونجے تیری محفل میں
سراج بزم عرفاں سے اجالا ہے ترے دل میں

☆☆☆☆☆
☆☆☆

مولانا محمد ریاض الدین فاروقی ندوی
(اورنگ آباد)

مرہٹواڑہ اور اردو

ریاست حیدرآباد ہندوستان کے جنوب میں واقع تھی۔ جس پر آصف جاہ خانوادے کی حکومت تھی۔ ساتویں آصف جاہ، نظام دکن میر عثمان علی خاں کے عہد حکومت میں سردار پٹیل کے ایماء پر ۴۸ء میں فوج کشی کی گئی جسے پولس ایکشن کا نام دیا گیا جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کی اس سب سے بڑی ریاست کا سقوط عمل میں آیا۔ اور اسکا الحاق حکومت ہند کے ساتھ کردیا گیا۔ پھر جب ۵۶ء میں ریاستوں کی لسانی بنیاد پر تشکیل ہوئی تو یہ ریاست پارہ پارہ ہوگئی۔ تیلگو بولنے والے علاقے آندھرا میں، کنڑا بولنے والے علاقے کرناٹک میں اور مرہٹی بولنے والے علاقے مہاراشٹر میں ضم ہوگئے۔

چونکہ اورنگ آباد اور اسکے اطراف واکناف کے اضلاع میں مرہٹی بولی جاتی تھی اس لئے اسے مرہٹواڑہ کہا گیا اور پھر اسے مہاراشٹر اسٹیٹ میں شامل کردیا گیا

جس کا دارالخلافہ بمبئی یعنی موجودہ ممبئی ہے۔ مرہٹواڑہ کا صدر مقام اورنگ آباد دکن ہے۔ اورنگ آباد سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر دولت آباد واقع ہے جسے محمد تغلق نے ۱۳۲۱ء میں اپنا پایۂ تخت بنایا اور دہلی کی پوری آبادی کو یہاں منتقل کیا تھا۔ اس کا پہلے دیوگیری نام تھا جہاں یادو خاندان کے بادشاہوں نے مشہور قلعہ تعمیر کروایا تھا جسے علاؤالدین خلجی نے فتح کیا اور اس کا نام دولت آباد رکھا۔ انتقال آبادی کے باعث شمال اور جنوب کے ارتباط سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جسے ریختہ اور اردو کہتے ہیں۔ ویسے یہ عمل دیوگری پر علاؤالدین خلجی کے پہلے حملے کے بعد ہی شروع ہو چکا تھا۔ اسی زبان کی ابتدائی شکل دکنی کہلائی۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد گول کنڈہ میں قطب شاہی، بیجاپور میں عادل شاہی اور احمد نگر میں نظام شاہی سلطنتیں قائم ہوئیں تو انہوں نے دکنی زبان کی سرپرستی کی۔ مرہٹواڑہ کا بڑا حصہ بطور خاص اورنگ آباد میں دولت آباد وغیرہ نظام شاہی سلطنت میں شامل تھا۔ چنانچہ ملک عنبر نے مشہور تاریخی جامع مسجد اورنگ آباد تعمیر کروائی اور آب رسانی کا محیر العقول کارنامہ نہر انجام دیا۔ عنبری بھی اسی کا ہے۔ اکبر کے دور میں شمال کے تعلقات جنوب میں نظام شاہی سلطنت سے استوار ہوئے اس طرح زبان کا بھی تبادلہ Exchang ہوا۔

نظام شاہی دربار کے شاعر حسن شوقی نے ۱۷ویں صدی عیسوی میں جو زبان اپنی غزلوں اور مثنویوں میں استعمال کی وہ میر وسودا کی زبان سے ملتی جلتی ہے جب کہ حسن شوقی، ولی دکنی سے بھی سوڈیڑھ سو سال پہلے کا شاعر ہے۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

اگر عشق حقیقی میں نہیں صادق ہوا شوقی
دلے مقصود خود حاصل کیا ہے عشق بازی میں

اے باد نو بہاری گر تو گذر کرے گی
گلزار تے خبر لیا اور یا سخن کہاں ہے

ولؔی اور سراج پر دکن اور مرہٹواڑہ جس قدر فخر کرے کم ہے۔ میر وسودا نے ولؔی کی اتباع کو اپنا سرمایہ افتخار سمجھا۔ وجدؔ نے کتنا صحیح کہا ہے کہ۔

وجدؔ اردو کی آبرو ہے غزل
یہ نوازش ترے وطن کی ہے

اب ہم ولی، سراج، لچھمی نرائن میں شفیق، صفی لکھنوی کے دور کو عبور کر کے وجدؔ اور اسکے بعد کے شعرائے مرہٹواڑہ بالعموم اور شعرائے اورنگ آباد کی مساعی جمیلہ کا ذکر کریں گے جن کی وجہ سے گیسوئے اردو سنور کر دلکش ہو گئے ہیں۔ وجدؔ نے اپنے بارے جو تعلی اس شعر میں کی ہے وہ اس کے مستحق اور حقدار ہیں۔

دو سو برس میں وجدؔ سراجؔ و ولؔی کے بعد
اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاک دکن سے ہم

یہ بھی وجدؔ نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے۔

سنا ہے وجدؔ ہے اچھا سخنور
کوئی کہتا ہے اچھا آدمی ہے

وجد نے تاریخی عمارتوں اور آثار قدیمہ پر جو نظمیں لکھی ہیں ان سے اردو شاعری مالامال ہوگئی۔ انہوں نے غار ہائے اجنتہ کی پینٹنگس (Paintings) یا مصوری پر ایک شاہکار نظم کہی جس کا عنوان ''اجنتہ'' ہے اس کے بعد ایلورہ کی سنگ تراشی اور پیکر تراشی پر اپنی مشہور نظم ایلورہ لکھی۔ مولانا آزاد نے دونوں نظمیں وجد سے سنیں اور وجد کے پوچھنے پر فرمایا کہ'' اجنتہ حسین اور ایلورہ عظیم نظم ہے'' ان دونوں لفظوں میں مولانا نے معنی کے سمندر بھر دئے ہیں۔

سروجنی نائیڈو نے وجد سے کہا تھا'' جو بات میں نے ڈاکٹر اقبال سے کہی تھی وہی تم سے کہہ رہی ہوں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ جو شکوہ '' شکوہ'' میں ہے وہ ''جواب شکوہ'' میں نہیں۔ اسی طرح جو بات تمہاری اجنتہ میں ہے وہ ایلورہ میں نہیں''۔
وجد کو نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ غزل کے بارے میں ایک جگہ کہتے ہیں۔

وجد اردو کی آبرو ہے غزل
یہ نوازش ترے وطن کی ہے

مرہٹواڑہ کے ایک مشہور شاعر جو وجد کے جونیئر تھے اور جن کا تخلص وجد نے ساغر اقبال سے بدل کر محمود عشقی کر دیا تھا اچھے سخنور تھے۔ ناندیڑ کے رہنے والے تھے۔ ابھی حال ہی میں ہفتہ ان کا انتقال ہوگیا، ان کی شاعری جدید وقدیم کا سنگم ہے۔

شمس جالنوی ایک نغز گو اور خوش گو شاعر ہیں۔ ہندوستان اور بیرون ہندان کی مقبولیت کے ڈنکے بج رہے ہیں۔ لہک لہک کر شعر سناتے ہیں غزلوں کے علاوہ گیت

بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ ''میرا من کتنا پاگل'' ہے ان کا نہایت مقبول گیت ہے۔ ان کا ایک مشہور مصرعہ ملاحظہ ہو۔

وہ تسلی دیتے ہیں، زخم پر نمک رکھ کر، خوب ہے مسیحائی

قاضی سلیم جدید شعراء کے سرخیل ہیں۔ ہندو پاک میں ایم۔اے کے نصاب میں ان کی نظمیں شامل ہیں۔ سمغنی اور مس فٹ misfit ان کی مشہور نظمیں ہیں۔ وہ ہندوستانی اساطیری تلمیحات کے ماہر ہیں، مذکورہ دونوں نظموں میں ان کا بھرپور استعمال ملتا ہے۔ مس فٹ ایک غیر معمولی نظم ہے جو ان کے چھوٹے بھائی کے مفقود الخبر اور لاپتہ ہونے کے کرب کی آئینہ دار ہے۔ ان کی نظم کا کینوس بڑا ہوتا ہے۔ وہ پڑھتے بھی ایک خاص انداز سے ہیں۔ ہندوستان میں اردو نظم کے مشہور شاعر ''اختر الایمان'' ان کی شاعری کے مداح تھے اور انہیں شہریار کے ساتھ جدید شاعری کا بڑا شاعر مانتے تھے۔

بشر نواز کی آواز ہندوستان سے نکل کر ساری اردو دنیا میں پہنچ چکی ہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں لکھتے ہیں۔ غزل میں وہ مجروح اور خمار کے بعد نہایت مقبول شاعر ہیں۔ ان کے یہ اشعار اردو غزل میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔

رات روٹھے ہوئے لوگوں کو منالاتی ہے
آنکھ کھولوں گا تو یہ پھر سے بچھڑ جائیں گے

پتھر کا مری سمت تو آنا ضرور تھا
میں ہی گنہگاروں میں اک بے قصور تھا

ملاحظہ کیجئے ایک پرانے استاد کا شعر اور بشر کے اس شعر سے اسکا مقابلہ کیجئے

لاج رکھ لی مرے قاتل نے گنہگاروں میں
اس گنہہ پر مجھے مارا کہ گنہگار نہ تھا

جاوید ناصر سے پہلے ان کے والد اختر الزماں کا ذکر بھی ضروری ہے، یہ ایک استاذ شاعر تھے۔ان کی غزل میں سادگی لیکن پرکاری ہے۔ایک شعر دیکھئے

اب پھوٹ کے بہنے ہی کو ہیں پاؤں کے چھالے
ایسے میں کوئی راہ سے منزل کو ہٹالے

عربی مقولے "الولدُ سِرٌ لأبیه" یعنی بیٹا باپ کا راز ہوتا ہے کے مصداق ان کے بیٹے جاوید ناصر بھی بہت اچھی شاعری کرتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ بیٹا باپ سے بڑھ گیا۔ یہ جدید لب ولہجے کے شاعر ہیں اور آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر ہیں۔

مرحوم یعقوب عثمانی شمال سے تشریف لائے تھے لیکن دکن ہی کے ہو رہے۔ ان کا لہجہ صلابت لئے ہوئے۔ایک شعر ملاحظہ ہو ۔

آتو گئے ہو افتاں خیزاں
دیکھ تو لو یہ منزل ہے بھی!

ان کا یہ دعوی بجا ہے کہ ۔

پختہ ہے مرا ذوق نظر خام نہیں ہے

قمر اقبال نے بہت تھوڑا عرصۂ حیات پایا تھا۔ اگر اور جیتے رہتے تو بڑے شاعر ہوتے۔

اردو کی نئی نسل کے ایک نمائندہ شاعر فاروق شمیم ہیں جن کا انداز بیان سب سے نرالا ہے۔ ان کی غزل میں معنی کی تہیں کھلتی جائیں تو ایک لائق قاری کو لطف آتا ہے۔ ان کے اشعار میں صرف اکہرے معنی نہیں ہوتے۔

پروفیسر محمد عبدالوہاب جذبؔ نے اگرچہ شاعری دیر میں شروع کی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ افق شعر پر چھا گئے۔ حال ہی میں ان کا ایک دیوان گردش رنگ طرب کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی شاعری بڑی جوان ہے۔ اور اسی لئے وہ نوجوانوں میں مقبول ہیں۔ ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

وہ جو زخم تیر و بتر کے تھے انہیں وقت کر گیا مندمل
یہ زباں کا زخم ہے اس لئے مجھے شک ہے بھرنے میں گھاؤ کے

مرنے پہ بھی جو آنکھ ہماری کھلی رہی
شاید تمہاری دید کی دل کو ابھی تھی آس

پل میں پروانہ جلا سوز کی لذت نہ ملی
شمع کو دیکھ کہ جلتی ہے یہ جلتے جلتے

مجھ کو ڈسنے کے لئے دانت دکھاتے ہیں اب
آستینوں میں مری سانپ یہ پلتے پلتے

میں نے کہا کہ تیرا رخ، اس نے کہا کہ شمع ہے
میں نے کہا تو جلنے دے اس نے کہا نہیں نہیں

میں نے کہا کہ تیری آنکھ ، اس نے کہا کہ میکدہ
میں نے کہا تو پینے دے ، اس نے کہا نہیں نہیں!

ان کے بارے میں پاکستان کے ایک شاعر نے کہا ہے ۔

ارض دکن میں کتنے ہی شہکار ہیں پنہاں
تنہا وہاب میں کئی ادوار ہیں پنہاں
مضمون جذب پڑھ کے یہ عقدہ کھلا حبیب
پینسل کی نوک میں کئی اسرار ہیں پنہاں
(اشارہ مضمون پنسل کی طرف ہے۔)

میر ہاشم ایک سینئیر پختہ کار شاعر ہیں۔غزل اور نظم دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔فسادات کے پس منظر میں ان کا یہ شعر سراج کی زمین میں ملاحظہ ہو ۔

شریانوں میں بہتا نہیں سڑکوں پہ رواں ہے
یہ سرخ لہو کس کا ہے اے خاک وطن بول!

میر ہاشم تو پربھنی کے رہنے والے ہیں۔ایک عرصے سے اورنگ آباد میں منتقل ہو چکے۔مگر پربھنی کے متوطن ایک دوسرے شاعر جو ایک عرصے سے اورنگ آباد کو وطن ثانی بنا چکے ہیں ثاقب انور ہیں جنہوں نے درمیان میں شعر کہنا چھوڑ دیا تھا لیکن پچھے دنوں سے پھر شعر کہنے لگے ہیں۔ بہت معنی دار غزلیں کہہ رہے ہیں جن میں بھرپور

رومانیت ہے۔ پچھلے دنوں ان کی کتاب جس میں نظم ونثر دونوں کا امتزاج ہے ''صریر خامہ'' کے عنوان سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہے۔ یہ سب شعراء عالمی رابطۂ ادب اسلامی کی شاخ مرہٹواڑہ میں شریک ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح پربھنی کے نوجوان شاعر زرتاج ہاشمی بھی پربھنی سے آکر شریک ہوتے ہیں۔ ETV حیدرآباد میں بہترین شاعر کا انعام پا چکے ہیں۔ پربھنی کے عرفان پربھنوی بھی بہت اچھے شاعر ہیں ان کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

گھر کا بٹوارہ کیا ہوگیا
ہر خوشی در بدر ہوگئی

ج۔ پی سعید جو عام طور پر استاد کے نام سے جانے جاتے ہیں ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی غزلیں بھی تہہ دار ہوتی ہیں۔ وہ نئے شعراء کی تربیت بھی کرتے ہیں، چنانچہ ان کے ایک شاگرد سحر سعیدی بھی ایک اچھے شاعر ہیں جو صاحب دیوان ہیں۔ حال ہی میں اسلم مرزا کا دیوان گیلے پتوں کی مسکان شائع ہوکر ادبی حلقوں میں کھلبلی مچا چکا ہے۔ یہ نظمیں زیادہ کہتے ہیں غزل کے مقابلے میں۔ اور ان کی نظم پر قاضی سلیم کا عکس نظر آتا ہے۔

شاعروں کا وجود بے معنی ہوجائے اگر ان کو ڈھالنے والی انجمنیں نہ ہوں چنانچہ اورنگ آباد میں کئی ادبی انجمنیں ہیں۔ بزم سراج دکن کے صدر شاعر عبدالوہاب جذب ہیں۔ بزم عہد ساز مشاعرے اور ادبی جلسے کرواتی ہے۔ استاد ج پی سعید کی مطلع ادب سب سے پرانی بزم ہے۔ ارمغان ادب نامی بزم مشاعرے برپا کرتی رہتی ہے اس طرح اورنگ آباد میں کاروان ادب رواں دواں ہے۔

محمد معز الدین فاروقی ندوی
(اورنگ آباد)

مرہٹواڑہ کی ادبی اور لسانی خدمات

مرہٹواڑہ کے حدود اربعہ کا تعین جغرافیائی سے زیادہ سیاسی صورت حال کا تابع ہے۔ کیونکہ اس علاقے کو خاندیش یا آندھرا پردیش یا کرناٹک کی سرحد سے جغرافیائی حالات الگ نہیں کرتے تو یہ تفریق یا زبان کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔ یا ریاست مہاراشٹر کی موجودہ شکل کی وجہ سے ہے۔ مختصراً یوں کہا جاسکتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال اور دکن میں آصف جاہی سلطنت کے قیام کے بعد مراٹھی بولنے والوں کا جو علاقہ آصف جاہی سلطنت کے زیرنگیں آیا اسے مراہٹواڑہ کہا گیا۔ سقوط حیدرآباد سے پہلے مراہٹواڑہ کے پانچ اضلاع تھے ناندیڑ، پربھنی، عثمان آباد، بیڑ اور اورنگ آباد۔

اورنگ آباد اس علاقہ کا صدر مقام تھا اور یہیں صوبہ دار یا آج کی زبان میں ڈویژنل کمشنر کا آفس تھا۔ قدیم ریاست حیدرآباد کی لسانی تقسیم کے بعد یہ پانچوں اضلاع ریاست مہاراشٹر میں شامل کر لئے گئے اور انتظامی سہولت کے لئے یہ علاقہ پانچ

کے بجائے آٹھ اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا۔ نئے اضلاع جالنہ، لاتور اور ہنگولی ہیں۔

اردو ادب میں دکن کی اولیت ایک مسلمہ حقیقت ہے لیکن دکن میں اردو زبان کی تشکیل اور قدیم اردو ادب کی تخلیق میں مرہٹواڑہ اور خصوصاً اورنگ آباد جو اولیت وفوقیت رکھتا ہے۔ اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ ویسے قدیم تذکروں میں محاورۂ اورنگ آبادی کا ذکر ملتا ہے۔ جو دراصل شمالی ہند کی زبان ترکی، فارسی اور مراٹھی کے اختلاط سے پیدا ہونے والی اس زبان کا ایک نام تھا جو آگے چل کر اردو کہلائی۔ دراصل دیوگری (دولت آباد) پر علاؤالدین خلجی کے پہلے حملے کے بعد ہی سے اس دیار میں ایک مخلوط زبان کی تشکیل ہونی شروع ہوگئی تھی پھر جب محمد تغلق نے دلی کی پوری آبادی کو دولت آباد منتقل کیا تو اسی کے ساتھ شمال میں بولی جانے والی زبان بھی یہاں پہونچی اور علاقائی زبان مراٹھی سے مل کر ایک نئی شکل اختیار کرنے لگی۔

۱۳۴۵ء میں ان ترک سرداروں نے جو دکن میں سو سو گاؤں کے نگران تھے اور امیران صدہ کہلاتے تھے۔ مرکز سے علاحدہ ہو کر ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو بہمنی سلطنت کہلائی۔ بہمنی سلطنت کے قیام کا اعلان قلعہ دولت آباد میں کیا گیا۔ اور یہیں سے توسیع سلطنت کی کاروائیاں کی گئیں۔ اس طرح یہاں سے جانے والے سپاہی امراء اور اہل حرفہ اپنے ساتھ ایک نئی بنتی ہوئی زبان لے گئے جو بیدر، گولکنڈہ، گلبرگہ اور بیجا پور پہنچتے پہنچتے وہاں کی علاقائی زبانوں سے مل کر ایک نئی شکل اختیار کرنے لگی گو مرہٹواڑہ اور گولکنڈہ کے دکنی میں فرق ہے۔ اور بیجا پور کی دکنی ان دونوں علاقوں کی زبان سے قدرے مختلف ہے لیکن ذیلی اختلافات کو نظر انداز کر کے

پورے دکن کی زبان کو سہولت کی خاطر دکنی کہا گیا۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد پانچ حکومتیں وجود میں آئیں۔ جن میں گولکنڈہ کی قطب شاہی، بیجاپور کی عادل شاہی اور احمد نگر کی نظام شاہی قدیم اردو یا دکنی ادب کی سرپرستی میں ممتاز ہوئیں۔ احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت کے حدود میں موجود مرہٹواڑہ کا بڑا حصہ شامل تھا اور چونکہ اکبر کے دور ہی سے احمد نگر کے تعلقات شمال سے قائم ہو چکے تھے۔ اس لئے یہاں کی عام زندگی اور بول چال پر وہاں کے اثرات پڑنے لگے، گو ان تعلقات کی نوعیت کبھی معاندانہ اور کبھی دوستانہ رہی لیکن رابطہ بہرحال قائم رہا۔ اور اسی میل جول کا اثر تھا کہ سترہویں صدی کے ربع اول ہی میں نظام شاہوں کے درباری شاعر حسن شوقی کی زبان دکنی سے الگ اور موجودہ اردو سے بے حد قریب نظر آتی ہے۔ شوقی کی غزل اور مثنوی میں جو زبان ملتی ہے وہ میر اور سودا کی زبان سے مختلف نہیں جبکہ شوقی میر سودا تو کیا ولی دکنی سے بھی تقریباً ڈیڑھ دو سو سال پہلے کا شاعر ہے۔ اس اعتبار سے اردو کی وہ غزل جو بعد میں ولی، سراج سے ہوتی ہوئی میر و سودا تک اور ان سے دور حاضر تک پہونچی، حسن شوقی سے شروع ہوتی ہے اور ان کے توسط سے اس کا تعلق و رشتہ مرہٹواڑہ سے جڑتا ہے۔

سترہویں صدی کے نصف آخر میں اورنگ زیب نے اورنگ آباد کو اپنا مستقر بنایا اور اسی کے ساتھ دہلی کے امراء، سپاہی، دانشور وغیرہ یہاں آئے، ظاہر ہے ان کے ساتھ زبان، رسم و رواج اور تہذیبی اثرات بھی یہاں پہونچے۔ جس کی وجہ سے اس

علاقہ میں بڑی لسانی اور تہذیبی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ ولی کی زبان اور ان کی غزل کا مزاج متعین کرنے میں ان حقائق نے اہم کردار ادا کیا۔ چونکہ اورنگ آباد شمال وجنوب کا نقطۂ اتصال بن گیا تھا اس لئے یہاں کی عام زبان، ادبی مزاج اور یا تہذیبی مظاہر، سبھی اس میل ملاپ کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

ولی وسراج کے دور سے جس لسانی وادبی فضاء کی ابتداء ہوئی اس کا سلسلہ آصف جاہ سوم کے ابتدائی دور تک قائم رہا۔ آصف جاہوں کا پایہ تخت جب اورنگ آباد کے بجائے حیدرآباد قرار دیا گیا تو یہ چہل پہل بھی ختم ہوگئی اور اسی کے ساتھ اردو ادب میں اورنگ آباد کی مرکزی حیثیت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مولوی عبدالحق کی آمد اور انجمن ترقی اردو کی اورنگ آباد منتقلی کی وجہ سے پھر اس علاقہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ مولوی صاحب نے ''اردو سہ ماہی'' اور ''سائنس'' کے اجراء کے علاوہ تقریبا سو، سوا سو کتابیں یہاں سے شائع کیں، جن میں کلاسیکی اور اردو شعراء کے دواوین وانتخاب نیز سائنس، سیاسیات اور سماجیات وغیرہ کے تعلق سے اہم کتابوں کے تراجم و تصنیفات بھی شامل ہیں۔

آج کے شعری منظر نامہ کے سلسلہ میں ماضی کی تاریخ کے اوراق الٹنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان بکھری بکھری کڑیوں کو جوڑ کر ایسے نتائج برآمد کر سکیں جو مرہٹواڑہ اور اسکے توسط سے مہاراشٹر میں اردو کی لسانی اور ادبی روایت کی عمر میں تقریبا دوسو سال کا اضافہ کر سکتے ہیں۔ اور اس علاقے میں نئی لسانی اور تہذیبی تبدیلیوں کے ابتدائی نقوش

تیرہویں صدی کے نصف آخر میں دیکھ سکتے ہیں۔

اس علاقے میں وقفہ وقفہ سے ایسے اہلِ قلم بھی پیدا ہوتے رہے جو تاریخ ادب کا حصہ بنے۔ اور ایسے خاموش خدمت گذار بھی سامنے آئے جنہوں نے مقامی طور پر نہ صرف علم و ادب کی شمع روشن رکھی، بلکہ ایسے ذہنوں کی تربیت بھی کی جو اردو کے جانے پہچانے نام بنے۔

سکندر علی وجدؔ، یعقوبؔ عثمانی، اختر الزماں ناصرؔ، ہریش چندر دکھی جالنوی کی شناخت تو آزادی سے پہلے بن چکی تھی لیکن آزادی کے تیس پینتیس سال بعد تک ان کا ادبی سفر جاری رہا۔

سکندر علی وجدؔ اردو دنیا کا جانا پہچانا نام ہے۔ وہ اپنی نظموں اجنتہ، ایلورہ، رقاصہ اور تاج محل کی وجہ سے اردو کی نظمیہ شاعری میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ رشید حسن خان انہیں اردو کی دکنی روایات کا آخری امین قرار دیتے ہیں۔ وجد کی شاعری کا بنیادی وصف جمالیات، فضا آفرینی، نغمگی اور شائستگی ہے۔ ''آفتاب تازہ'' ''اوراق مصور''، ''بیاض مریم'' انکے شعری مجموعے ہیں۔ حال ہی میں ان تمام مجموعے کو ''جمال ....، جلال ہمالہ'' کے نام سے کلیات کی شکل میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

یعقوب عثمانی تقریباً چالیس سال تک اردو کے استاذ کی حیثیت سے مرہٹواڑہ بھر کے اردو طلبا کی ذہنی تربیت کرتے رہے۔ اسی کے ساتھ انہوں نے باصلاحیت نوجوان شعراء کی رہنمائی بھی کی۔ انہیں اردو فارسی اور کسی حد تک عربی کلاسیکی شاعری کی اہمیت کا احساس بھی دلایا۔ اور فن و زبان کے رموز و نکات سے بھی آگاہ کیا۔ عثمانی

خود بھی کلاسیکی رکھ رکھاؤ کے ساتھ عمدہ شعر کہتے تھے۔ ان کی غزل عصری تقاضوں کو بھی پورا کرتی ہے اور زبان و بیان کے کلاسیکی معیار پر بھی کھری اترتی ہے۔

اسی کا ڈر تھا ان کے روبرو جا کر سنانے میں
حقیقت کی جھلک آہی گئی آخر فسانے میں

اختر الزماں ناصر کی غزل اپنا ایک الگ مزاج رکھتی ہے۔ جن میں پیکر تراشی اور زبان کی شفافیت مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ اختر صاحب نے غزل میں متحرک پیکروں کے استعمال کی ابتداء تو نہیں کی لیکن اسے اس تواتر اور سلیقہ سے برتا کہ یہ شعری رویہ ان کی پہچان بن گئی۔ اور اس زمانے میں بھی انہوں اس رویہ کو برقرار رکھا۔ جس زمانے میں غزل راست بیانیہ اور نیری اظہار کے قریب پہونچ گئی تھی۔ ان کی دوسری خصوصیت بول چال کی زبان کا تخلیقی استعمال ہے۔ بد قسمتی سے ان کی آواز مرہٹواڑہ سے باہر کم پہونچی لیکن اس سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو کوئی نقصان نہیں پہونچا۔ البتہ ان کی کم گوئی اور بے نیازی نے انہیں ان کے کام کو مرہٹواڑہ سے باہر پہونچنے نہیں دیا۔ نمونہ

پھر تصور میں کوئی آباد ہے
تیرتے پھرتے ہیں آنکھوں میں گلاب
دور تک جاتا ہوں ان کو دیکھنے
اور کیا دوں دل کی دھڑکن کا جواب

ان کے فوری بعد آنے والوں میں حمایت علی شاعرؔ، عبدالرؤف عروج، فرہاد زیدی،

اطہر رضوی اور سحر الفاری کے نام آتے ہیں۔لیکن آزادی کے تین چار سال بعد ہی یہ گروپ بکھر گیا۔

۵۲-۱۹۵۰ء میں قاضی سلیم، شفیق فاطمہ شعری انور معظم اور ۵۵-۱۹۵۴ء میں احسن یوسف زئی، وحید اختر اور مبشر نواز نے شاعری کا آغاز کیا اور یہ سبھی لکھنے والے بہت جلد اردو کے ادبی حلقوں میں بہت جلد پہچانے جانے لگے۔ان شعرا کو آزادی کے بعد ہونے والی تبدیلیوں اور عالمی سطح پر بدلتے ہوئے رجحانات کا پورا اندازہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے اپنے اظہار کیلئے نئی نئی راہیں تلاش کرنا شروع کیں۔گوان پر ترقی پسند تحریک کے اثرات بھی پڑے لیکن ان لکھنے والوں نے اس کی رومانیت اور نئی قدروں سے دوری کے خلاف آواز بھی اٹھائی۔

وحید اختر نے ۱۹۵۷ء میں ''ماہنامہ صبا'' میں ایک طویل مضمون لکھا جو ''سخن گسترانہ بات'' کے نام سے بطور اداریہ شائع ہوا۔ یہ پہلا مضمون تھا جس میں ادب کی بدلتی ہوئی قدروں کی تلاش پر زور دیا گیا تھا۔اسی کے ساتھ ادب میں در آنے والی ادبی نیت اور غیر جمالیاتی رویوں کو رد کیا گیا۔ اور پہلی مرتبہ آزادی کے بعد پیدا ہونے والے ادب کے مزاج کو تشکیکی مزاج قرار دیا گیا۔اردو میں غالباً ادبی سطح پر تشکیک کی اصطلاح بھی وحید اختر نے پہلی مرتبہ استعمال کی۔اس مضمون پر کافی طویل مباحثہ چھڑا جس میں سجاد ظہیر نے بھی حصہ لیا۔ اس کے فوری بعد مبشر نواز کے دو مضامین ''صبا'' اور ''شاعر'' میں شائع ہوئے جن میں ادب کی بدلتی ہوئی صورت حال کا جائزہ لیا گیا تھا اس اعتبار سے جدیدیت کی ابتداء ۱۹۶۰ء سے پہلے ہوئی ہے گو آگے چل کر جدیدیت

میں اور بھی کئی چیزیں شامل ہوئیں اور ''شب خون'' کے اجراء کے بعد جدید رویہ اردو ادب کا حاوی رویہ بنا۔ لیکن اس کے بنیاد گذاروں میں قاضی سلیم، شفیق فاطمہ شعری اور وحید اختر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آج بھی یہ شعراء اہم جدید شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن عرض یہ کرنا ہے کہ جدیدیت کے فیشن بننے سے بہت پہلے اردو میں جدید رجحانات کو شامل کیا گیا۔ ۱۹۶۰ء کے قریب جوگندر پال، فضیل جعفری، عصمت جاوید، عالی جعفری اور ان کے کچھ ہی دنوں بعد صادق، عتیق اللہ اور شمیم احمد بھی اورنگ آباد آگئے۔ اس طرح یہاں نئے لکھنے والوں کا کافی بڑا گروپ بن گیا۔ اس زمانے میں فضیل جعفری، مبشر نواز، عصمت جاوید، عتیق اللہ اور شمیم احمد نے مسلسل اپنے مضامین لکھے۔ جنہوں نے جدید رجحانات کو اردو ادب کا حاوی مزاج بنانے میں کافی اہم کردار ادا کیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے مضامین میں جدید ادب اور خصوصاً شاعری میں راہ پانے والے غیر ضروری تجربوں، بے جا لسانی شکست وریخت اور فیشن زدہ ہیئت پرستی کے خلاف بھی موثر انداز میں آواز اٹھائی گئی۔ جوگندر پال، قاضی سلیم اور مبشر نواز کی ادارت میں مرہٹواڑہ یونیورسٹی کی جانب سے شائع کیا جانے والا جدید شعری انتخاب جدیدیت کے مثبت اور متوازن رویہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اسی طرح عتیق اللہ اور شمیم احمد کی ادارت میں شائع ہونے والا سہ ماہی ''غبار خاطر'' بھی آزادی کے بعد وجود میں آنے والے اردو ادب کے مزاج کے تعین میں مددگار ثابت ہوا۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو آزادی کے بعد کے ادب میں مرہٹواڑہ ایک بے حد اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یہاں کے لکھنے والوں میں قاضی سلیم جدید ادب میں کافی اہم

مقام کے حامل ہیں۔ ان کی نظمیں اپنے انفرادی لب ولہجہ میں تہہ درتہہ معنویت کی وجہ سے الگ پہچانی جاتی ہیں اور اردو ادب کا اہم حصہ سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے دو مجموعے ''نجات سے پہلے'' اور ''رست گاہی'' شائع ہو چکے ہیں۔ شفیق فاطمہ شعری، بقول فضیل جعفری اردو شاعری میں پہلی توانا نسائی آواز ہے۔ ان کی نظموں نے ۵۵۔۱۹۵۴ء ہی میں ادبی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا گو بعض اوقات ان کی زبان اور طرز اظہار کسی قدر اجنبی لگتا ہے۔ لیکن ان کی نظموں کی گہرائی معنویت، اشعار سازی اور اساطیر سے مناسب فائدہ اٹھانے کا انداز ان نظموں کو منفرد بھی بناتا ہے اور وقیع بھی۔ شعری کے دو مجموعے ''آفاق نوا'' اور ''گلہ صفورہ'' شائع ہو چکے ہیں۔

وحید اختر کی نظمیں اپنے بیانیہ اسلوب اور وسیع کینوس کی وجہ سے اردو کی جدید نظمیہ شاعری میں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ وحید اختر کے یہاں سیاسی شعور بھی ہے اور اس کے تجزیہ کی صلاحیت بھی۔ اردو کی نظمیہ شاعری میں اور خاص طور پر ہم عصر شاعری میں وحید اختر زبان و بیان پر قدرت اور قوت اظہار کے سبب سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین بھی ہم عصر ادب پر وقیع تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وحید اختر کے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انکی طویل نظم ''شہر ہوس'' نے نقادوں اور پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ ''کربلا تا کربلا'' انکے مرثیوں کا مجموعہ ہے جس میں مرثیہ کی ہیئت اور موضوع کو نئے سیاق وسباق میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں، جن

میں ''تنقید کی فلسفیانہ اساس'' جدید تنقید میں کافی اہمیت رکھتی ہے۔

بشر نواز شاعر اور نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ان کے مضامین میں بھی اور شاعری میں بھی روایت اور اسکی اہمیت پر اصرار ملتا ہے۔ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۵۴ء کے قریب ہوا اور یہ جلد ہی ادبی حلقوں میں پہچانے جانے لگے۔ جدید رجحانات کو انھوں نے اپنے انداز میں قبول کیا اور نئے موضوعات کو زبان و بیان کی پوری پاسداری کے ساتھ پیش کیا۔اس طرح ان کا ایک الگ لہجہ بنتا ہے۔ بشر نواز کی شاعری میں شاید سب سے زیادہ مقامی پیکروں اور آس و پاس کی زندگی سے لئے ہوئے استعاروں کا استعمال کیا جاتا ہے۔انکے اپنے بیان کے مطابق اپنی زمین سے جڑ کر ہی اچھی شاعری کی جاسکتی ہے۔ان کا ذہنی سفر مقامیت سے شروع ہوتا ہے اور انسانی رشتوں کی لامحدودیت پر ختم ہوجاتا ہے۔ان اشعار سے ان کے ذہنی رویہ کا پتہ چلتا ہے ۔

سمجھے گا کون جاگتی آنکھوں کے کرب کو
میں اپنے حادثہ کا اکیلا گواہ ہوں
بھیگ کر تو یہ مٹی پاؤں اور جکڑے گی
آنسوؤں کی بارش سے پہلے ہم بچھڑ جائیں

(مرہٹواڑہ کی زمین چکنی کالی مٹی کی زمین ہے)

بشر نواز کے دو شعری مجموعے ''رائیگاں'' اور ''اجنبی سمندر'' شائع ہو چکے ہیں۔

ان شعراء کے فوری بعد قمر اقبال ، جاوید ناصر، رؤف انجم، پروفیسر محمد

عبدالوہاب جذب، شاہ حسین نہری، سحرؔ سعیدی، یوسفؔ عثمانی اور رعناؔ حیدری کے نام سامنے آتے ہیں۔ ان میں قمر اقبال، پروفیسر محمد عبدالوہاب جذب اور جاوید ناصر آج اردو ادب کے جانے پہچانے نام ہیں۔

قمر اقبال بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں جدید ہیئت کے ساتھ ساتھ نجی تجربات اور ذات غم بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا لہجہ سبک اور پر اثر ہے۔ ان کی بے وقت جدت نے اردو کو ایک اچھے شاعر سے محروم کردیا۔ قمر اقبال اپنی تثلیثات کی وجہ سے بھی پہونچانے جاتے ہیں۔ ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''بوم کا شہر'' میں غزلیں ہیں اور ''تتلیاں'' میں تثلیثات اور کچھ نظمیں ہیں۔ ایک تثلیث ملاحظہ فرمائیں۔

دو پڑوسی جو ملک ہوتے ہیں
ان کے بچھڑے ہوئے سبھی رشتے
سرحدوں سے لپٹ کے روتے ہیں

☆☆☆☆☆

ہم کو یہ درد کا رشتہ نہیں جینے دے گا
گر جئے بھی تو زیادہ نہیں جینے دے گا

☆☆☆☆☆

پریشاں حال سہی بکھرے بکھرے بال سہی
یہ لوگ وہ ہیں جو دنیا سنوار دیتے ہیں

جاوید ناصر اپنے لہجہ کی تازگی اور تجریدی فکر کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتے

ہیں بقول قاضی سلیم ''جاوید ناصر کی شعری ڈرافٹنگ ہیئت ان کی سوچ کی پابند ہے جس طرح کے اسباب وعلل کی ترتیب میں تبدیلیاں کرکے وہ محسوسات کے نت نئے روپ دکھاتے ہیں اسی طرح ہمارے روایتی مناسبات لفظی کے شیڈول میں بے غل وغش تبدیلیاں کرکے اپنی نئی ترتیب بھی بناتے ہیں''۔

رات آجائے تو پھر تجھکو پکاروں یارب
میری آواز اجالے میں بکھر جاتی ہے
تنگ آچکے ہیں لوگ مسلسل سکون سے
عالم پناہ شہر میں اب قتل عام ہو

وہاب جذب نے گو دیر سے شاعری شروع کی پر اپنے منفرد لب ولہجہ کی وجہ سے اپنا الگ مقام بنایا۔ملاحظہ ہو۔

جلتا رہا جو آپ کی الفت میں عمر بھر
الفت میں ان کی ایک دیا تو جلایئے
راتوں کو اٹھ کے اب جو دعا مانگتے نہیں
کیا مل گیا صنم کہ خدا مانگتے نہیں
مجھکو ڈسنے کے لئے دانت دکھاتے ہیں اب
آستینوں میں مری سانپ یہ پلتے پلتے
وہ دور کہ دل یاد سے خالی ہے خدا کی
اس دور کو ہم اہل نظر کہتے ہیں فترت
جن کو غرور تاج دری ہے جہان میں

ان کو غروب شمس کا منظر دکھائے

مراہٹواڑہ کے لکھنے والوں کی جدید ترین پیڑھی میں فاروق شمیم، سلیم محی الدین (میرٹھی) فہیم احمد صدیقی (ناندیڑ) کے علاوہ خان شمیم، وحید کلیم وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔

فاروق شمیم کی غزل جدید وقدیم کے امتزاج کا خوبصورت نمونہ ہے۔ حال ہی میں ان کا مجموعہ ''پیش'' اور ''غزلیں'' شائع ہوا ہے جو ادبی حلقوں میں کافی قدر کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔

سلیم محی الدین کا مجموعہ ''وابستہ'' بھی نئی غزل کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مرہٹواڑہ میں اردو نثر کی زیادہ قدیم روایت نہیں ہے۔ یوں تو تذکرے اور مذہبی تصانیف اٹھارویں صدی کی ابتدا ہی سے ملتی ہے ہم اسے مربوط روایت نہیں کہہ سکتے کیونکہ اول تو ایک کتاب اور دوسری کتاب کے درمیان کافی بڑے بڑے فاصلے ہیں دوسرے یہ کہ اکثر تذکرے فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ قدیم دور میں قصہ کہانیوں یا داستان کی کوئی کتاب ملتی ہے نہ مخطوطہ، ویسے بیسویں صدی کے ربع دوم میں کچھ لوگوں نے افسانے لکھے لیکن ان میں سے کوئی نام بھی اردو افسانے میں اپنی جگہ نہ بنا سکا۔ عزیز احمد اور ابراہیم جلیس کا کچھ تعلق مرہٹواڑہ سے رہا ہے لیکن نہ یہ علاقہ ان کا مولد ہے اور نہ ان کی ذہنی تربیت میں اس علاقہ کا کوئی ہاتھ ہے اس لئے انھیں یہاں سے جوڑنا نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ مرہٹواڑہ میں اردو افسانہ ۱۹۵۰ء کے بعد ایک حاوی رجحان کی حیثیت سے سامنے آیا۔ آزادی سے پہلے شاہین فاروقی نے افسانے لکھنے

شروع کئے تھے اور یہ سلسلہ پچاس بلکہ ساٹھ تک جاری رہا۔ ان کے بعد رفعت نواز، سریندر کمار، مہرا، محمود شکیل، الیاس فرحت، اثر فاروقی اور رشید انور نے افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو دنیا کو متوجہ کیا۔ یہ لوگ رفعت، الیاس اور شکیل مسلسل لکھتے رہے اور آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ رفعت نواز کے دو مجموعے ''وہ بات'' اور ''فسانہ کہیں جسے'' شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی کہانیاں زندگی کی چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کی بازیافت سے عبارت ہیں۔ الیاس فرحت کے افسانوں کا مجموعہ ''لمس کا المیہ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ محمود شکیل کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا لیکن ان کے کئی افسانے ملک اور بیرون ملک کے معتبر رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ انہیں کے ہم عصروں میں حامد یوسف، ابراہیم اختر، شاہ رخ صحرائی کے نام لئے جا سکتے ہیں، ان افسانہ نگاروں کے بعد حمید سہروردی اردو کے تجریدی افسانوں میں جانا پہچانا نام ہے۔ ان کے افسانے اکثر اوقات غیر ضروری طور پر گنجلک اور مبہم ہو جاتے ہیں تاہم جہاں وہ ان کمزوریوں پر قابو پا لیتے ہیں ان کا افسانہ ایک نئے لطف سے آشنا کرتا ہے۔ ''ریت ریت لفظ'' اور ''عقب کا دروازہ'' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ان کے بعد دو افسانہ نگار نورالحسنین اور عارف خورشید نے اپنے افسانوں کے ذریعہ اردو کے ادبی حلقوں کو متوجہ کیا۔ نورالحسنین کہانی پن اور کردار نگاری دونوں کو اہم سمجھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے تین مجموعے ''سمٹے دائرے''، ''مور رقص اور تماشائی''، ''گڑھی میں اترتی شام'' شائع ہو چکے ہیں۔ عارف خورشید نے افسانہ نگاری کے علاوہ دوسری اصناف سخن کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ ان کی اولین دلچسپی افسانہ ہے۔ یہ قدرے تجریدی انداز

اورکہانی پن کو ملا کر اپنے افسانے کا تانا بانا بنتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعوں میں ''سنہری رت کا فریب'' ''یہ شام بھی کہاں ہوئی'' ''احساس کا زخمی مجسمہ'' ''قافلے والو سچ کہنا'' اورخاکوں کا مجموعہ ''تنظیم کثیر رنگی'' ادبی حلقوں میں معروف ہیں۔ان کے علاوہ عظیم راہی، سلیم احمد، متین قادری، قاضی مشیر، جعفر جمال بھی لکھ رہے ہیں۔

مرحوم مجید جمال، ارتکاز افضل، ظہیر علی اور حمید خان نے گو بہت کم لکھا۔ لیکن ان کے یہاں ستھرا ادبی ذوق اور عصری عالمی ادب سے آگاہی موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ اپنی کم نویسی کے باوجود انہوں نے اردو اور خصوصی طور پر مراٹھی کے ادبی رویوں کو متاثر کیا۔ ارتکاز افضل نے کئی تنقیدی مضامین لکھے مراٹھی کی عصری نظموں کا منظوم ترجمہ کیا اور اردو کے کچھ نئے لکھنے والوں کو متعارف کروایا۔ظہیر علی آج کل جدید اردو نظموں کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے صابردت کے ساتھ مل کر ''فن اور شخصیت'' کے کئی نمبر ترتیب دئے۔اس میں کوائف نمبر دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

محمد فرمان نیپالی ندوی

اردو زبان وادب کی تشکیل میں نیپال کے مختلف علاقوں کا حصہ

دنیا کے جغرافیائی نقشہ میں نیپال ایک چھوٹا سا ملک ہے، یہ ہندوستان کے جوار میں واقع ہے، اس کے حدود اربعہ میں خشکی ہی خشکی ہے، مشرق، مغرب اور جنوب میں ہندوستان اور شمال میں چین پڑتا ہے، اس کی لمبائی زیادہ اور چوڑائی کم ہے، اس کا کل رقبہ (۱۴۵۱۱۸) مربع کلومیٹر ہے، عموماً اس کی سرحدیں یوپی اور بہار کے اکثر علاقوں سے ملتی ہیں، جبکہ نیپال کی سرحدیں ۱۸ویں صدی عیسوی میں متعین کی گئی ہیں۔ نیپال دنیا کے دو عظیم ملکوں کے مابین واقع ہونے کی وجہ سے چھوٹا دکھائی دیتا ہے، لیکن اہل دانش جانتے ہیں کہ دنیا میں اس سے بھی بہت چھوٹے ممالک ہیں، جن کی حیثیت بھی نمایاں نہیں ہے جیسے سری لنکا، بھوٹان، مالدیپ، اسرائیل اور ڈنمارک وغیرہ۔

علامہ محمود شاکر مصری نے ذکر کیا ہے کہ نیپال قدیم زمانہ میں ہندوستان کا حصہ تھا، ان کے الفاظ ہیں: وھی جزء منھا قبل تقسیمھا (۱) اسی طرح کے

کچھ اقوال بعض دیگر مورخین نے بھی نقل کئے ہیں، بہر حال اس وقت نیپال ایک مستقل ملک کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا اپنا نظام، اس کے اپنے ملکی قاعدے اور ضابطے ہیں، وہ تین علاقوں میں منقسم ہے۔

(۱) ہمالیائی علاقہ، یہ ملک کے شمال میں پڑتا ہے، یہ اونچی اونچی چوٹیوں سے بنا ہوا علاقہ ہے، جہاں برف باری خوب ہوتی ہے، ساگر ماتھا (Mount Everest) اسی میں پڑتا ہے، اس کی اونچائی ۸۸۴۸ میٹر ہے، یہ دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ کی چوٹی ہے، اس علاقہ میں سردی بہت پڑتی ہے، آبادی بہت کم ہے، ملک کی بیشتر بڑی ندیاں اسی علاقہ کی گودی میں کھیلتی ہوئی گذرتی ہیں، ان میں ہمیشہ پانی رہتا ہے، اور نیپال کا سب سے نچلا حصہ ''کالی گنڈکی'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

(۲) پہاڑی علاقہ، یہ ہمالی علاقہ کے جنوب کی طرف کا پہاڑی حصہ ہے، اس علاقہ کی پہاڑیوں کے درمیان بہت سی وادیاں بھی ہیں جن میں کاٹھمانڈ اور پوکھرا، نرائن گھاٹ کی وادیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۳) ترائی علاقہ، پہاڑی علاقہ کے جنوب کی طرف کا میدانی حصہ جو ہندوستانی سرحد سے جڑا ہوا ہے، ترائی علاقہ کے نام سے جانا جاتا ہے، اس علاقہ میں آبادی زیادہ ہے۔

ملک نیپال آبادی کے لحاظ سے تقریباً دو کروڑ افراد پر مشتمل ہے، پہاڑی اور میدانی علاقوں میں آبادیاں بہت گھنی ہیں، اس کے بالمقابل ہمالی علاقہ میں آمد ورفت کی دشواری کی وجہ سے بہت کم آبادی ہے، نیپال میں مختلف نسل اور عقیدے کے لوگ

بستے ہیں، اوران کی الگ الگ تہذیبیں اورمختلف مذاہب وادیان ہیں، ان طبقات میں برہمن، چھتری، مسلمان، کرنگ، نوار، مکر، تماگ، شیر با، بھوٹے، تھارو، رائی اور لمبو وغیرہ ہیں۔ چونکہ نیپال دنیا کا واحد آئینی ہندو ملک ہے، اسی لئے یہاں ہندو مذہب کے ماننے والے زیادہ ہیں، ہندوؤں کی اس کثرت ہی کو دیکھ علامہ شکیب ارسلان نے لکھا ہے کہ ”وأهل نيبال خمسة ملايين كلهم هندوس “(۲) یعنی نیپال کے باشندوں کی تعداد پانچ ملین یعنی پچاس لاکھ ہے اورسب ہندو ہیں، واضح رہے کہ یہ اعداد وشمار بہت پہلے کے ہیں، اس لحاظ سے تعداد میں فرق کوئی قابل غورنہیں ہے، دوسرے نمبر پر بدھ مذہب کے ماننے والے ہیں کیونکہ تبت اورچین میں ان کی اکثریت ہے، یہ پہاڑی اور ہمالی علاقوں میں آباد ہیں، ترائی علاقوں میں خال خال نظرآتے ہیں۔

مسلمان نیپال میں تیسرے نمبر پر ہیں، سرکاری اعداد وشمار کے مطابق ان کی تعداد دس لاکھ ہے، لیکن صحیح تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے، نیپال میں اسلام کے آمد کی تاریخ کا سرا پانچویں صدی ہجری سے ملتا ہے، عرب تاجروں کے ذریعہ یہاں کے افراد حقیقت اسلام سے روشناس ہوئے، شاید اسی وجہ سے راجدھانی کاٹھمانڈو کے قلب میں ایک مارکیٹ ”عراقی مارکیٹ“ کے نام سے موجود ہے، کاٹھمانڈو شہر میں مسلمانوں کے آباد ہونے کے بارے میں کچھ ہندوستانی مورخین کا کہنا ہے کہ حاکم بنگال شمس الدین الیاس نے ۱۳۴۹ء میں جب کاٹھمانڈو پرحملہ کیا تو اس وقت کثیر تعداد میں مسلمان وہاں جاکر آباد ہوئے، بعضوں نے بودو باش اختیار کی اور اپنی

تجارت فروغ دینے میں لگ گئے۔(۳) اور ۱۵۲۰ء میں کشمیری اور تبتی مسلمان کاٹھمانڈو میں آکر آباد ہوئے اور یہاں ۱۵۲۴ء میں پہلی مسجد بنائی جو کشمیری جامع مسجد کے نام سے جانی جاتی ہے، ایک مسجد جو نیپالی جامع مسجد کے نام سے مشہور ہے وہ ۱۷۰۱ء میں تعمیر ہوئی تھی، بعض تاریخ نویسوں نے لکھا ہے کہ مغلیہ حکومت کے زمانہ میں کشمیر سے آکر یہاں کچھ لوگ آباد ہوئے جس سے یہاں اسلام کے پھلنے اور پھولنے کا موقع ملا، برطانوی استعمار کے زمانہ میں نواب واجد علی شاہ کی دوسری بیوی بیگم حضرت محل اپنے بیٹے برجیس قدر اور بہت سے مسلمانوں کے ساتھ کاٹھمانڈو میں پناہ گزیں ہوئی تھیں۔(۴) بہرصورت مسلمان نیپال میں اپنی ایک شناخت رکھتے ہیں، بعضوں کو سرکاری اداروں میں شریک کیا گیا ہے اور انہیں عہدے بھی ملے ہیں۔

نیپال کے مختلف علاقوں میں متعدد زبانیں رائج ہیں، بعض محققین نے ان کی تعداد چالیس بتائی ہے، سرکاری طور پر نیپالی زبان کو خاص اہمیت حاصل ہے، یہی زبان دفاتر اور سرکاری محکموں میں استعمال ہوتی ہے۔اس کا رسم الخط ہندی رسم الخط کی طرح ہے، ہندو ملک ہونے کی وجہ سے سنسکرت کے الفاظ کا اس میں پایا جانا ناگزیر ہے۔ نیپالی زبان کے بعد جس زبان کو یہاں کے باشندے زیادہ استعمال کرتے اور بولتے ہیں وہ اردو ہے، برصغیر کی سطح پر اردو زبان اور مسلمان ایسے لازم وملزوم ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا، دونوں کا جسم وروح کا تعلق ہے، جہاں کہیں بھی اس خطہ میں مسلمان آباد ہیں بہت نازش وافتخار کے ساتھ اردو زبان بولتے اور سمجھتے ہیں۔

راقم چونکہ نیپال کا رہنے والا ہے، اس لئے اسے وطن مالوف کے بارے میں خوب معلوم ہے، لیکن اس وقت اپنی کوئی ذاتی رائے پیش نہ کرنے سے پہلے بین الاقوامی تنظیم رابطہ عالم اسلامی کے معاون جنرل سکریٹری محمد بن ناصر العبودی کا بیان نقل کرنا مناسب سمجھتا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''اس ملک میں مسلمان آٹھ فیصد ہیں اور وہ اردو زبان بولتے ہیں، رہی نیپالی زبان تو وہ ملک کی سرکاری زبان ہے جو ہندی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے'' انہوں نے اپنے سفرنامہ "فی نیبال بلاد الجبال" میں اس کو مثال سے واضح کیا ہے کہ ''میں ایک دوکان پر کچھ خریدنے کے لئے گیا تو دیکھا کہ کالے رنگ کی ایک گول چیز رکھی ہوئی ہے، دور سے آلو کی شکل نظر آتی تھی، میں نے دوکاندار سے پوچھا تو اس نے اپنی زبان میں کہا کہ ''یہ صابن ہے'' اور شہر کاٹھمانڈو میں ایک مسجد کے حوض کے پاس وضو کرنے کے لئے گیا تو دیکھا کہ کتبہ پر لکھا ہوا ہے کہ ''حوض جدید تعمیر کردہ'' (۵)

اس سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اردو یہاں کی عام لوگوں کی بھی زبان ہے، اور یہاں کے لوگ اسے بولتے ہیں اور فخر محسوس کرتے ہیں، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو زبان کی تعمیر وترقی میں بلکہ تاسیس میں مسلمانان نیپال نے غیر معمولی حصہ لیا ہے اور انہیں کے دم سے یہاں اس کا ڈھانچہ تیار ہوا ہے جب حقیقت کچھ اس طرح ہے تو زبان جو کہ ثقافت کا نمائندہ بلکہ آئینہ ہوتی ہے اس کے اثرات کا نیپالی قوم پر پایا جانا ناگزیر ہے، اردو زبان کے بولنے اور استعمال کرنے سے نیپال کے ہر علاقہ میں کچھ نہ کچھ اسلامی اقدار اور عربی خصوصیات کی جلوہ گری ضرور نظر آئے

گی، اس کے اور بہت سے اسباب ہیں لیکن ان میں سے ایک سبب یہ بھی ہے۔

اردو زبان وادب کے تحفظ وبقا اور اس کی تشکیل نیز اس کے فروغ میں مسلمانان نیپال نے مختلف سطح کے ادارے، معاہد، مدرسے اور جامعات قائم کئے ہیں، ان میں اردو زبان کو لازمی زبان کی حیثیت سے داخل کیا، چنانچہ پرائمری کے درجات میں مولوی اسماعیل میرٹھی کی اردو ریڈریں اکثر مدارس میں داخل نصاب ہیں، اور درس وتدریس کی زبان بھی اردو ہوتی ہے، علمائے نیپال مسجدوں اور جلسوں میں افہام وتفہیم کے لئے عموماً جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ اردو ہوتی ہے، ترائی علاقوں کے اکثر حصوں میں نیپالی زبان برائے نام ہے لیکن اردو کی بگڑی ہوئی شکل یہاں رائج ہے، جس کو عوام آپسی گفتگو میں اظہار خیال کا ذریعہ بناتے ہیں، اگر کوئی اردوداں عالم اس علاقہ بلکہ پہاڑی علاقہ میں بھی چلا جائے تو اسے دعوت واصلاح کے لئے بہت زیادہ دشواری نہیں پیش آئے گی بلکہ بہت آسانی سے مخاطبین کے سامنے اپنی بات رکھ سکے گا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بقول: شمالی ہند اور نیپال کے ترائی علاقوں میں حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اجل مولانا جعفر علی نقوی صاحب ''منظورۃ السعداء'' کی دعوت واصلاح کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں اور وہاں مدارس وجامعات کا وجود انہی کی انتھک کوششوں کا ثمرہ ہے(۶)۔

جن دینی اداروں اور درس گاہوں نے اردو زبان کو ایک زندہ زبان کی حیثیت سے نیپالی معاشرہ میں پیش کیا اور اس کی تشکیل میں اپنی توانائیاں صرف کیں، ان میں ایک باوقار نام ''جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر'' کا ہے، اس مدرسہ کے بانی الحاج نعمت

اللہ خاں رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے نفس گرم نہ صرف یہ کہ نیپالی مسلمانوں میں ایمانی جذبہ اور دینی حمیت کو پیدا کیا اور دین کی فضا قائم کی بلکہ اردو زبان کو اختیار کر کے اس کے تحفظ و بقا کا سامان فراہم کیا، اور لوگوں کو جہالت و تاریکی کے دبیز پردوں کے چاک کرنے پر آمادہ کیا، پھر یہ علم انہیں کے خلف الرشید خطیب الاسلام حضرت مولانا عبد الرؤف رحمانی جھنڈانگریؒ کے ہاتھ آیا، انہوں نے اس کو سرسبزی و شادابی عطا کر کے مختلف سطح کے علماء و صلحاء کو جوڑ کر اسلام کی خدمت کو اپنا جزو زندگی بنالیا۔ اور مستقل تقریر و خطابت، تصنیف و تالیف کے ذریعہ نیپال میں اردو کے گیسوئے پرخم کو سنوارنے میں مشغول رہے اور لوگوں کو کتاب و سنت پر مضبوطی کے ساتھ جمنے کے بعد اسی کا کل کے گرفتار ہونے پر ابھارا، حضرت خطیب الاسلام نے چار درجن(۱) سے زائد اردو زبان میں علمی کتابیں لکھ کر نیپال میں اردو کے فروغ و تشکیل میں قائدانہ کردار ادا کیا، یہی وجہ ہے کہ "جامعہ سراج العلوم" آج صرف علوم اسلامیہ کی ضیا پاشی ہی نہیں کر رہا ہے بلکہ زندگی کے مختلف میدانوں میں صالح افکار کے حاملین کو تیار کر کے تحفظ کتاب و سنت اور بقائے اردو کا بے مثال کارنامہ انجام دے رہا ہے۔

اردو زبان و ادب کے فروغ اور اسے اسلامی رخ دینے، نیز کتاب و سنت سے لوگوں کے ٹوٹتے رابطے کو مضبوط کرنے کے لئے جامعہ مذکور نے "السراج" کے نام سے اردو زبان میں ایک ماہنامہ کے اجراء کا پروگرام بنایا اور اس کی ادارت کی ذمہ

---

(۱) مولانا عبدالمنان سلفی نے حضرت مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری کی کتابوں کی تعداد تقریباً ساٹھ ذکر کی ہے ملاحظہ ہو:۔ ماہنامہ "السراج" جولائی و اگست ۲۰۰۵ء، لیکن انہی کے مضمون مطبوعہ ماہنامہ "السراج" خطیب الاسلام میں ان کی کتابوں کی تعداد ۳۸ ہے

داری ممتاز عالم دین، کامیاب انشاء پرداز اور صاحب اسلوب ادیب جناب مولانا شمیم احمد ندوی حفظہ اللہ ناظم جامعہ سراج العلوم وامیر مرکزی جمعیت اہل حدیث نیپال کو سونپی اور معاونین کی حیثیت سے مولانا خورشید احمد سلفی اور مولانا عبدالمنان سلفی کو منتخب کیا تو پورے نیپال بلکہ دنیائے اردو میں ایک دھوم مچ گئی، اور ملک نیپال کے اندر اردو کو بال و پر نکالنے کا موقع ملا، اور ہر محبّ اردو کو یہ کہنے کا حق حاصل ہوا کہ ؎

اردو ہے جس کا نام اسے جانتے ہیں داغؔ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

''السراج'' اردو زبان وادب کے فروغ وتشکیل میں تقریباً دس گیارہ سال سے سرگرم عمل ہے، وہ چالیس صفحات پر مشتمل اردو کا ایک کامیاب رسالہ ہے، ارشادات، تجلیات، مقالات، فقہ وفتاویٰ، مسلمانان عالم، تعارف وتبصرہ، جماعت وجامعہ اور منظومات وغیرہ اس کے نمایاں کالمز ہیں۔ ''السراج'' کے اسلوب ونگارش اور طرز تحریر کو جاننے کے لئے مدیر مسئول مولانا شمیم احمد ندوی کے اداریہ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

''آج وہ نام نہاد روشن خیال مستشرقین اور بزعم خود دانشور ومفکرین جو اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی ناپاک کوشش میں مصروف ہیں اور اپنی تمام تر توانائیاں اور وسائل بروئے کار لاتے ہوئے اسلام کے خلاف ہر محاذ پر سرگرم عمل ہیں، ان کی شاطرانہ چالوں اور ان کے خطرناک حربوں کو ناکام بنانے کے لئے مدارس دینیہ کے یہی فارغین اور

فضلاء سامنے آتے ہیں، اور انہیں دنداں شکن جواب دیتے ہوئے اسلام کا نہ صرف دفاع کرتے ہیں بلکہ ان کے باطل نظریات، ان کے فاسد خیالات اور ان کے گمراہ کن تصورات کے تار پود بھی بکھیر دیتے ہیں، یہ دینی مدارس، وہ دانش کدے اور تربیت گاہیں ہیں جہاں نونہالان قوم کی شخصیت سازی اور کردار سازی کا کام ہوتا ہے جہاں اسلامی خطوط پر ذہنوں کی نشو ونما اور اسلامی طرز کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے''(۷)

اردو زبان وادب کے فروغ کا ایک دوسرا ادارہ جس کے نقوش سابق الذکر ادارے کی طرح محسوس کئے جاتے ہیں، وہ ''دارالعلوم نور الاسلام'' کے نام سے مشہور ومعروف ہے، یہ پچاس سال قبل سنسری نیپال میں قائم کیا گیا، یہاں ندوۃ العلماء کے نصاب کے مطابق عربی ہفتم تک تعلیم ہوتی ہے، ندوۃ العلماء کے نصاب کا اجراء اور اس کو اختیار کرنا خود اس بات کا غماز ہے کہ یہاں زبان وادب پر خاصی توجہ مبذول کی جاتی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے، چنانچہ دارالعلوم نے مختلف میدانوں میں اپنی افادیت کا لوہا منوایا اور سیکڑوں افراد کی تربیت سازی کر کے دین وملت کے لئے تیار کیا، اور اردو زبان کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کی۔

اردو صحافت کے افق پر اس دارالعلوم کا ایک ترجمان بنام ''دو ماہی ترجمان ملت'' چمکتا رہا، اسلامی اقدار، اخلاق فاضلہ کی نشر واشاعت، عقائد اسلام کی تبلیغ وتشریح میں روز اول ہی سے مشغول ومنہمک رہا، ۱۹۹۳ء میں (۱) یہ مولانا محمد ایوب

(۱) یہ اس رسالہ کے تجدید نو کی تاریخ ہے، پہلے پہل یہ رسالہ مدرسہ کے بعض اساتذہ کے بقول ۱۹۸۱ء میں نکلا۔ واضح رہے کہ یہ سہ ماہی کے مرحلہ سے بھی گذر کر ماہنامہ ہوا ہے۔

صاحب ندوی حفظہ اللہ کی سرپرستی اور مولانا حیدر علی ندوی کی ادارت میں بڑے آب وتاب کے ساتھ نکلا، یہ نا مساعد حالات اور ناگفتہ بہ صورت حال سے دوچار ہوکر بھی اپنی ضیاپاشی اور ملت کی ترجمانی کرتا رہا کہ ''بیابان کی شب تاریک میں قندیل رہبانی'' کی مثال اس پر صادق آتی ہے، اس پرچے کے سرورق پر لکھا ہے کہ:۔''ملک نیپال میں اردو صحافت کا سب سے پہلا رسالہ'' اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نیپال کے دوسرے اردو رسالہ اس کے بعد نکلنے شروع ہوئے، اور یہ حقیقت کہ الفضل للمتقدم یعنی فضیلت و برتری سبقت کرنے والے شخص کو حاصل ہوتی ہے لیکن افسوس اس پر ہے کہ یہ رسالہ چند سال جاری رہنے کے بعد بند ہوگیا، یہ مستقل نکلتا رہتا تو اس کے بڑے اچھے اثرات ہوتے اور نیپال میں اردو کی ایک سنہری تاریخ رقم ہوتی، پرچہ میں درس قرآن اور درس حدیث کے بعد اداریہ کا کالم ہے، مدیر مکرم جناب مولانا حیدر علی ندوی نے وقت کے حساس موضوع پر اداریہ رقم فرمایا ہے ذیل میں اس کا ایک نمونہ نذر قارئین ہے:۔

''عربی کا محاورہ ہے "مَن جَدَّ وَجَدَ" جو کوشش کرتا ہے وہ پاتا ہے کی معنویت کی تہہ میں غوطہ لگانے سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کا جملہ حسن و جمال، اس کی تعمیر و ترقی، عروج و اقبال اسی کوشش کا رہین منت ہے، اور رہے گی، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، ایجابی ہو یا سلبی، اس کا پھل سامنے آتا ہے، ایک ایجابی جدوجہد و محنت جو چودہ سال پہلے ایک بدو صحرانشین، تہذیب و ثقافت، علم و ادب

سے نابلد قوم میں کی گئی تو ایک صالح جماعت، خداترس معاشرہ، منظّم حکومت، تہذیب واخلاق سے آراستہ قوم معرض وجود میں آئی جس نے شب تاریک میں قندیل رہبانی کا کام کیا اور انسانیت کی ڈوبتی نیا کو پار لگایا اور طاغوتی نظام کی بالادستی، قیصر وکسریٰ کی سرمستیوں کو ختم کیا اور یہ اعلان "إذا هلك قيصر فلا قيصر بعده "سو فیصد سچ ثابت کردکھایا"۔ (۸)

اہل نیپال کے لئے مرکز التوحید نامی ادارہ محتاج تعارف نہیں ہے، اس کے ڈائریکٹر اور سرکردہ مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں، انہوں نے ''نورتوحید'' کے نام سے ایک ماہنامہ رسالہ نکالا جو بہت پرمواد اور اچھے مضامین ومقالات سے مزین رہتا ہے، ملکی وبین الاقوامی حالات پر وقیع تبصرہ ہوتا ہے، اس رسالہ کی ۱۷ جلدیں مکمل ہو چکی ہیں، مولانا عبداللہ مدنی نے اردو کی تشکیل وفروغ میں جو حصہ لیا ہے اس کا اعتراف سال گذشتہ کے صحافت کانفرنس منعقدہ مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ کرشنانگر میں کیا جاچکا ہے یہاں ''نورتوحید'' کا ایک ادبی اور علمی اقتباس نقل کیا جارہا ہے جو قارئین کی عبرت ذاتی کا سامان ہونے کے ساتھ دعوت مطالعہ دیتا ہے:۔

''ملت کا ایک بڑا طبقہ ہزار خواہشوں کے اندھیروں میں حیران ہے، اسے راہ نجات سوجھائی نہیں دیتی، اپنے طور پر زندگی کے ناپختہ تجربات کی دھندلی روشنی میں اٹھایا جانے والا ہر قدم

منزل سے دور کرتا جا رہا ہے نہ سیاسی، نہ معاشرتی اور نہ ہی معاشی مسائل حل ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ایسے میں اگر چودہ سو برس پیچھے جا کر مشکلات سے نکلنے کی سبیل تلاش کی جائے تو ہم ایک روشن شاہراہ تک بآسانی پہنچ سکتے ہیں"۔

زمانہ مانگ رہا ہے دعا ترقی کی
مگر تجھے ترا عہد کہن ہی راس آئے (۹)

اس طرح الحراء ایجوکیشنل سوسائٹی کاٹھمانڈو کے تحت فروغ اردو کے جو خدمات انجام پا رہے ہیں وہ لائق مبارک باد اور قابل تحسین ہیں، یہ سوسائٹی ایک سہ ماہی رسالہ "پیغام کے نام سے نکالتی ہے جس کا ہیڈ آفس کاٹھمانڈو میں ہے، یہ رسالہ زیر سرپرستی جناب عطاء الرحمٰن خان جھنڈانگری اور زیر ادارت محمد حسن حبیب فلاحی اور محمد ادریس فلاحی نکلتا ہے۔ابھی تک اس کی نو جلدیں نکل کر مقبول خاص وعام ہو چکی ہیں اور معاشرہ کے امراض کا مداوا اور اسکے درد کا درماں اور زہر کا تریاق ثابت ہو چکی ہیں۔مولانا محمد حسن حبیب فلاحی اپنے اداریہ میں لکھتے ہیں کہ:۔

"مسلم معاشرہ میں رسم ورواج کی جڑیں اس قدر مضبوط ہو چکی ہیں کہ سماجی آئین میں اس کو کہیں واجب اور کہیں فرض کا درجہ حاصل ہو گیا ہے، عادلانہ تجزیہ کے بعد اگر غایت احتیاط کے ساتھ کہا جائے تو بجا طور پر اتنا کہا جا سکتا ہے اسلامی نظام معاشرہ کے اصول واحکام کی جگہ آباء واجداد کے سماجی قوانین نے لے لی

ہے، اور انہی سماجی رسوم کے نیچے اسلام کے زرین معاشرتی اصول دب کر رہ گئے ہیں، حیف ہے ان لوگوں پر جو اس رسم کو خلاف سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہوئے بھی اس کے انسداد کی کوئی موثر نہیں کرتے۔ بلکہ ایسی محفلوں میں شریک ہو کر اپنے عمل سے لوگوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں، کاش کہ جاننے والے سمجھ بوجھ اور جرأت سے کام لیتے''۔(۱۰)

ملک نیپال میں اردو زبان کی تشکیل میں حصہ والوں میں ایک باوقار نام جناب مولانا مبارک حسین ندوی زید مجدہ کا ہے مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء اور دارالعلوم دیوبند اور جامعۃ الامام عبد الملک سعود ریاض سے تعلیمی سلسلہ مکمل کرنے کے بعد خدمت دین کا میدان وطن عزیز ہی کو بنایا اور اردو زبان کے بقاء وتحفظ کے لئے ہر ممکن کوشش کی منصۂ خطابت ہو یا میدان صحافت، مضمون نگاری ومقالہ نویسی ہو یا حالات حاضرہ کا تذکرہ اور اس پر تبصرہ، دروس قرآن، دروس حدیث کے حلقے ہوں یا دعوتی یا وتبلیغی دورے ہر ایک موقع پر اردو زبان کو فروغ اور اسلام کی نشر واشاعت میں تن من دھن کی بازی لگا رہے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مولانا مدظلہ العالی کو اکابرین امت کا اعتماد شروع ہی سے حاصل رہا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ، خطیب الاسلام حضرت مولانا عبدالرؤف جھنڈانگری، عارف باللہ مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندی وغیرھم، اول الذکر کے علاوہ اکثر علماء وصلحاء کا ان کے علاقہ میں ورود مسعود ہوتا رہا، جس کا اثر زبان اردو کو وسعت دینے میں

خاصا رہا، مولانا نے ۱۹۶۷ء میں مدرسہ نورالعلوم کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا جو ندوۃ العلماء کے نصاب کے متعلق بحسن وخوبی اپنے فرائض دینی انجام دے رہا ہے، یہ مولانا کے دینی مزاج اور اسلامی فکر کی بہترین ترجمانی ہے، اس مدرسہ کے زیر اہتمام ایک شعبۂ دعوت وارشاد ہے، اس کے تحت اردو زبان میں کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں نورالحدیث مولفہ مولانا مبارک حسین ندوی، نورالتجوید، اسلام اور مسلمان، چہل حدیث اور سیرت رسول اکرم وغیرہ کتابیں ہیں، مولانا نے عام وسہل انداز میں عوام کو اردو سے قریب کرنے کے لئے جو نورالحدیث نامی کتاب ترتیب دی ہے، اس کا ایک تشریحی نوٹ نذر قارئین ہے۔

"انما الأعمال بالنیات" یہ بخاری شریف کی بہت مشہور روایت ہے کہ آدمی کے عمل کا دارومدار نیت پر ہے، اب اگر آدمی اپنی ذاتی ضرورتوں کے تحت کوئی عمل کرے گا تو اسی کے مطابق اجر پائے گا، اور اگر خلوص کے ساتھ اللہ کی رضامندی کے حصول کے لئے کوئی عمل کرے گا تو انشاء اللہ اس کا اجر بھی اس کو اسی حساب سے ہوگا، اللہ پاک کے یہاں اعمال کے اندر نیت واخلاص کو دیکھا جاتا ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد بھی فرمایا کہ اللہ پاک صورتوں اور جسموں کو نہیں دیکھتے بلکہ دلوں اور عملوں کو دیکھتے ہیں، کس درجہ اخلاص کے ساتھ یہ عمل کیا جارہا ہے، چونکہ نیت دلی ارادوں کو کہتے ہیں اس لئے ہر انسان پر لازم ہے کہ اعمال صالحہ میں

اپنے ارادے کو خالص رکھے کہ یہی مطلوب ہے۔(۱۱)

ملک نیپال کی تاریخ مقامی اور انگریزی زبانوں میں لکھی گئی ہے جن میں جناب شمیمہ صدیقی کی ''مسلمس آف نیپال'' اور ''اے شارٹ ہسٹری آف نیپال'' مولفہ تنتر بہادر تھاپا، ''جیولوجی آف نیپال'' اور ''یورس آف نیپال'' مصنفہ چندر کانت شرما انگریزی میں قابل ذکر ہیں جبکہ رام کال دیال، ہرینا لال شریشٹھ کی ''نیپال کو پریچے'' اور وزارت قانون کی اہم کتاب ''نیپال ادھیراج کو سمبید ھان ۲۰۴۷'' نیپالی زبان میں ہے، لیکن اردو زبان میں ابھی تک کوئی کتاب نہیں لکھی جاسکی تھی، ماہر ارضیات جناب حفظ الرحمٰن صاحب ایم۔ایس۔سی علیگ قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے ''نیپال کا جغرافیہ وتاریخ'' کے نام سے پرائمری درجات کے لئے اردو زبان میں ایک معلوماتی کتاب تصنیف فرمائی ہے، اس کتاب پر تر بھون یونیورسٹی کاٹھمانڈو کے لکچرر انگریزی جناب محمد ہارون انصاری صاحب کا پیش لفظ بھی ہے، انہوں نے مصنف کے نیپالی تاریخ وجغرافیہ کی پہلی کاوش کو سنہرے کلمات میں سراہا ہے، جناب حفظ الرحمٰن صاحب اپنے تمہیدی کلمات میں لکھتے ہیں:۔

> ''میں نے جب اپنی بچیوں کا داخلہ نیپال کے دینی ادارہ میں کرایا تو مجھے جان کر تعجب ہوا اور افسوس بھی کہ بچیاں ہندوستان اور دنیا کا جغرافیہ تو پڑھ رہی ہیں لیکن وہ جس ملک کی شہری ہیں اور جس ملک میں تعلیم حاصل کررہی ہیں اس کے بارے میں ان کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے اور نہ اس موضوع پر اردو زبان میں کوئی

کتاب دستیاب نہ ہونے سے ایسا ہو رہا ہے۔اسی وقت میں نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ انشاء اللہ میں اس سلسلہ میں کچھ کروں گا اور خدا کا فضل ہے کہ آج ''نیپال کا جغرافیہ و تاریخ'' کے نام سے تین حصوں میں آپ کے سامنے ہیں''۔

واقعی مصنف کا یہ قابل قدر اور لائق ستائش کام ہے جس پر وہ تمام اہل وطن کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں، اردو زبان میں نیپالی تاریخ جو انہوں نے مرتب کیا ہے اس سے نونہالان ملت کی ذہنی تربیت کے ساتھ مستقل کام کرنے والوں رہنمائی ملے گی۔

یہ ہیں نیپال کے اساطین زبان وادب کی نمائندہ تحریریں، جس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ نیپال میں اردو زبان اپنے پورے جمال وجلال اور روح پرور اعمال کے ساتھ موجود ہے، اگر اس طرح اردو سے مسلمانان نیپال کی دلچسپی اور توجہ رہی اور اس سلسلہ میں مزید پیش رفت ہوتی رہی تو وہ دور دور نہیں کہ نیپال میں مستعمل اردو زبان تاریخ کا ایک بڑا ذخیرہ اور اٹوٹ حصہ بن جائے، یہاں طوالت کے خوف سے نیپال کے دیگر مدارس اور ارباب اہتمام کا تذکرہ قصداً قلم انداز کیا گیا ہے، ورنہ نیپال کے جملہ دینی مدارس، مراکز، سینٹرس اردو زبان کے فروغ کے تعلق سے جو کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں، اس سے کوئی انصاف پسند مورخ چشم پوشی نہیں کرسکتا، قابل ذکر بات یہ ہے کہ نیپال میں اردو زبان وادب کی لگام ابھی تک مادہ پرستوں کے ہاتھ میں نہیں آئی ہے، ورنہ ادب برائے ادب کا نظریہ قائم ہوتا، اس وقت نیپال

میں اردو کی عزت وآبرو کا تحفظ کرنے والے وہ علماء ہیں جو ادب برائے زندگی کے قائل اور داعی ہیں اور ادب اسلامی کے محافظ اور پاسبان بھی ہیں اور انہیں کے دم بدم سے ملک نیپال قائم ودائم ہے۔

سطور بالا میں انہی رہنما علماء کا ذکر خیر کیا گیا ہے جو نیپال کی آبرو ہیں اور ان کی طبیعت صالحہ کے ساتھ یہ حدیث ہم آہنگ ہوتی نظر آرہی ہے کہ:۔لا تزال طائفة من أمتی ظاهرين على الأرض لايضرهم من خذلهم حتى يأتی وعد الله وهم على ذالك ۔(میری امت کا ایک گروہ روئے زمین پر غالب وفائق رہے گا، برا چاہنے والوں کی کوششیں اسے کچھ نہیں نقصان پہونچا سکیں گی، اور وہ حکم الٰہی کے ورود تک اس پر برقرار رہے گا)۔

حوالہ جات

(۱) التاریخ الاسلامی، الأقلیات المسلمة۔ مؤلفہ محمد شاکر مصری
(۲) حاضر العام الاسلامی ج:ا ص ۳۳۴ مؤلفہ علامہ شکیب ارسلان، دار الفکر الغربی
(۳) دنیا میں اسلام اور مسلمان ص:۱۵۶۔ مؤلفہ حافظ محمد نسیم قریشی، دانش محل امین آباد، لکھنؤ ۱۹۸۵ء
(۴) Geography & History of Nepal Part III P. 68
(۵) فی نیبال بلاد الجبال، مؤلفہ شیخ محمد بن ناصر العبودی ص:۳۲
(۶) نول پراسی، نیپال، مدرسہ نور العلوم کی تاریخی دستاویز میں یہ جملہ مرقوم ہے۔
(۷) ماہنامہ السراج ستمبر ۱۹۹۹ء جھنڈانگر، نیپال
(۸) دوماہی ترجمان ملت۔ دار العلوم جلپاپور، سنسری نیپال۔ ۱۹۹۵ء
(۹) ماہنامہ نور توحید، کرشنانگر، نیپال۔ نومبر ۲۰۰۴ء
(۱۰) سہ ماہی ''پیغام'' کاٹھ مانڈو، ص:۳ ۱۴۱۹ھ
(۱۱) نور الحدیث، ص:۹۔ مؤلفہ مولانا مبارک حسین ندوی، مطبوعہ شعبۂ دعوت وارشاد مدرسہ نور العلوم، نول پراسی، نیپال

ڈاکٹر عبید اللہ فہد
(علیگڑھ)

ہندو نیپال کے سرحدی اضلاع میں اہل حدیث اردو جرائد

(فکری و ادبی قدر و قیمت کا جائزہ)

اس مضمون کا دائرہ کار صوبہ اتر پردیش کے وہ سرحدی اضلاع ہیں جو ہندوستان اور نیپال کے مابین واقع ہیں۔ اس میں نیپال کے ترائی علاقے بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ جن کے تذکرہ کے بغیر اس خطہ کی ادبی، صحافتی اور علمی و دینی تاریخ نامکمل رہے گی۔ مضمون کی دوسری محدودیت اہل حدیث رسائل و جرائد کا تجزیہ ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوسرے مکاتب فکر کی خدمات سے صرف نظر کرنا پیش نظر ہے۔ تجزیہ کی سہولت کے لئے ایک مکتب فکر کا انتخاب کیا گیا ہے، دوسرے مکاتب فکر کی خدمات کا جائزہ بھی ہونا چاہئے۔ تیسری محدودیت اردو زبان ہے۔ عربی و ہندی میں شائع ہونیوالے جرائد اس تجزیہ میں شامل نہیں ہیں۔ اسیطرح مختلف مدارس، مکاتب اور جامعات کی سالانہ میگزین اور طلبہ انجمنوں کی سالانہ اشاعتیں بھی اس مضمون کے دائرہ سے خارج ہیں۔

برصغیر میں اہل حدیث علماء اور دانشوروں کی صحافتی خدمات کی تاریخ قدیم بھی ہے اور تابناک بھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب انگریزوں نے اس ملک کی زمام کار سنبھالی اور اپنی مشنری سرگرمیوں کے ذریعہ یہاں کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی تبلیغی، علمی اور سماجی ریشہ دوانیاں شروع کردیں تو ملک کے دوسرے علماء اور باغیرت مصلحین کی طرح اہل حدیث علماء بھی کمر ہمت کس کر میدان میں کود پڑے۔ انہوں نے وعظ وتقریر، مناظرہ اور کتابچوں کے ذریعہ دفاع اسلام کا فریضہ ادا کیا۔ اور پھر مشنری سرگرمیوں پر بند باندھنے کے لئے رسائل وجرائد اور اخبارات کا سیلاب امنڈ پڑا۔

فوری طور پر مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی نے ۱۸۸۷ء میں بٹالہ گرداس پور پنجاب سے اردو ماہنامہ ''اشاعت السنہ'' جاری کیا۔ یہ پہلا اہل حدیث رسالہ تھا جس نے علم وفن کی خدمت کی۔ عیسائی پادریوں کے الزامات کا شافی جواب دیا اور مرزا غلام احمد قادیانی کے دعاوی وہفوات کا بھی تعاقب کیا۔ لاہور سے فروری ۱۸۸۷ء ہی میں ملا محمد بخش لاہوری نے ہفت روزہ اخبار ''جعفر زٹلی'' شائع کیا، جو سرسید احمد خاں کے افکار ونظریات پر تنقید کرتا تھا۔ ۱۳۴۵ھ میں فیض آباد سے ایک دوسرا ہفت روزہ ''ایام'' جاری ہوا، جو مذاہب باطلہ خصوصاً بہائیت کا رد کرتا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں مرزا حیرت دہلوی نے دہلی سے ''کرزن گزٹ'' ہفت روزہ جاری کیا جو انگریزی حکومت کے وفاداروں پر پھبتیاں کستا تھا اور مشنری اداروں کی تخریبی کاروائیوں سے عوام کو آگاہ رکھتا تھا۔ شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری نے ۱۹۰۸ء میں امرتسر سے ہفت روزہ ''مسلمان'' جاری کیا۔ یہ مئی ۱۹۱۰ء تک ماہانہ تھا۔ ۷/جون ۱۹۱۰ء سے ہفت روزہ ہوا۔ یہ ہفت روزہ ۱۹۱۴ء تک جاری رہا۔ ۱۹۰۳ء میں اسی مقام سے مولانا ہفت روزہ ''اہل حدیث'' پہلے

ہی جاری کر چکے تھے ،اس میں مذہبی و اخلاقی مضامین، فتاوے اور مخالفین کے اعتراضات و جوابات شائع ہوتے تھے۔ اس ہفت روزہ کا آخری شمارہ یکم اگست ۱۹۴۷ء کو حالات کی نامساعدات کے باوجود شائع ہوا اور پھر اس چراغ کی روشنی بجھ گئی۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری میدان صحافت میں کیا آئے کہ علمائے اہل حدیث دفاع اسلام کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ پھر اخبارات و رسائل کی گویا بہار آ گئی۔ ایک تحقیق کے مطابق ایسے اخبارات و رسائل کی تعداد ۹۸ ہے جو جدید ہندوستان میں مختلف اوقات و مراحل میں جاری ہوئے اور دفاع دین کا فریضہ ادا کرتے کرتے حوادث زمانہ کی نظر ہو گئے۔ان کی تعداد موضوع کے اعتبار سے کچھ اسطرح ہے:

باطل ادیان، ومذاہب کی تردید میں	:	دس
شرک وبدعت اور شخصی تقلید کی مخالفت میں	:	بارہ
ادب وتاریخ کے موضوعات پر	:	سولہ
ادب وسیاست اور اصلاح معاشرہ پر	:	چودہ
دینی واصلاحی رسائل	:	۲۰
جہاد وشہادت پر	:	دو
متفرق موضوعات پر	:	تئیس

اس وقت بھی پورے ملک سے اردو، عربی اور علاقائی زبانوں میں اکتالیس اخبارات ورسائل شائع ہو رہے ہیں۔ یہ سب دینی وعلمی اور اخلاقی ومعاشرتی مضامین کے حامل ہیں اور انکا نقطۂ نظر اصلاحی وتعمیری ہے۔ چند ایک کو چھوڑ کر اکثر رسائل و جرائد نے مثبت اور ایجابی انداز و اسلوب اختیار کیا ہے۔ (مکمل فہرست کے لئے دیکھئے۔ یادگار مجلہ اہل حدیث، ۲۰۰۴ء دہلی، ص ر۱۷۳۔۱۸۷)۔ان سارے جرائد کا

مقصد الحاد و بدعت کا استیصال اور توحید و سنت کی تعلیمات کی اشاعت ہے۔

ہند و نیپال کے سرحدی اضلاع شروع سے آج تک اس اسلامی صحافت کی مہم میں پیچھے نہیں رہے۔ ان علاقوں میں جو مدارس، جامعات اور مکاتب قائم ہوئے، ان کا فیض پورے ملک کو پہونچا۔ ملک کے مختلف علاقوں سے تشنگان علم یہاں آکر اپنی دینی و علمی پیاس بجھاتے رہے اور ملک و بیرون ملک کو سیراب کرتے رہے۔ ان علاقوں کے علماء اور دانشوروں کی خدمات مرتب کی جائیں تو کئی جلدوں میں ضخیم دائرۃ المعارف مرتب ہو جائے۔ سلفی صحافیوں کی ایک بڑی تعداد انہیں اداروں سے فیض یافتہ ہے۔ سلفی رسائل و جرائد نے اکثر انہی تعلیمی اداروں کے ترجمان کی حیثیت میں پرورش لوح وقلم کی اور دفاع توحید و سنت کا فریضہ انجام دیا۔

آزادی سے معاً پہلے اور بعد کے ادوار میں ملک میں مناظروں کا بازار گرم تھا۔ مسلم ملت کے مختلف فرقے اور طبقے تقریری و تحریری دست پنجہ میں مصروف تھے۔ عیسائی مشنریوں کے کمزور پڑنے کے بعد آریہ سماجیوں نے شکوک وشبہات اور الزامات و اعتراضات کا طوفان بدتمیزی برپا کر رکھا تھا اور نئی نسل ان حربوں اور ہتھکنڈوں کی سازش کا شکار ہو رہی تھی۔ ان حالات میں بجا طور پر تردیدی وتنقیدی اور مناظراتی اسلوب مؤثر اور کارگر نظر آیا اور علمائے اہل حدیث نے دفاعی انداز میں رسائل و جرائد کی ایک طویل قطار کھڑی کر دی۔ ماہنامہ اشاعت السنہ (۱۸۸۷ء) ''ماہناما الہادی'' ہفت روزہ اہل حدیث (۱۹۰۳ء)، ماہنامہ مرقع قادیانی (۱۹۰۷ء) ہفت روزہ مسلمان (۱۹۰۸ء)، ماہنامہ ضیاء السنہ (۱۳۲۰ھ)، ہفت روزہ ایام (۱۳۴۵ھ)، پندرہ روزہ تبلیغ، ماہنامہ اہل الذکر (۱۹۰۸ء)، ماہنامہ السعید (۱۳۲۴ھ)، ماہنامہ صحیفہ اہل حدیث

(۱۳۴۰ھ)، پندرہ روزہ اخبار محمدی (۱۳۴۰ھ)، ہفت روزہ شحنۂ ہند (۱۸۸۳ء)، ماہنامہ تبلیغ السنہ (۱۹۲۲ء)، ماہنامہ اہل حدیث گزٹ (۱۹۳۳ء)، ماہنامہ نصرت السنہ (۱۸۸۵ء)، ماہنامہ آثار السنن (۱۳۱۷ھ)، ماہنامہ ہمدرد اہل حدیث (۱۳۳۸ھ)، ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث وغیرہ وہ رسائل و اخبارات تھے جنہوں نے تردیدی و مناظراتی لٹریچر تیار کر کے وقت کی ایک بڑی ضرورت پوری کی اور توحید و سنت پر اعتراض کرنیوالوں کے منہ بند کئے۔

موجودہ دور عقلی و سائنسی مزاج کا حامل ہونے کی وجہ سے تردید و جواب تردید، الزام و جوابی الزام قسم کے لٹریچر کا متحمل نہیں۔نئی نسل ہر بات کو عقل کی میزان میں تولنا چاہتی ہے۔وہ اب پروپگنڈہ سے کم متاثر ہوتی ہے۔اسے معذرت خواہی اور دفاعی انداز اب سیر نہیں کرتا شاید اسی لئے سلفی صحافت کا رنگ و آہنگ قدرے تبدیل ہو رہا ہے۔علماء کو احساس ہو چلا ہے کہ تعمیری و اصلاحی اسلوب وقت کی ضرورت ہے۔زیادہ تر اہل حدیث علماء اور دانشور اب مثبت اور ایجابی انداز میں خدمت علم اور اصلاح سماج میں مصروف نظر آتے ہیں۔

مولانا عبد الجلیل رحمانی نے جنوری ۱۹۵۲ء کے ''مصباح'' میں اختلاف رائے کے اظہار میں اعتدال سے کام لینے کی تلقین کی تھی،انہوں نے تحریر کیا تھا:

> ''شریعت میں اختلاف رائے کو اعتدال کا جو مقام حاصل ہے، صحابۂ کرام اور اسلاف عزام کی زندگی سے اختلاف رائے میں اعتدال کا جو درس ہمیں ملتا ہے، نہایت افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ ایسے لوگ بہت کم ہیں

جو اعتدال پر قائم رہتے ہیں۔

آپ کسی امر میں ایک رائے قائم کرتے ہیں اور دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ لوگ آپ کی اس رائے کو قبول کرلیں اور اس رائے میں آپ کو دیانتدار اور حق گو وراست کردار سمجھیں اور جب کوئی دوسرا آدمی ایک رائے قائم کرتا ہے جو آپ کی رائے سے مختلف ہوتی ہے تو اس کو بھی یہی حق ملنا چاہئے۔امت مسلمہ کی یہ انتہائی بدبختی ہے کہ اختلاف رائے کے برداشت کرنے کی قوت اس سے نکل چکی ہے۔تکفیر و تفسیق، اعتزال و ارجا، الحاد و ابتداع کا فتوی لگادینا کسی خاص احتیاط کا محتاج نہیں سمجھا جاتا ہے''۔(ص/۲۹)

مولانا عبدالجلیل رحمانیؒ نے دارالعلوم ششہنیاں (الید پورہ) برڈ پور ضلع بستی (اوراب ضلع سدھارتھ نگر) سے محرم الحرام ۱۳۱۷ھ/اکتوبر ۱۹۵۱ء کو ماہنامہ ''مصباح'' جاری کیا۔اس کی اشاعت ۱۹۵۶ء تک مسلسل رہی۔اسکے بعد تقریبا دس سالوں تک اس کی اشاعت موقوف رہی۔جنوری ۱۹۶۴ء یہ رسالہ دوبارہ شائع ہوا اور چند اشاعتوں کے بعد پھر حوادث زمانہ کا شکار ہوگیا۔(یادگار مجلّہ اہل حدیث، مرتبین اصغر علی امام مہدی سلفی اور خالد حنیف صدیقی فلاحی، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص/۱۸۰) اس رسالہ کے نگران مولانا عبدالسلام بستویؒ شیخ الحدیث مدرسہ ریاض العلوم دہلی تھے۔ادارتی تحریر ''رشحات'' میں مولانا نے ملک وملت کی زبوں حالی اور دین اسلام کے نام لیواؤں کی کسمپرسی اور مسلمانوں کی حاکمانہ اقتدار سے محرومی کا نقشہ کھینچا اور انہیں "امر

بالمعروف اور نہی عن المنکر" کیلئے زبان وقلم کے استعمال پر اکسایا کہ
''سب کچھ کھو جانے کے بعد، تنزل وانحطاط، نکبت وادبار کی ہزاروں چوٹیں کھانے
کے باوجود اگر مسلمان آج بھی اس ارشاد نبوت پر عمل پیرا ہو جائے تو اس کی پستی بلندی
سے، اس کا تنزل وانحطاط عروج واقبال سے بدل سکتا ہے''۔ (اکتوبر ۱۹۵۱ء ص/۵)
ماہنامہ کے اجراء کے محرکات اور اسباب ودواعی پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا کہ ''حالات
کی ناسازگاری کی ظلمتوں میں امید کی کچھ کرنیں تھیں جو نظر آئیں۔ اسلام کے کچھ
فرائض تھے جنہوں نے مجبور کیا، دین کے شدید مطالبات تھے جنہوں نے اس اقدام پر
آمادہ کیا، ورنہ دارالعلوم کی طرف سے تعلیم وتدریس اور تبلیغ وارشاد کی جو خدمت سات
سال سے انجام دی جارہی تھی ہم اب تک اس پر قانع تھے''۔ (ص/۶) مولانا نے
مسلمانوں سے اس رسالہ کی اخلاقی ومادی اعانت کی اپیل کرتے ہوئے لکھا:

> ''دارالعلوم کے ہمدردوں کا حلقہ ضلع بستی و گونڈہ اور ریاست نیپال کے گوشہ گوشہ اور ہندوستان کے بہت سے شہروں تک پھیلا ہوا ہے۔ دارالعلوم نے جو کچھ اور جتنی بھی خدمت نجام دی ہے انہی پرخلوص ہمدردوں کی امداد واعانت سے انجام دی ہے۔ اب انکی محبوب درسگاہ دارالعلوم کا دینی اور علمی واصلاحی ''ماہنامہ مصباح'' ہر ماہ اچھے سے اچھے اصلاحی واخلاقی مضامین سے آراستہ ہوکر انکے ہاتھوں میں پہونچ رہا ہے۔ اس کی خریداری اور سرپرستی انکا خصوصی فرض ہے اور تمام مسلمانوں کا عمومی فرض۔ کیونکہ ''مصباح'' اسلام کی دعوت عامہ کا پیغامبر اور

احکام خداوندی و ارشادات نبویہ کا مبلغ و ناشر ہے۔ مکارم اخلاق کی تعلیم اور اعمال صالحہ کی تلقین اس کا نصب العین"۔ (اکتوبر ۱۹۵۱ء ص/۶)

جماعت اسلامی کی حمایت ومخالفت کیلئے میدان میں کودنے کا انکے ملنے ملانے والوں اور احباب نے تقاضہ کیا تو فرمایا کہ "طنز وتعریض، لعن وطعن، سب وشتم اور تبرابازی کی جیسی بوچھار طرفین سے ہورہی ہے۔ فطرتاً مجھے اس سے سخت نفرت ہے"۔ (نومبر ۱۹۵۱ء ص/۳) اگلے شمارہ میں مولانا مودودیؒ کے افکار ونظریات کے بارے میں اپنے نکتۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ "موصوف کے افکار ونظریات اور تحقیقات وخیالات کے قبول وتسلیم کے باب میں کورانہ اعتقاد وتقلید کا میں قائل نہیں۔ اور نہ اس طرح عناد کی میرے نزدیک گنجائش ہے کہ آپکی ساری تحریرات کو دریائے برد کردئے جانے کا مستحق سمجھوں"۔ (دسمبر ۱۹۵۱ء ص/۱۴) انہوں نے آگے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

"اس تحریک کی ابتدائی نشاۃ سے لیکر اس وقت تک کی طویل مدت میں پوری طاقت کیساتھ تحریک کے شاعروں، ادیبوں، واعظوں، خطیبوں اور مصنفین نے اس تحریک کو پھیلایا۔ تحریک کا لٹریچر پورے ہندوستان میں چھا گیا، مگر اس کے خلاف نہ فتاوے لکھے گئے، نہ اخبارات ورسائل میں مقالات شائع ہوئے، نہ واعظوں نے محراب ومنبر سے اس کے خلاف خطبات پڑھے۔

اسرار وضمائر کا علم صرف خدا کو ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ کیا اسباب پیدا ہوگئے جو پچھلے چند ماہ سے مخالفت کا اتنا بھاری طوفان امنڈ پڑا۔

اور انکار کرنے والے پوری بے رحمی کے ساتھ فتاووٴں کے گولے استعمال کر رہے ہیں اور تسلیم و قبول کرنے والے شاعر و ادیب پوری جسارت کے ساتھ قلم کے تیر و نشتر چلانے میں مصروف ہیں۔ عدل و انصاف، توازن و سنجیدگی یہ منظر دیکھ کر شرمندہ ہیں''۔ (دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۱۴/ ۔۱۵)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ''مصباح'' کا نقطۂ نظر تعمیری و اصلاحی اور اسلوب متین و سنجیدہ اور متوازن و معتدل تھا۔ اس نے مناظراتی تحریروں کی اشاعت سے اپنا دامن بچایا اور حمایت و مخالفت کی گرم بازاری سے دوری اختیار کی۔

ادارتی کالم ''رشحات'' میں مولانا عبدالجلیل رحمانیؒ نے وقت کے سلگتے ہوئے مسائل پر اظہار خیال اس طرح کیا کہ مسلمان دیدۂ عبرت سے کام لے سکیں اور بحیثیت خیر امت اپنے لائحہ عمل کا تعین کر سکیں۔ ملک کے پارلیمانی نظام، الیکشن کی ہماہمی، سیاسی پارٹیوں کے انتخابی منشور اور ان سے مسلمانوں کی دلچسپی، ان میں سے کسی سیاسی جماعت کو اھون البلیتین سمجھ کر اس کے ساتھ اشتراک و تعاون کی حکمت و حرمت جیسے فوری اور ہنگامی مسائل سے وہ نہیں الجھتے نہ قارئین کو ان میں الجھانا پسند کرتے ہیں انہیں تو ''صرف اس جد و جہد کو دیکھنا ہے اور عبرت کی نظر سے دیکھنا ہے۔ ان تحریکات کے علمبرداروں کا عشق و جنون دیکھنا ہے۔ مقصد اور نصب العین صرف مادی ہے۔ طریقۂ کار بھی مادہ پرستانہ ہے۔ خدا پرستی کا نہ کوئی نظریہ ہے نہ خدا پرستانہ طریقۂ کار، جو لوگ خدا پرستی کا دعوی رکھتے ہیں اور جس کا نظریۂ خیال خدا پرستانہ ہے کیا یہ لوگ بھی اسی طرح کا جوش اور جنون کا ثبوت دیں گے اور کیا اپنے

نصب العین کو حاصل کرنے اور جس نظام پر یقین ہے اس کو دنیا کے سارے نظاموں پر غالب کرنے کیلیئے اسی طرح کی جدوجہد کریں گے؟ فاعتبروا یا اولی الأبصار!''۔(جنوری ۱۹۵۲ء ص/۳)

مولانا کی راست روی اور فکری صحت وسلامتی کی اہمیت اس وقت مزید نکھر کر سامنے آتی ہے، جب پانچویں اور چھٹی دہائیوں کے مسلم اخبارات ورسائل ہمیں اس سیاسی دنگل کے اکھاڑ پچھاڑ سے بھرے نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے مقتدر علماء اور بارسوخ اصحاب جبہ ودستار کی منزل مقصود کسی سیاسی جماعت کی حمایت ورضاجوئی سے آگے دکھائی نہیں دیتی۔کانگریس کے پرچم تلے اکثر مذہبی طبقے اور جماعتیں مسلمانوں کے محفوظ مستقبل کو تلاش کرتی نظر آتی ہیں۔اس وقت کے غالب رجحان سیاسی سے منھ موڑ کر مسلمانوں کو غلبۂ دین کے لئے جدوجہد کرنے پر اکسانا عزیمت ہی کی راہ تھی۔

ماہ ربیع الاول کی آمد پر مولانا رحمانیؒ نے ''رشحات'' کے کالم میں سیرت طیبہ کے ذکر خیر کو بدعت قرار دیکر انعقاد محفل میلاد کو بند کرنے کے بجائے اسے ''تذکرہ جمیل'' سے تعبیر کیا۔''بشرطیکہ اسلام کی شرائط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسے انجام دیا جائے ہر ماہ ہر دن بلاتخصیص ایام وشہور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی پڑھیئے پڑھایئے۔البتہ یہ تذکرہ نری عقیدت اور عمل وروح سے خالی ہو کر نہ ہو۔جن احوال کو پڑھا اور سنا جائے ان کو اپنا اسوۂ عمل بنایا جائے۔اقوام ضالہ اپنے فرمانرواؤں کی سالگرہیں مناتی ہیں۔خدانخواستہ ہماری یہ مجالس انہیں کی نقل وحکایت بنکر نہ رہ جائیں، مجلسوں کا یہ قیام وقعود، تصنع آمیز درودوسلام کی بھرمار، مجالس میلاد میں قوالی کی

محافل اور بزم سرود وغنا کی نقالی مسلم قوم کو ہلاکت کے گھاٹ اتار دینے والی ہے''۔
(فروری ۱۹۵۲ص/۳)

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوگیا۔ سیکولرزم، جمہوریت اور سوشلزم اس ملک کے آدرش قرار پائے۔ آئین میں اقلیتوں کو برابر کے حقوق ملے ان کو مذہبی آزادی بھی عطا ہوئی۔ ان کی روایات، تہذیب وثقافت اور مقدس شخصیات کے احترام وتوقیر کی ضمانت دی گئی۔ مگر جارحانہ قوم پرستی کے علمبرداروں نے اس ملک میں مسلمانوں کے عرصۂ حیات تنگ کرنے کی پوری سازش کی۔ ملک میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین وتنقیص کی ناپاک مہم چلائی گئی۔ مولانا عبدالجلیل رحمانیؒ کا غیور قلم برداشت نہ کرسکا، انکی اسلامی غیرت شعلہ جوالہ بنکر خرمن باطل کو خاکستر کرگئی:

''ملک کی قسمت میں آزادی مقدر ہوچکی تھی، وہ مل گئی، مگر ہماری دل آزاری کے لئے جو حربہ چلایا جارہا ہے، ہم شرعی نقطۂ نظر سے کروڑوں مسلمانوں کی ترجمانی کررہے ہیں، کہ ہمیں ایسی آزادی سے کوئی محبت نہیں ہوسکتی، ایسے ملک سے کوئی دلچسپی نہیں ہوسکتی ...... جس ملک میں محسن اعظم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو محفوظ نہ ہو۔ مسلمان خواہ کیسا ہی دیندار ہو یا بے دین، پرہیزگار ہو یا فاسق و فاجر، اپنی ماں بہن کی گالیاں برداشت کرلے گا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین اسے برداشت نہیں۔

''فلم انڈیا'' ہو یا ''امرت پتریکا''، کیا ان کے ایڈیٹر اتنے

بڑے جاہل ہیں کہ مذہبی رہنماؤں کی توہین کی اہمیت نہیں سمجھتے ؟
ہمارے وزیر اعظم کو ملال ہے کہ کانپور کے مسلمانوں کو محض ایک شخص کی شخصی غلطی کی وجہ سے پورے ملک کی آزادی کے جشن کا بائیکاٹ نہیں کرنا چاہئے لیکن جو ملک اور جس ملک کی حکومت ایسے دریدہ دہنوں کو لگام نہ دے سکے ہم آزادی کی خوشی کو کیا جانیں۔
ایک مشہور کمیونسٹ لیڈر نے اپنی حالیہ تقریر میں کہا ہے کہ ''اس رام راج سے ٹام راج اچھا تھا''۔(ستمبر۱۹۵۲ء ص/۵)

ماہنامہ مصباح کا ایک مستقل کالم تفسیر قرآن کا تھا جو ''تسہیل القرآن کے عنوان سے مولانا عبدالجلیل رحمانیؒ کے قلم سے مسلسل شائع ہوتا رہا۔اس تفسیر کا آغاز سورہ فاتحہ سے ہوا۔طریقۂ تفسیر یہ تھا کہ پہلے آیات کا ترجمہ دیتے اس کے بعد سورہ کے مختلف ناموں اور انکی وجہ تسمیہ کا بیان ہوتا۔اس ضمن میں سورہ کی فضیلت کے باب میں وارد احادیث ، روایات تفسیر، اقوال صحابہ و تابعین بھی مذکور ہوتے ۔ اور آخر میں ہر آیت کی علیحدہ علیحدہ تشریح ہوتی۔مثال کے طور پر ''ایاك نعبد و ایاك نستعین'' کی تفسیر میں کہتے ہیں:

''عبادت انتہائی ذلت اور خشوع و خضوع کے اظہار کا نام ہے، یا ذلت اور عاجزی کے ساتھ کسی کی فرمانبرداری کرنے کو عبادت کہتے ہیں، یا کسی کی تعظیم کیلئے کوئی کام کیا جائے اسے بھی لغت میں عبادت کہیں گے۔ ائمہ تفسیر سے عبادت کی یہ مختلف

تعبیرات منقول ہیں۔ استعانہ کے معنی معونت طلب کرنا ، یعنی زندگی کی تمام ضروریات میں امداد مانگنا۔

ظہورِ اسلام کے وقت انسان طرح طرح کے شرک وکفر میں مبتلا تھا، چاند سورج، کنکر پتھر، آگ پانی، نور و ظلمت اور جن وشیاطین سب کو خدا کا شریک ٹھہرائے ہوئے تھا اور مختلف صورتوں میں انکی عبادت کرتا اور ان سے امداد چاہتا تھا۔ آیت کریمہ میں بندہ اللہ کی ربوبیت ورحمت اور مکافاتِ عمل وعدالتِ الٰہی کے اقرار واظہار کے بعد عبادت اور استعانت کے جمیع انواع و اقسام کو اللہ کے لئے مخصوص کرنے کا اعلان اور شرک جلی و خفی ، ہر ایک سے برأت کا اظہار کر رہا ہے''۔ (اکتوبر ۱۹۵۱ء، ص ۱۲۔۱۳)

بسا اوقات آیات کا لفظی ترجمہ کرتے ، پھر با محاورہ ترجمہ بھی رقم کرتے۔ سورہ البقرہ آیات ۴۰۔۴۵ کا لفظی ترجمہ اس طرح کرتے ہیں:

''اے بیٹو اسرائیل کے، یاد کرو تم میری نعمت، وہ انعام کیا میں نے تمہارے اوپر، اور پورا کرو تم میرا عہد، پورا کرونگا میں تمہارا عہد، اور خاص کر مجھ سے ڈرو تم، اور ایمان لاؤ تم جو اتارا میں نے، تصدیق کرنے والا جو تمہارے پاس ہے، اور نہ ہو جاؤ تم اول کفر کرنے والے اور نہ خریدو تم میری آیتوں کے عوض تھوڑی قیمت۔ خاص کر مجھ سے ڈرو تم، اور نہ ملاؤ تم سچائی جھوٹ کے ساتھ، اور چھپاؤ سچائی اور تم جانتے ہو۔ اور قائم کرو نماز اور ادا کرو

زکوۃ اور جھکو تم جھکنے والوں کے ساتھ۔ کیا حکم کرتے ہو تم آدمی، نیکی کے ساتھ اور بھولتے ہو تم اپنے نفسوں کو اور پڑھتے ہو تم کلام الٰہی، کیا نہیں سمجھتے ہو تم۔ اور مدد حاصل کرو تم صبر کے ساتھ اور نماز۔ اور بے شک وہ البتہ بہت بڑی ہے مگر ڈرنے والوں پر۔ وہ لوگ یقین کرتے ہیں بے شک وہ سب ملاقات کرنیوالے، اپنا رب، اور بے شک وہ اسکی طرف پلٹنے والے ہیں"۔

یہ لفظی ترجمہ بے ربط ہے۔ کہیں کہیں ترجمہ میں جھول پیدا ہو گیا ہے اور مفہوم خلط ملط ہو گیا ہے۔ جیسے

اتأ مرون الناس بالبر (کیا حکم کرتے ہو تم آدمی نیکی کے ساتھ)

اس آیت کے ترجمہ کا کوئی مطلب ہی نہیں نکلتا، یا درج ذیل آیت:

ولا تلبسوا الحق بالباطل و تکتموا الحق (اور نہ ملاؤ تم سچائی جھوٹ کے ساتھ اور چھپاؤ سچائی)

کا ترجمہ غلط ہو گیا ہے۔ وتکتموا الحق میں عربی زبان کے اسلوب کے مطابق لا نافیہ حذف ہو گیا ہے۔ اس کا ترجمہ اور مفہوم میں اظہار کرنا ضروری ہے، اس کی وجہ یہ ہے بعینہ لفظی ترجمہ کسی زبان میں بھی درست نہیں ہے، اس سے خلط مبحث ہوگا اور اظہار مالا یرام لازم آئے گا۔ مولانا عبدالجلیل رحمانی ؒ نے انہی آیتوں کا بامحاورہ ترجمہ کیا تو یہ تمام مشکلات رفع ہو گئیں۔ ان کا بامحاورہ ترجمہ دیکھئے:

"اے بنی اسرائیل، میری وہ نعمت یاد کرو جو میں نے تم پر نازل کی تھی، اور پورا کرو میرے ساتھ کیا ہوا اپنا عہد۔ پورا کروں گا

میں بھی اپنا وعدہ، اور تم مجھ ہی سے ڈرو اور ایمان لاؤ اس کتاب (قرآن) پر جس کو میں نے نازل کیا ہے اور جو [illegible] رتی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے (یعنی توراۃ، انجیل، زبور) (اس کتاب کے ساتھ) تم ہی سب سے پہلے کفر کرنیوالے نہ ہو اور میری آیتوں کے بدلہ میں حقیر مال مت قبول کرو، صرف میرا خوف رکھو، حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط مت کرو اور نہ تو حق وصداقت کو چھپاؤ جب کہ تم حق وصداقت کی حقیقت سے واقف ہو، نمازیں پڑھو اور زکوۃ ادا کرو اور خدا کے سامنے جھکنے والوں کے ساتھ جھکو۔ تم لوگوں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو مگر اپنی اصلاح نفس نیکی سے غفلت برتتے ہو حالانکہ تم اللہ کی کتاب ہمیشہ پڑھتے رہتے ہو تم ایسی کھلی ہوئی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ اور دیکھو صبر اور نماز کے ذریعہ قوت حاصل کرو۔ نماز بہت بھاری گذرتی ہے مگر اللہ سے ڈرنے والوں پر، یعنی جو خدا کی ملاقات پر یقین رکھتے ہیں اور جن کو یقین ہے کہ وہ خدا کی طرف لوٹائے جائیں گے''۔

(مصباح ستمبر ۱۹۵۲ء، ص ر ۷)

تاہم مولانا رحمانیؒ کے اس بامحاورہ ترجمہ میں بھی کہیں کہیں مفہوم ادا نہیں ہوسکا ہے اور زبان کا سقم ادائے معنی میں قدرے حائل ہے۔ جیسے:

وانها لكبيرة الا على الخاشعين کا ترجمہ مولانا نے کیا ہے: ''نماز بہت بھاری گذرتی ہے مگر اللہ سے ڈرنے والوں پر'' اس طرز تعبیر میں کچھ کمی محسوس ہوتی

ہے۔اگر ترجمہ کے آخر میں ''نہیں'' کا اضافہ ہو جاتا تو معنی واضح ہو جاتا۔

''مصباح'' کا ایک مستقل کالم شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوریؒ کے مقالات، جوابات استفتا اور محدثانہ تبصروں اور وضاحتوں کے لئے وقف تھا۔شیخ الحدیث کی ان تحریروں پر ''بحث و مذاکرہ''، ''رسائل مسائل''، ''مذاکرہ علمیہ''، ''استفسارات اور انکے جوابات'' وغیرہ عنوانات قائم کئے گئے۔ان تحریروں میں کبھی تاریخ وسیر کے اشکالات حل کئے گئے، کبھی فقہی مسائل پر بحث ہوئی اور بریلوی علماء کے دلائل کا تجزیہ کیا گیا۔(دسمبر ۱۹۵۱ء، ص/۷۔۱۳)، کبھی کسی حدیث کو ترجیح دینے کے اسباب ووجوہ کی نشاندہی کی گئی۔(جنوری ۱۹۵۲ء، ص/۹۔۱۴)، بہرحال یہ تمام وقیع محدثانہ نگارشات استفتا کے جواب میں وجود میں آئی ہیں اور ان سے رسالہ کی علمی حیثیت بڑھ گئی ہے۔شیخ الحدیث کی اولین تحریر شائع کرتے ہوئے فاضل مدیر نے ان کی محدثانہ خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ممنونیت کا اظہار کیا ہے اور توقع ظاہر کی ہے کہ انکے عالمانہ مقالات آئندہ کی اشاعتوں میں شامل رہیں گے۔مدیر نے اس کے بعد یہ نوٹ تحریر کیا ہے:

> ''ماہ محرم الحرام عربی سال کا پہلا مہینہ ہے، دنیا کی دوسری قوموں کا جب نیا سال شروع ہوتا ہے تو سال نو کی آمد کی خوشی میں جشن مسرت منایا جاتا ہے، مگر مسلمانوں کے یہاں سال نو کے آتے ہی نوحہ و ماتم کا ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے کیونکہ اتفاق سے اسی ماہ کی دس تاریخ کو امام حسین علیہ السلام کی شہادت کا سانحہ پیش آیا تھا۔ خلیفہ یزیدؒ بن معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کے عہد خلافت میں یزید ابن

معاویہ ہی کی فوج کے ہاتھوں امام حسینؓ شہید ہوئے تھے اس لئے نوحہ و ماتم کے ساتھ ہر سال لاکھوں اور کروڑوں لعنتیں نظم و نثر کی صورت میں یزید بن معاویہ پر بھیجی جاتی ہیں۔ یزید تابعی تھے ان کے باپ صحابی اور دادا صحابی تھے اس لئے لعنت بھیجنے سے قبل بڑی ذمہ داری اور احتیاط کے ساتھ اصلیت کی جانچ ضروری ہے۔ علامہ موصوف نے دلائل قاطعہ کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ یزید بن معاویہ لعنت کے مستحق نہیں نہ ان پر لعنت جائز ہے''۔ (مصباح اکتوبر 1951ء، ص ۱۷۔۲۱)

ماہنامہ مصباح میں بعض بڑے دلچسپ اعلانات اور خبریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ ماہ دسمبر ۱۹۵۳ء اور ماہ جنوری ۱۹۵۴ء کے مشترکہ شمارہ میں ''عبدالرؤف خاں رحمانی ناظم مدرسہ نعمت العلوم جھنڈا نگر'' کی جانب سے ''مژدۂ جانفزا۔ تعمیر مدرسہ جھنڈا نگر واقع راج نیپال'' کے عنوان سے یہ خبر شائع ہوئی کہ ۱۹۴۶ء میں درسگاہ کی جو دو منزلہ عمارت تعمیر ہوئی تھی وہ اعدائے دین کی ریشہ دوانیوں سے بحکم راج نیپال ۱۹۴۸ء میں منہدم کردی گئی۔ ''میری طرف سے دو سال تک حکومت نیپال سے چارہ جوئی ہوئی اور مقدمہ کی پیشی کا سلسلہ جاری رہا۔ ادھر ہندوستان کے اکابر و مقتدر علماء مولانا حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر محمود صاحب وزیر تعلیم صوبہ بہار اور حضرت مولانا ابوالکلام صاحب آزادؒ وزیر تعلیم ہند مدظلهم العالی کی مساعیٔ جمیلہ کے طفیل ہندوستان کے

روشن ضمیر شریف النفس پنڈت جواہر لال نہرو وزیراعظم ہند نے بھی حکومت نیپال کو توجہ دلائی۔ آخرش دوسال کے مسلسل جدوجہد کے بعد مدرسہ کی تعمیر کی اجازت حاصل ہوگئی۔شکر اللہ سعیہم چنانچہ کٹھمنڈو خاص سے راقم الحروف کو شاہی مہر سے آراستہ حکمنامہ ماہ جون ۱۹۵۰ء میں باضابطہ دستیاب ہوا''۔ (ص/۵۵)

اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں ملی مسائل میں ہمارے اکابر اپنے تمام اختلافی نظریات کے باوجود اجتماعی روح اور مشاورت کے ساتھ گہری دلچسپی لیتے تھے اور ان کی جدوجہد اور خدمات کا برملا اعتراف بھی ہوتا تھا۔آج اس مشترکہ جدوجہد کو دیکھنے کے لئے آنکھیں ترستی ہیں اور اس اعتراف وتقدیر کے لئے ہماری زبانوں پر قفل لگے ہیں اور قلم کی سیاہی خشک ہوگئی ہے۔مسلم پرسنل لاء بورڈ ایک پلیٹ فارم ایسا رہ گیا تھا جو مشترکہ جدوجہد اور حیات اجتماعی وملی کے خوابوں میں رنگ بھر سکتا تھا مگر اس پر بھی اب شب خوں مارے جارہے ہیں اور یہ ''مقدس فریضہ'' ہمارے ارباب جبہ و دستار انجام دے رہے ہیں۔

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیار

عالم اسلام کی مقتدر شخصیات، اصحاب فکر علماء اور ملی دانشوروں کی وفات پر تعزیت نامے بھی ''مصباح'' کی زینت بنے۔ ۹/نومبر ۱۹۵۳ء کو سلطان عبدالعزیز بن سعود نے شاہی محل جدہ میں انتقال کیا تو مدیر محترم نے ان کی حیات وخدمات پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے سیاسی وانتظامی عطیات کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا اور انکی ملکی وملی خدمات اور مآثر عظیمہ کو سنہرے حرفوں سے تحریر کئے جانے کے قابل

قرار دیتے ہوئے انہیں ''شاہان عدل'' اور'' حاملین سنت خلفاء'' کی تاریخ میں ممتاز ٹھہرایا۔ (دسمبر: ۱۹۵۳ء، جنوری: ۱۹۵۴ء، ص/۳) ۲۲رنومبر ۱۹۵۳ء کو وفات پانیوالے جلیل القدر عالم سید سلیمان ندویؒ کو بین الاقوامی شہرت کا حامل بتایا۔ بلکہ وہ یہاں تک لکھ گئے کہ ''مرحوم نے اپنے استاذ (علامہ شبلیؒ) کی صرف جانشینی کا فرض انجام نہیں دیا بلکہ گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے ان پر سبقت بھی لے گئے۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی داغ بیل شبلی مرحوم کے ہاتھوں پڑی مگر پروان چڑھایا ارشد تلمیذ ندویؔ ہی نے۔ سیرت نبوی علیہ الوف التحیۃ کا صرف ایک خاکہ کہا جاسکتا ہے جسے شبلی مرحوم نے تیار کیا تھا ورنہ سارا نقش ونگار سید مرحوم ہی کے ہاتھوں تکمیل کو پہونچا ہے''۔ (نفس مصدر ص/۴)

اور دینی مدارس ومکاتب کی اہمیت پر ناظم دارالعلوم اور مدیر'' مصباح'' کی یہ تحریر تو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے:

> ''عربی فارسی اور اردو کے چھوٹے بڑے مدرسے اور مکتب اللہ کی نعمت ہیں۔ انکی قدر کرو، انکو قائم اور زندہ رکھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے اسلام وایمان کی حفاظت، تمہارے بچوں کے دین و ایمان کے نگرانی کے یہ مضبوط ستون ہیں۔ مسلمان کے گھروں میں اسلام کی جو روشنی پائی جاتی ہے انہیں مدرسوں اور مکتبوں کا طفیل ہے۔ آندھیاں بہت تیز چل رہی ہیں۔ دیکھو یہ ٹمٹماتے ہوئے چراغ بجھ نہ جائیں''۔ (مصباح دسمبر ۱۹۵۱ء، ٹائٹل کا تیسرا صفحہ)

نیپال کے سرحدی قصبہ جھنڈا نگر سے پچھلے دس سالوں سے پابندی سے شائع ہونیوالا ماہنامہ ''السراج'' دراصل جامعہ سراج العلوم السّلفیہ کا ترجمان ہے، جو بیادگار بابا سردار خاںؒ پدر بزرگوار الحاج نعمت اللہ خاںؒ بانی جامعہ سراج العلوم السّلفیہ جھنڈا نگر نیپال زیر سرپرستی خطیب الاسلام حضرت مولانا عبدالرؤف رحمانی رکن رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ زیر ادارت مولانا شمیم احمد خاں ندوی وجعلنا سراجا وھاجا (النبأ : ۱۳) کے قرآنی طغری کے ساتھ کتاب وسنت کی دعوت اور الحاد و بدعت کے استصال میں مصروف ہے۔ اس رسالہ کی مجلس ادارت میں مولانا صلاح الدین مقبول (کویت)، مولانا عبدالوہاب حجازی (بنارس)، مولانا خورشید احمد سلفی (جھنڈا نگر)، مولانا عبدالحیٔ مدنی (تولہوا) اور ڈاکٹر منظور احمد خاں ندوی (کدربٹوا) جیسے اہل حدیث علماء اور ملی قائدین کے نام نظر آتے ہیں۔ اس ماہنامہ کی ترتیب وتزئین میں ایک مدت تک مولانا عبدالمبین ندوی نے خون جگر جلایا اور اب برسوں سے مولانا عبدالمنان سلفی اس کے نوک پلک سنوارنے میں مدیر کی حیثیت سے مصروف ہیں۔ السراج کی اشاعت کا آغاز جون ۱۹۹۴ء سے ہوا۔ اب تک پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔

ماہنامہ السراج کا اداریہ تجلیات کے کالم کے تحت عام طور سے مدیر اعلیٰ مولانا شمیم احمد خاں ندوی رقم کرتے ہیں۔ یہ اداریہ ملکی و عالمی حالات، قومی وملی مسائل پر بڑا مفصل، مدلل، متوازن اور دلنشین ہوتا ہے۔ زبان کی سلاست و روانی، جذبہ کی تپش اور گرمیٔ فکر اس کی خصوصیت ہے۔ نکتۂ نظر عام طور سے انسانیت نوازی، ملی وحدت اور

قومی سالمیت کا ترجمان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۹۵ء میں فیروز آباد (یوپی) ٹرین حادثہ پر فاضل مدیر قلم اٹھاتے ہیں تو اس قومی المیہ کے وقت پولس کے گھناؤنے کردار سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ''ایک طرف تو اس ناگہانی حادثہ کے صدمہ سے نڈھال زخمیوں کی کراہیں اور ملبوں کے نیچے دبی ہوئی لاشیں تھیں، دوسری طرف پولیس کا ان پر بھوکے گدھوں کی طرح سے جھپٹنا اور اسی طرح بدقسمت مسافروں کے قیمتی ساز و سامان، نقدی اور زیورات کی لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ گویا کہ دشمن ملک کی کسی مفتوح فوج کا مال غنیمت لوٹا جا رہا ہے''۔ (السراج اکتوبر ۱۹۹۵ء، ص/۷۔۸) فاضل مدیر اسے خود غرضی کی سیاست قرار دیتے ہیں۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

وہ عراق پر امریکی حملوں کے خلاف عالم اسلام کے ضمیر کو جھنجھوڑتے اور ان کی اسلامی غیرت وحمیت کو للکارتے نظر آتے ہیں: ''بے غیرتی اور بے شرمی کا حال تو یہ ہے کہ بعض اسلامی ملکوں نے چند ٹکوں یعنی چند ڈالروں کے عوض اپنے دین وایمان کا سودا کر لیا ہے''۔ (مارچ ۲۰۰۳ء، ص/۹) اور ''جو اسلامی ممالک براہ راست اس جنگ کا شکار یا اس سے متاثر ہونیوالے ہیں ان کی جانب سے وہ پر اسرار خاموشی ہے اور ان ملکوں پر وہ سکوت مسلط ہے کہ۔

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

نہ کہیں احتجاج، نہ مظاہرہ، نہ کوئی جلوس، نہ جنگ کے خلاف نعرہ۔ ایسا نہیں ہے کہ انہیں جنگ کی تباہ کاریوں کا اندازہ نہیں ہے، یا امریکی اداروں کے متعلق وہ کسی

خوش فہمی کا شکار ہیں، لیکن جہاں تک اسلامی سربراہان مملکت کا سوال ہے ان میں سے بیشتر کی حکومتیں امریکی آشرواد پر ٹکی ہوئی ہیں، یا وہ سیاسی و معاشرتی اعتبار سے امریکہ کے اس قدر دست نگر ہو چکے ہیں کہ اب امریکہ کی گرفت اور اس کے پھیلائے ہوئے مضبوط جال سے نکلنا ان کے لئے ممکن نہیں رہا"۔ (حوالہ بالا، ص/۸)

مولانا ندوی علمائے اسلام اور اصحاب جبہ و دستار کے قول و عمل کے تضاد کو بھی بڑے سوز اور دردمندی سے اداریہ کا موضوع بناتے ہیں۔ علمائے کرام کا اٹھتا ہوا اعتبار، انکی گرتی ہوئی ساکھ اور کھوتی ہوئی مقبولیت فاضل مصنف کے الفاظ میں بے وجہ نہیں ہے۔ عوام کو علماء کی ذات میں یقین و اعتماد کی کمی اور اس روح اخلاص کا فقدان نظر آتا ہے جو اپنی بات کو منوانے اور سر اطاعت خم کرنے کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ جگر مرادآبادی کے الفاظ میں ؎

واعظ کا ہر ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرور عشق نہیں، چہرہ پہ یقیں کا نور نہیں

(السراج ستمبر ۲۰۰۳ء، ص/۵)

وہ اتحاد ملت کی راہ میں حائل ان جاہ پرست علماء کی بھی خبر لیتے ہیں: " جنکو اپنی بات اس وقت تک نامکمل محسوس ہوتی ہے یا ان کے مصرعہ کا وزن اس وقت تک درست نہیں ہوتا جب تک دوسری جماعت کی مقتدر شخصیات یا دوسرے مسلک کے علماء واعیان کی ذات میں عیوب و نقائص تلاش کر کے انہیں برسر مجلس رسوا نہ کر دیں"۔ انکے اس طرز عمل سے "دوسری جماعت کے لوگوں کی دل آزاری ہوتی ہے تو ہوا کرے، ان کا جگر چھلنی ہوتا ہے تو ہوا کرے، ہمیں ایسی دل فگار اور دل خراش باتیں

کر کے صرف اپنے دل کا غبار نکالنے سے مطلب ہے اس میں نہ کسی کی اصلاح مقصود ہوتی ہے اور نہ ملت میں انتشار سے ہمیں کچھ غرض اور واسطہ ہے۔ علامہ حالی نے اس طرز عمل کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

بڑھے جس سے نفرت وہ تحریر کرنی
جگر جس سے شق ہوں وہ تقریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

اور تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب انکی توپوں کا رخ اپنی جماعت کے لوگوں کی طرف ہو جاتا ہے اور یہاں بھی اسی رفتار سے گولہ باری شروع ہو جاتی ہے اور سب و شتم اور طعن و تشنیع کے تیر چلنے لگتے ہیں یعنی جن لوگوں سے نہ کوئی مسلکی اختلاف ہے نہ عقیدہ و عمل کا، وہ بھی ان کے حملوں سے محفوظ نہیں۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہیں مرغ قبلہ نما آشیانے میں

(حوالہ بالا، ص/۱۱)

اس رسالہ میں مقالات کے علاوہ مستقل کالم کچھ یوں ہیں: ''کاروان دعوت'' جس میں دعوتی سرگرمیوں، علمی اسفار اور مختلف ارباب جامعہ کی دینی کاوشوں کی رپورٹ شائع ہوتی ہے۔ ''جماعت و جامعہ'' کالم میں نیپال کے دعوتی و تنظیمی دوروں

کی تفصیلات ہوتی ہیں اور جامعہ سراج العلوم کے معمولات ، امتحانی مصروفیات ، تدریسی مشاغل وغیرہ درج ہوتے ہیں۔ وفیات کے کالم میں جماعت اہل حدیث کے علماء، ہمدردوں اور رشتہ داروں کی تعزیتی خبریں ہوتی ہیں۔ ایک کالم ''ادبیات'' کا بھی ہوتا ہے، جس میں تابش سدھارتھ نگری ، ذاکر ندوی، عبداللہ احسان وساویوالہ، حیرت بستوی، ابوسعود سلفی، اطہر نقوی، صابر رحیمی، مطیع اللہ مدنی، سالک بستوی، نسیم زاہد، شمس نظیری، ابوفوزان مدنی، شمس کمال انجم، فضل حق مبارکپوری، طالب مبارکپوری، قاری عمر فاروق نیپالی، شائق بستوی، جاوید احسن فلاحی وغیرہ اہل حدیث شعراء کی تخلیقات زینت بنتی رہی ہیں۔ ان میں بعض نظمیں اور غزلیں تو ادب کے معیار کو نہ صرف کماحقہٗ پورا کرتی ہیں بلکہ بعض تلمیحات کے استعمال اور مسلک سلف اور علمائے اہل حدیث کی خدمات شماری کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ مثال کے طور پر ذاکر ندوی کی نظم ''جمعیۃ اہل حدیث'' کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

شیر پنجاب اک ثناء اللہ وسیف اللہ تھے
حضرت جونا گڑھی دعوت کے اسد اللہ تھے
کاغذی شیر اور تھے اور تھا حقیقی بوالوفا
وہ نہیں پنجاب ہی کا، بلکہ شیر ہند تھا
اور احسان الٰہی یعنی علامہ ظہیر
کاروان دعوت حق کے تھے وہ اعلیٰ امیر
اور خطیب الہند وہ جھنڈا نگر کے یاد ہیں
ان کے خطبوں سے فضائیں آج تک آباد ہیں

غزنوی داؤد کی شعلہ فشاں تقریر تھی
میہ کی تفسیر لوح قلب پر تحریر تھی
عبد رحمان مبارکپور کی جرح حدیث
جوزی وابن حجر کی شرح تھی شرح حدیث
عون معبود اور شاہد غایۃ المقصود بھی
ذات شمس الحق ڈیانہ میں بھی اک موجود تھی
اور حریری، میمنی، بسکوہری عبدالغفور
سب یہ تھے عربی ادب کے مرتفع مینا ر نور

(السراج اکتوبر ۲۰۰۳ء۔مارچ ۲۰۰۴ء،ص ۲۱۳)

ماہنامہ السراج نے عام طور پر اعتدال وتوازن کا مسلک اختیار کیا ہے۔تشدد، انتہا پسندی، فتوی بازی اور تکفیر سے اجتناب کیا ہے۔فرقہ وارانہ فکر کے بجائے ملی فکر کی نمائندگی کی ہے۔ جواب الجواب اور الزامی اسلوب نیز مناظرہ بازی کو قریب نہیں آنے دیا ہے۔اشتعال انگیزی اور ہیجان خیزی سے کافی فاصلہ برقرار رکھا ہے۔البتہ بعض مضامین شاید شدید نفسیاتی دباؤ کے زیر اثر ایسے شائع ہو گئے ہیں جو اسکے مجموعی مزاج سے ہم آہنگ نہیں معلوم ہوتے۔جیسے ڈاکٹر عبدالحمید منصور کا مولانا امین احسن اصلاحیؒ سے لیا گیا انٹریو کو مولانا تدبر لاہور اپریل ۱۹۹۸ء سے نقل کر کے اس پر مدیر گرامی کے وضاحتی بیان کے ساتھ السراج اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۹۸ء کے شماروں میں شائع کرنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ جب کہ ''مولانا اصلاحی کے طرز تفسیر اور انکے بہت سے علمی نظریات'' سے ادارہ اتفاق بھی نہیں کرتا۔اس پر مستزاد یہ کہ فاضل مدیر کا یہ تبصرہ

کھٹکتا ہے کہ اب جماعت اسلامی میں ''بیشتر وہی لوگ باقی یا شامل ہیں جنہوں نے مولانا مودودی صاحبؒ کی کتابوں ہی سے اسلام کو سمجھا ہے، مگر اس جماعت کا ہر فرد اپنے کو دین کا رمز شناس سمجھتا ہے''۔(ص/۲۶)

اسی طرح ''ابوالکلام آزاد او یکنگ سنٹر نئی دہلی'' کے دفاع میں مولانا شمیم احمد ندوی نے جو اداریہ رقم کیا ہے وہ ادارہ کے معتدل اور متوازن طریقہ کار کے بارے میں سوالیہ نشان قائم کرتا ہے۔ وہ اس اداریہ کا عنوان قائم کرتے ہیں:

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اس ادارہ اور اس کے بانی کی بیش بہا خدمات شمار کراتے ہوئے فاضل مدیر جب اسکی اندرونی تقسیم، گروہ بندی اور باہمی ریشہ دوانی پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کا قلم جذبات کی رو میں بہہ کر مخالفین کو ''برادران یوسف'' کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے۔ یہاں وہ ایک مصلح کے بجائے جانب دار اور طرفدار نظر آنے لگتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی ہاں انکا مشورہ بڑا قیمتی معلوم ہوتا ہے کہ ''شخصی مصالح کے لئے اداروں کی قربانی کی جو روش چل پڑی ہے اس کے خلاف ہر سطح پر صدائے احتجاج بلند کی جائے تا کہ ایسی ناخوشگوار صورت حال دوبارہ نہ پیدا ہو''۔ (السراج اکتوبر ۱۹۹۹ء، ص/۱۰) البتہ اداروں کی تنظیم و تنسیق میں معاملہ فہمی و سمجھداری، شورائیت اور جواب دہی، شفافیت اور امانت و دیانت کی تلقین ہر دو فریقوں کے لئے ہے۔

ماہنامہ السراج نصح و خیر وخواہی کا فریضہ اپنے گھر میں ادا کرتا ہے۔ جمعیت اہل حدیث اور اسکے ارباب کار کو آئینہ فراہم کرتا ہے، انہیں غفلت و سستی، انفرادیت و

خاندانی عصبیت سے نکال کر متحدہ جدوجہد کے لئے سربکف ہونے پر آمادہ کرتا ہے۔

مولانا خورشید احمد سلفی ایک مہمان اداریہ میں اکابر اہل حدیث سے خطاب کرتے ہیں تو دکھتی رگ پر انگلی رکھ دیتے ہیں: ''ہمیں اس سے انکار نہیں کہ کسی نہ کسی درجہ میں کام ہو رہا ہے، لیکن الگ الگ جمعیت کی کشتی کو کیوں غرقاب کیا جا رہا ہے، جس پر سارے اہل حدیث علماء سوار ہو کر اپنی قوت مجتمع کر کے کام کر سکتے تھے، کہیں تو ایسا نہیں ذاتی اور محدود مفادات آڑے آ رہے ہیں''؟ (السراج ۱۹۹۷ء، ص/۶۔۷)

ملک نیپال میں جمعیت اہل حدیث کے قیام کا سہرا حضرت مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری کے سر ہے یا کسی اور کے؟ اس سوال پر ادرہ کے ذمہ دار عالم دین گفتگو کرتے ہیں تو انداز تحریر میں کاٹ پیدا ہو جاتی ہے اور تیر ونشتر کا اسلوب حاوی ہو جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس اسلوب کا فاضل مضمون دفاع بھی کرتے ہیں: ''میرا قلم اور اس سے نکلی ہوئی تحریریں درست ہیں اگر انکی حلاوت وشیرینی سے کوئی تپ زدہ لطف اندوز نہ ہو سکے تو قصور میرا نہیں بلکہ اسکے کام ودہن کا ہے، اسکے بے جا شور وشغب کے جواب میں اسکے علاوہ کیا کہا جا سکتا ہے۔

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

(السراج جنوری: ۱۹۹۸ء، ص/۳۳۔۳۴)

اس علمی اسلامی مجلّہ نے اپنے دس سالہ سفر کے دوران بعض خاص اشاعتیں بھی ترتیب دیں، جیسے مملکت سعودی عرب کے مفتی اعظم سماحۃ الشیخ علامہ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کی وفات حسرت آیات ۲۷/محرم ۱۴۲۰ھ/۱۳/مئی ۱۹۹۹ء کو واقع ہوئی تو

مجلس ادارت نے اشاعت خاص کا اہتمام کیا اور جون ۔اگست ۱۹۹۹ء رصفر۔ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ کے مشترکہ شمارہ کو مفتیٔ اعظم کی حیات وخدمات کیلئے وقف کیا۔اس شمارہ میں تجلیات ، پیغامات ،منظومات کے علاوہ علامہ بن بازؒ کی زندگی پر سات مضامین شامل ہیں، جن سے مرحوم کی دینی وعلمی خدمات پر روشنی پڑتی ہے۔مولانا عبدالرؤف رحمانی کا مضمون وقیع اور دلچسپ ہے، کہ شیخ بن باز سے انکے دیرینہ ذاتی مراسم کی وجہ سے اس میں دید وشنید کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔مولانا خورشید احمد سلفی اور مولانا عبدالمنان سلفی کے مقالات سوانحی تفصیلات اور علمی ودینی عطیات کا حسین مرقع پیش کرتے ہیں۔

دوسری خاص اشاعت ''کتاب وسنت نمبر'' اکتوبر ۲۰۰۳ء۔مارچ ۲۰۰۴ء کے مشترکہ شماروں پر مشتمل ۲۲۰ رصفحات پر محیط ہے۔اس میں قرآن وعلوم قرآن پر سات اور حدیث ومتعلقات حدیث پر بارہ مقالات شامل ہیں، خاص طور سے حدیث سے متعلق مقالات سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔زیادہ زور حجیت حدیث پر ہے اور شریعت اسلامی میں حدیث کی مصدری حیثیت پر دلائل نقل وعقل فراہم کئے گئے ہیں۔منکرین حدیث کا تعاقب بھی کیا گیا ہے۔ برصغیر میں انکار حدیث کے فتنہ کا سراغ لگاتے ہوئے علامہ نیاز فتحپوری، علامہ شبلی نعمانیؒ ،مولانا ابوالاعلی مودودیؒ،مولانا حمید الدین فراہیؒ،مولانا امین احسن اصلاحیؒ اور مولانا عنایت اللہ سبحانی کو فرق مراتب کے ساتھ حدیث کا استخفاف اور اس کی تحقیق وتنقیص کرنے کا مجرم قرار دیا گیا ہے۔(ص۱۱)
دراصل اس الزام کا آغاز مولانا محمد اسماعیل گوجرنوالہؒ نے کیا تھا، اس کے بعد سے مسلسل مختلف انداز میں اسے دوہرایا جاتا رہا ہے۔

اس خصوصی اشاعت کا ایک بڑا حصہ اس مسابقۂ حفظ قرآن کریم واحادیث نبویہ کی تفصیلی روداد پر مشتمل ہے جو ۲۷۔۲۸ر اگست ۲۰۰۳ء کو جامعہ سراج العلوم میں کل نیپال سطح پر مدارس عربیہ کے طلبہ کے لئے منعقد ہوا تھا، جس میں ننانوے طلبا نے حصہ لیا تھا اس مبارک موقع کی مناسبت سے جلسہ عام کا انعقاد بھی ہوا اور ہندو نیپال کے جید سلفی علماء نے کتاب وسنت کی اہمیت پر تقریریں کیں انکی تلخیص بھی اس اشاعت میں شامل ہے۔ اس طرح یہ ایک دستاویزی نوعیت کی اشاعت ہوگئی ہے۔

السراج کی ایک اہم خصوصی اشاعت خطیب الاسلام نمبر ہے۔ جو حضرت مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگریؒ (۱۹۱۰ء۔ ۱۹۹۹) کی وفات کے بعد ان کی حیات و خدمات اور دعوتی و تصنیفی خدمات پر مشتمل ہے۔ یہ خصوصی اشاعت مئی، اکتوبر ۲۰۰۰ء ر صفر، رجب ۱۴۲۱ھ کے مشترکہ شماروں پر ۶۷۰ ر صفحات پر محیط ہے۔ آغاز میں اداریہ سے پہلے چودہ تعزیتی خطوط عربی زبان میں ہیں۔ پھر حیات وعمومی خدمات پر سترہ مقالات شامل اشاعت ہیں۔ اخلاق وشمائل پر تین مضامین خاص طور سے روشنی ڈالتے ہیں۔ پانچ اصحاب قلم نے دعوتی وتبلیغی خدمات پر، سات مضمون نگاروں نے تصنیفی وعلمی کاوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا جھنڈانگری سے چار علاقوں کا مفصل بیان ہے۔ چوبیس تأثراتی مضامین ہیں۔ پندرہ منظوم خراج عقیدت، خطیب الاسلام کے نام بعض اکابر کے خطوط جیسے اہم گوشے بھی شریک اشاعت ہیں۔ نامور لکھنے والوں میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسین ازہری، ڈاکٹر بدرالزماں نیپالی، عبدالعزیز سلفی، حافظ صلاح الدین یوسف، مولانا مختار احمد ندوی، ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی، مولانا عبدالمعید سلفی، ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی، مولانا عبداللہ مدنی، مولانا عبدالسلام رحمانی، مولانا محمد رئیس ندوی،

مولانا سعید الرحمان اعظمی، مولانا عبدالوہاب حجازی، مولانا ابوالعاص وحیدی وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ مولانا خورشید احمد سلفی کا مفصل مضمون حیات وخدمات اور اوصاف وکمالات کا جامع مرقع ہے۔ وہ دید وشنید سے آگے بڑھ کر وشهد شاهد من أهلها کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ مولانا عبدالحنان فیضی اپنی تحریر میں خطیب الاسلام کی زندگی کے بعض گمنام گوشوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ مولانا عبدالمنان سلفی کی تحریر کے مطابق مولانا جھنڈانگری کی تصنیفات کی تعداد کم وبیش چار درجن سے زائد ہے۔ جن میں ۳۸ ر کتابوں کا تعارف خود مضمون نگار نے کرادیا ہے۔ ان میں بعض کتابیں کافی ضخیم اور معیاری ہیں۔ جن میں حدیث کی تشریعی حیثیت پر دو جلدوں میں ''صیانۃ الحدیث'' دفاع امام بخاری پر ''نصرۃ الباری'' دعوتی مقصد سے آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ ''ایمان وعمل''، ''ایام خلافت راشدہ'' وغیرہ دستاویزی مقام کی حامل ہیں۔ اس ضخیم اشاعت کے ذریعہ مجلس ادارت نے مولانا جھنڈانگری کی نوے سالہ دعوتی وعلمی جدوجہد کی تحسین وتبریک ہی نہیں کی ہے، بلکہ اس مخصوص خطہ کی علمی، دعوتی، دینی اور سماجی، تاریخ کی تقریباً ایک صدی کا ریکارڈ محفوظ کردیا ہے۔ جس پر ذمہ داران شکریہ کے مستحق ہیں۔ البتہ مولانا کی تصنیفی وعلمی کاوشوں کے تحقیقی وعلمی جائزہ کا کام ابھی باقی ہے، جس سے ان کی صحیح قدر وقیمت کا تعین ہوسکے۔

ماہنامہ السراج کی زبان وبیان کی چاشنی اور اسلوب کی فصاحت وبلاغت [illegible] اس کے فاضل مدیر کے ادبی وشعری ذوق کا پرتو نظر آتا ہے۔ ندوۃ العلماء سے ف[illegible] حاصل کرنے کے باوجود ان کے انداز تحریر میں شگفتگی ہے، زور بیان ہے، سلا[illegible] روانی ہے، زبان مدارس کی ثقالت سے پاک ہے۔ ان کے اداریوں کی ایک [illegible]

فہرست ہی سے اس ادبی لطافت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو اداریہ نگار کی تحریروں میں محسوس ہوتی ہے:

اسی کے نام سے آغاز ہے اس ماہنامہ کا۔	جون ۱۹۹۴ء
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا۔	اگست ۱۹۹۴ء
نیا جال لائے پرانے شکاری۔	ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۴ء
قاہرہ کا کانفرنس۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔	نومبر ۱۹۹۴ء
المیہ کشمیر: کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ۔	جون ۱۹۹۵ء
اقرباء میرے کریں خون کا دعوی کس پر۔	نومبر ۱۹۹۶ء
رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی۔	اکتوبر ۱۹۹۷ء
برطانوی استعمار کا ''خودکاشتہ پودا''۔	دسمبر ۱۹۹۷ء
جہاں میں عام ہے قلب ونظر کی رنجوری۔	مئی ۱۹۹۹ء
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے۔	اپریل ۲۰۰۰ء
صاحب نظراں! نشۂ قوت ہے خطرناک۔	اکتوبر، نومبر ۲۰۰۱ء
حمیت نام ہے جسکا گئی تیمور کے گھر سے۔	مارچ ۲۰۰۳ء
بابری مسجد۔ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔	جولائی، اگست ۲۰۰۳ء

کرشنا نگر کپل وستو نیپال ہی کے علاقہ سے ''اسلام کی حقیقی نمائندہ تحریروں'' کی ترجمانی کا علم اٹھا کر یھدی اللہ لنورہ من یشاء (النور:۳۵) کے قرآنی طغرے سے مزین ماہنامہ ''نورِ توحید'' مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری کی ادارت میں پچھلے پندرہ سولہ سالوں سے جہالت و بدعت کے اندھیروں میں ضیا پاشی کر رہا ہے۔

۲۴ رصفحات پر مشتمل یہ ماہنامہ متنوع مضامین وموضوعات پر مختصر مقالات اور تبصرے شائع کرتا ہے، اس کی مجلس مشاورت میں مولانا عبدالسلام رحمانی، مولانا عبدالحیٔ مدنی اورڈاکٹر سعید احمد اثری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔اس کے مستقل کالم الکتاب، الحکمۃ، شعوروآگہی اور مسلمانانِ عالم ہیں۔ پہلے کالم کے تحت قرآن کی کسی آیت کی تفسیر مسلک سلف کی روشنی میں کی جاتی ہے۔عام طور پر اہل حدیث مفسرین کی کاوشوں کا اختصار یہ پیش کیا جاتا ہے۔دوسرے کالم میں کسی ایک حدیث کی عام فہم تشریح ہوتی ہے اوراس کے عقائدی وعملی پہلو بیان ہوتے ہیں۔شعوروآگہی کا کالم دراصل اس رسالہ کا اداریہ ہے جو مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری تحریر کرتے ہیں۔آخری کالم عالم اسلام کی خبروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ صفحہ عام طور پر عالم عرب کے کسی اخبار یا جریدہ کے تراشہ کا ترجمہ ہوتا ہے۔اس سے مسلم دنیا کی اہم خبریں معلوم ہوجاتی ہیں اورامت واحدہ کا شعور قاری کے ذہن میں پختہ ہوتا ہے۔ایک اورکالم بیشتر شماروں میں جگہ پاتا رہاہے ''مرکز کے شب وروز'' کا جس میں مرکز التوحید کی دعوتی سرگرمیاں اور طالبات کی درسگاہ مدرسۂ خدیجۃ الکبریٰ کی علمی وتدریسی مصروفیات کی تفصیل گاہے گاہے شائع ہوتی رہتی ہے۔اس رسالہ کی اولین اشاعت مئی ۱۹۸۸ء میں عمل آئی تھی۔اب تواتر کے ساتھ پابندیٔ وقت سے شائع ہورہا ہے۔

مولانا عبداللہ مدنی اپنی اداریوں میں عام طور پر جدید مسائل کوموضوع بحث بناتے ہیں اوران پر ہلکے پھلکے انداز میں اسلامی تبصرے کرتے ہیں۔ان میں دینی حمیت بھی ہوتی ہے اورسیاسی بصیرت بھی۔زبان سہل اور عام فہم ہوتی ہے۔کہیں کہیں زبان وادب کے چٹخارے بھی ملتے ہیں۔وہ مغرب میں جنس کی تعلیم اورطلبا وطالبات

میں بڑھتی ہوئی جنسی آوارگی اور صنفی ہیجان پر قلم اٹھاتے ہیں تو اپنے درد وکرب کا اظہار اس عنوان سے کرتے ہیں۔

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی

وہ عربی مقولہ اذا لم تستح فاصنع ماشئت (جب بے حیا ہو گئے ہو تو جو چاہو کرو) سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں اور مغربی دنیا پر اسے پوری طرح منطبق بتاتے ہیں۔آج مغرب میں ''اپنے ساتھ اپنے نونہالوں کو C for condom کی جنسی تعلیم دیکر شہوت پرستی کے بیج بوئے جارہے ہیں۔ نتیجتاً پانچویں اور چھٹے درجہ کی طالبات کی پرسوں میں مانع حمل گولیاں پائی جارہی ہیں۔ناجائز حمل میں مستقل اضافہ ہورہاہے۔نوعمر بچیاں جنسی امراض کا شکار ہورہی ہیں۔اس طرح بدکاری وفحاشی کے بطن سے ایڈز جیسے مہلک مرض کی پیداوار بڑھتی جارہی ہے''۔(نورتوحید جنوری ۱۹۹۵ء،ص؍۳)

ستمبر ۱۹۹۵ء میں بیجنگ میں منعقد اقوام متحدہ کی حقوق نسواں سے متعلق چوتھی عالمی کانفرنس اور اس کی منظور کردہ ۱۲۰؍صفحات پر مشتمل قرارداد پر اداریہ میں اس وقت کے فاضل مرتب مولانا عبدالمنان سلفی نے قلم اٹھایا تو اس پر سخت تنقید کی۔ کانفرنس کو اپنے موضوع سے منحرف قرار دیا۔اس کی قراردادوں کو خواتین کے عزت و حرمت اور کرامت وشرافت کو ٹھیس پہونچانے کا ذریعہ بتایا۔اور آخر میں یہ دعوت فکرو عمل دی کہ ''اقوام متحدہ اگر خواتین کے مسائل حل کرنے میں واقعی سنجیدہ ہے تو اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کی وضع کردہ عائلی قوانین کو بلاکم وکاست نافذ کرے،جس میں عورت کی فطرت،نفسیات اور جسمانی ساخت کا لحاظ کرکے اسے ایسے حقوق سے

نوازا گیا ہے جن کا تصور اسلام سے قبل نہ تو کسی مذہب میں تھا اور نہ ہی آج ہی کہیں نظر آرہا ہے، اس لئے کہ یہ الٰہی قانون ہے نہ کہ ''ظلوم وجہول'' انسان کا بنایا ہوا قانون''۔ (نورتوحید اکتوبر ۱۹۹۵ء، ص ۳)

مولانا مدنی ۱۴ر فروری کو ہر سال منائے جانے والے ویلنٹائنڈے کو ''بے راہ روی کا نیا روپ'' قرار دیتے ہیں۔ ''یہ عام دنوں کی طرح ایک دن ہے مگر اہل مغرب نے اسے عشق ومستی کے دن کے طور پر منانے کا آغاز کیا ہے جس کی نسبت تیسری صدی کے ویلنٹائن نام کے ایک رومی پادری کی جانب کی گئی ہے۔ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''گلستان تثلیث'' کے ایک ''غنچۂ تر'' کی دل آویز خوشبو نے ان کا من موہ لیا تھا، نتیجتاً بدمستی کی صلیب پر چڑھ گئے اسی بوالہوس مصلوب پادری کی یاد میں منایا جارہا ہے جو جنسی بے راہ روی، بدچلنی، حرام کاری، وبدکرداری کے سوا اور کچھ نہیں''۔ (نورتوحید مارچ ۲۰۰۰ء، ص ۳)

فلسطین کے مرحوم رہنما یاسر عرفات اور سابق اسرائیلی وزیر اعظم شمعون پیریز کے درمیان مصر کے سیاحتی مقام شرم الشیخ میں معاہدۂ جنگ بندی ہوا، تو حماس کے روحانی قائد شیخ احمد یسینؒ نے فلسطینیوں کو للکارا کہ ''فلسطینی حکام اسرائیل کے ساتھ بات چیت کا ڈرامہ بند کریں اور ایک بار پھر سے خندقوں میں واپس چلے جائیں''۔ نورتوحید کے مدیر اعلیٰ نے حماس کے اس موقف کی تائید کی کیونکہ ''فلسطینی نوجوان آج اپنی بنیادی حقوق کے لئے لڑ رہے ہیں، اس پر کسی کو متعجب ہونیکی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ فلسطینیوں کی ۵۲ر سالہ بے دخلیوں، محرومیوں اور ۳۳ر سال سے اسرائیل کے فوجی قبضہ کا نتیجہ ہے...... اسرائیل نے راکھ کو کریدنے کی کوشش کی ہے، لیکن اسے

اندازہ نہیں کہ راکھ کے ڈھیر میں شعلہ بھی ہے، چنگاری بھی۔ جو اس کے وجود کو ایک لمحہ میں جلا کر بھسم کر سکتی ہے''۔ (نورتوحید اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ۳)

گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ کے جڑواں ٹاور عالمی تجارتی مرکز صفحۂ ہستی سے ناپید ہو گئے تو اس نے پورے خلیج کو ہدف انتقام بنا کر عراق پر بمباری کا آغاز کر دیا۔ اس صورت حال پر فاضل مدیر نے تبصرہ کرتے ہوئے امریکہ کو کوہ غرور سے تعبیر کیا، جسے ''یہ گمان بھی نہ تھا کہ اس دنیا میں ''برآرد بچنگال چشم پلنگ'' کے مظاہرے بھی ہوا کرتے ہیں۔ شیر کی آنکھ نکالنے والے ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں، مگر شیر زخمی ہے اور وہ سب کرنے پر آمادہ جس سے شیر کی لاج رہ جائے۔ شیر کے اندر جنگل کا راجہ ہونیکا غرور دنیاوی سپر پاور کے اقتدار اعلیٰ کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ اور اب یہ دنیا ایک جنگل ہے۔ جہاں جنگل کے قوانین نافذ کرنے کی تیاریاں ہیں، یہ شیر کوہ غرور بنا ہوا دہاڑ رہا ہے، دنیا جہاں کو للکار رہا ہے''۔ مگر فاضل مدیر امریکہ کو چتاونی دیتے ہیں ؎

اپنی ہستی پہ نہ اترائے کوئی کوہ غرور
وقت نے پھینک دیئے ایسے اٹھا کر کتنے

(نورتوحید جنوری ۲۰۰۳ء، ص ۳)

اس رسالہ کی پہچان وہ دینی و دعوتی مضامین ہیں جو ہر شمارہ کی زینت بنتے ہیں۔ بزرگ اور ثقہ عالم دین مولانا عبدالسلام رحمانی نے ''بڑے بڑے گناہ'' کے عنوان سے گناہ کبیرہ پر اپنی علمی و دینی تحریریں اسی رسالہ میں شائع کرائیں۔ یہ دراصل ایک ضخیم تصنیف ہے جو کتابی صورت میں اشاعت کی محتاج ہے۔ مولانا نے اپنے خاص اسلوب میں قرآنی آیات اور احادیث نبویہ کی روشنی میں ان گناہوں کی نشاندہی کی

ہے ''جنہیں کتاب وسنت کی کسی نص صریح نے حرام قرار دیا ہے، یا اس کے لئے اللہ اوراس کے رسول نے دنیا میں کوئی سزا مقرر کی ہے یا اس پر آخرت میں عذاب کی وعید سنائی ہے یا اس کے مرتکب پر لعنت کی ہے یا اس کے مرتکب پر نزول عذاب کی خبر دی ہے''۔اس نوعیت کے گناہوں کے ماسوا جتنے افعال بھی شریعت میں ناپسندیدہ ہیں وہ صغائر کی تعریف میں آتے ہیں۔مولانا کے اس سلسلۂ مضامین کا آغاز اکتوبر ۱۹۹۵ء کے شمارہ سے ہوا اور درجنوں اقساط اس رسالہ کی زینت بنیں۔اس سلسلہ کی مقبولیت اور معتبریت میں خاصا اضافہ کیا۔

رد بدعت بھی اس رسالہ کا ایک امتیاز ہے۔گاہے گاہے اس طرح کے مقالات رسالہ کے زینت بنتے رہتے ہیں۔مئی ۱۹۹۵ء کے شمارہ میں ڈاکٹر صالح بن فوزان الفوزان کی عربی تحریر کا ترجمہ محمد انورالسلفی کے قلم سے ''وسیلہ کی حقیقت'' پر شائع ہوا ہے۔اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مردوں سے وسیلہ طلب کرنا جائز نہیں ہے۔اسی شمارہ میں ڈاکٹر محمد یونس ارشد نے ''نور اور سراج منیر'' کی حقیقت اور کتاب وسنت کی روشنی میں ان کے اصل معنی سے بحث کی ہے اور ''بریلیوں کے خودساختہ عقیدہ'' کا بطلان کیا ہے۔(ص ۴/۔۱۰)۔اپریل ۲۰۰۰ء کے شمارہ میں مولانا محمد عطاء اللہ حنیفؒ کا مضمون قندمکرر کے طور پر ''عاشورہ کے دن کی شرعی حیثیت'' کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے اور احادیث نبویہ کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ یوم عاشورہ کو ''خصوصی کھانا، گھر میں توسیع وفراخی کرنا، محرم کے عشرہ میں خیرات کرنا یا خاص ۱۰ ر محرم کو مساکین کو کھانا کھلانا، دیگیں پکانا، دانے جوش دینا، سبیلیں لگوانا، ایسی سبیلوں سے پانی پینا یا ایسے کھانے کھانا وغیرہ امور سب بدعت اور ناجائز ہیں''۔(ص ۱۵/) جون، جولائی ۲۰۰۰ء کا مشترکہ

شمارہ تعویذ اور گنڈے کی شرعی حیثیت بتاتا ہے۔ مضمون نگار محمد جعفر نذیر احمد مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ ''وہ اپنے عقیدے کی حفاظت کریں اور تعویذ لٹکانے سے اجتناب کریں''۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ اللہ ''تمام مسلمانوں کو شعبدہ باز علماء اور تعویذ و گنڈا کے تجار کے دامن فریب سے بچائے''۔ (ص/۱۷) عرفان احمد عبدالواحد اپنے ''مضمون زیارت قبور'' میں ان بدعتوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں، جو آج کل عام طور سے اولیاء و صالحین کے مزاروں پر روا رکھی جاتی ہیں۔ (اکتوبر۲۰۰۳ء ص/۱۳۔۱۷) ڈاکٹر محمد الخمیس کے مضمون کے اردو ترجمہ میں مولانا عبدالمنان ولی کے مفہوم، ولایت کے مراتب، اولیاء کا مقام اور انکی کرامات سے بحث کرتے ہیں۔ اور آخر میں سلف سے منقول اس قول کو خلاصہ کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ ''جب تم دیکھو کہ کوئی شخص فضا میں اڑ رہا ہے اور پانی پر چل رہا ہے لیکن اس کا عمل شریعت کے خلاف ہے تو سمجھ لو کہ شیطان ہے''۔ (ستمبر۱۹۹۵ء ص/۱۷۔۱۹)

ملک میں قومیت و وطنیت کی جارحانہ تعبیرات و تشریحات، اکثریتی ثقافت و سنسکرتی کو تھوپنے کے حربے، اقلیتوں کے لسانی و دینی مسائل اور انکے تشخص پر ہونے والے منصوبہ بند یلغار جیسے حساس موضوعات پر قلم اٹھائے گئے ہیں۔ عبدالصبور جھنڈا نگری نے اپنے مضمون میں وندے ماترم کو عقیدۂ توحید کے منافی قرار دیا ہے۔ انہوں نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کے اس دوٹوک موقف کی حمایت کی کہ ''ایسے نغمے جن اسکولوں میں گائے جاتے ہوں مسلمان اپنے بچوں کو وہاں سے نکال لیں''۔ کیونکہ وندے ماترم کا قومی نغمہ انتہائی تنگ نظر، متعصّبانہ، مشرکانہ اور کافرانہ خیالات سے عبارت ہے۔ ''نغمہ کا مرکزی خیال جس میں مادر وطن کی پرستش کی مختلف اسالیب میں

تبلیغ کی گئی ہے۔ اسلام کے عقیدۂ توحید سے یکسر متصادم ہے۔ اگر مادر وطن کی پرستش ہندوستانی قومیت ہے تو ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایسی کسی قوم پرستی کو قبول کرنا ممکن نہیں، پھر وندے ماترم جس اسلام دشمن ناول سے ماخوذ ہے اس سے معمولی سی واقفیت رکھنے والا مسلمان بھی یہ گوارہ نہیں کرسکتا کہ اس نغمہ کے کسی لفظ کو زبان سے ادا کرے''۔ (نورتوحید مارچ ۱۹۹۹ء، ص/۲۲)

''نورتوحید'' کا اسلوب عام طور پر متانت وشرافت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ البتہ بسا اوقات مناظرہ بازوں کے زیر اثر کچھ غیر سنجیدہ تحریریں بھی شائع ہوجاتی ہیں۔ فروری ۱۹۹۹ء کے شمارہ میں ''زمزم سے گنگا تک'' کے عنوان سے اسلم ملک کا مزاحیہ مضمون دراصل سید واڑہ غازی پور کے ایک عالم دین مولانا ابوبکر قاسمی کے مناظرانہ مقالات اور غیر شائستہ تحریروں کا مذاق اڑاتا ہے۔ انداز تحریر میں سطحیت اور سوقیانہ پن نمایاں ہے۔ یہ دراصل غیر سنجیدہ اور مبارزت طلب کتابوں کے جواب میں طنز ومزاح سے بھرپور ایک فکاہیہ تحریر ہے، مگر قرآن کے اسلوب دعوت "ادفع بالتی ھی أحسن" (فصلت:۳۴) کا تقاضہ بہرحال یہ نہیں ہے۔ اسی شمارہ میں حامد سراجی کا ایک قطعہ بھی اسی اسلوب کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ اسی شمارہ میں مولانا عبدالمعید سلفی نے ''غیر مقلدین کی ڈائری'' (اپریل ۱۹۹۸ء) میں اسی اسلوب کی ترجمانی کی ہے۔

اس رسالہ میں گاہے گاہے شعری تخلیقات بھی نظر آتی ہیں۔ مجیبؔ بستوی، حامد سراجیؔ، فضا ابن فیضیؔ، زاہد آزاد جھنڈانگری، رئیس الدین رئیسؔ، عبدالرحمٰن عاجزؔ، طالب مبارکپوری، وفا صدیقی، سالک بستوی، رؤف خیر، عتیق اثر ندوی، فاروق بانسپاری، عبدالرؤف حیرتؔ بستوی، شمیم طارق، خوشتر اصلاحی، نیاز سراجی، حماد انجم

ایڈوکیٹ، کوکب جمالی، ریاض خلجی، حفیظ بنارسی وغیرہ شعراء کی کاوشیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان میں بعض شعراء زیادہ معروف نہیں اور انکا کلام بھی شعری محاسن کے تقاضوں سے بسا اوقات عاری نظر آتا ہے۔ لیکن اس رسالہ نے ان کی شعری تخلیقات کو شائع کر کے ان کی ہمت افزائی کی۔ اور انہیں اس میدان میں آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کیا اور اس طرح زبان وادب کی آبیاری کی۔ بعض مزاحیہ نظمیں بھی اس رسالہ کی زینت بنیں۔ ان تمام شعری تخلیقات میں قرآن وسنت کے طے کردہ آداب وحدود کی پاسداری ہے اور مبالغہ آمیزی سے اجتناب بھی۔ ایک مزاحیہ نظم کے چند مصرعے اس طرح ہیں۔

''پیر پگاڑا'' زندہ باد — سید واڑہ زندہ باد
غازی بن کر پیٹ رہے ہیں — ڈھول نگاڑہ زندہ باد
''چار دھماکے'' کر کے پھر بھی — کچھ نہ بگاڑا، زندہ باد
جا کے ''خمار زہد'' تو پڑھ لو — خوب لتاڑا ، زندہ باد
فکر سلف کے متوالوں کو — کون پچھاڑا؟ زندہ باد

(نورتوحید جون ۱۹۹۸ء، ص/۱)

ڈومریا گنج (سدھارتھ نگر) سے مجلّہ ''الفرقان'' دینی، علمی وتحقیقی نوعیت کا رسالہ ہے۔ جو مرکز الدعوۃ الاسلامیہ کے ترجمان کے حیثیت سے پچھلے آٹھ سالوں سے علم وتحقیق کی خدمت میں مصروف ہے۔ ابتدا میں دو ماہی رسالہ کی حیثیت سے شائع ہونا شروع ہوا، مگر اس راہ کی عملی دشواریوں نے بالآخر اسے سہ ماہی بنایا۔ درمیان میں پھر اس کی اشاعت دو ماہی کرنے کی کوشش ہوئی مگر چند شماروں سے زیادہ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ پہلے اس کے مدیر مولانا عبدالمبین عبدالخالق ندوی تھے۔ اب مولانا نیاز احمد

عبدالحمید سلفی طیب پوری اس کی ادارت کے فرائض سنبھالے ہوئے ہیں۔ معاون مدیر کی حیثیت سے مولانا شبیر احمد سلفی کا نام طبع ہے۔ اور مجلس مشاورت میں ڈاکٹر عبدالباری خاں، مولانا عبدالرحمٰن لیثی، اور مولانا فخر الدین ندوی جیسے مشاہیر شامل ہیں۔ رسالہ کی نوک پلک درست کرنیکا کام مولانا عبدالمعبود سلفی انجام دیتے ہیں۔

الفرقان کا مستقل کالم "الکتاب و الحکمة" عام طور سے مولانا عبدالمعبود سلفی تحریر کرتے ہیں۔ اس میں قرآنی آیات اور احادیث رسول کی روشنی میں موضوعاتی گفتگو ہوتی ہے جو عام اردوداں طبقہ کی دینی رہنمائی کرتی دکھائی دیتی ہے اسی لئے اسلوب عام فہم اور راست ہوتا ہے۔ زبان صاف ستھری اور واضح وصریح ہوتی ہے۔ دوسرے اسلامی ماخذ کی طرف زیادہ رجوع نہیں ہوتا۔ بس قرآن وحدیث کا حوالہ ہوتا ہے۔ جس سے مدعا بالکل واضح ہوجاتا ہے۔

اس رسالہ میں زیادہ تر تعلیم وتربیت کے مسائل زیر بحث آتے ہیں۔ مدارس کے نظام کا محاسبہ کیا جاتا ہے۔ جدید علوم کی تحصیل کی رغبت بھی دلائی جاتی ہے۔ چونکہ جامعہ خیر العلوم کے ناظم خود جدید وقدیم علوم کے امتزاج کے وکیل اور ترجمان ہیں اس لئے ان کی فکر کا انعکاس الفرقان کے صفحات میں نمایاں ہے۔ فاضل مدیر مدرسوں کی زبوں حالی کا ذمہ دار منتظمہ، تربیتی عملہ اور طلبہ سبھی کو قرار دیتے ہیں۔ اس میں بھی زیادہ قصور مجلس انتظامیہ اور مربی حضرات کا پاتے ہیں۔ انہیں سخت افسوس ہے کہ "مدرسے پرسکون ماحول میں چل رہے ہیں اور قوم کو خام مال سپلائی کیا جارہا ہے"۔ (الفرقان اکتوبر، دسمبر ۲۰۰۴ء، ص ۱۱)

وہ اس تجویز کے مسلسل داعی رہے ہیں کہ مدارس میں جونیر ہائی اسکول کا مکمل

سرکاری نصاب علوم اسلامیہ کے ساتھ داخل کیا جائے تا کہ جدید علوم کا رجحان رکھنے والے طلبہ خارج سے ہائی اسکول کا امتحان دیکر کالجوں کا رخ کریں اور دینی تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم کی ضروری جدید علوم میں مطلوبہ استعداد بھی نظر انداز نہ ہو۔ عصری علوم کی یہ وکالت احساس کمتری یا مرعوبیت کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ عصری ضروریات اور تقاضے اس کی دعوت دے رہے ہیں۔ (الفرقان اپریل۔جون ۲۰۰۱ء، ص۳۔۷) فاضل مدیر ہمہ جہتی تربیت کے قائل اور تعلیم کے جامع نصب العین کے ہم نوا ہیں۔ وہ یونانی مفکر افلاطون کے حوالہ سے نظام تعلیم سے ایسے افراد پیدا کرنا چاہتے ہیں جو:

☆ دوسروں کے ساتھ رہنے اور مل جل کر کام کرنے کے قابل ہوں۔

☆ اعتدال، ہمت اور عسکری صلاحیت کے مالک ہوں۔

☆ خواہشات اور جذبات کو عقل کا تابع بنا سکیں۔

☆ سچائی، حسن اور خیر سے محبت کر سکیں اور

☆ متوازن زندگی بسر کر سکیں۔ (الفرقان اپریل۔جون ۲۰۰۰ء، ص۱۱)

تعلیم و تربیت کے ضمن میں الفرقان کے بعض دوسرے مضامین بھی اہم ہیں جیسے

☆ دینی تعلیمی محاذ کی اہمیت اور تقاضے۔ (الفرقان جنوری۔مارچ ۲۰۰۲ء)

☆ اسلامی مدارس کے ماضی و حال پر ایک نظر۔ (جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء، دوسری قسط اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۰ء)

☆ حکومت کی موجودہ تعلیمی پالیسی مدارس اسلامیہ کے لئے سنگین خطرہ۔ (مئی۔جون ۱۹۹۸ء)

☆ عربی مدارس اور موجودہ نصاب تعلیم۔(جولائی۔اگست ۱۹۹۸ء)

☆ دینی مدارس اور سماجی علوم۔(جولائی ستمبر ۲۰۰۱ء)

الفرقان نے کم وقت میں علمی معیار قائم کیا ہے۔اعلیٰ معیاری مضامین اکثر اس رسالہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔دھیرے دھیرے معتبر و مستند محققین اور اہل علم اس سے وابستہ ہوتے جارہے ہیں۔مولانا سلطان احمد اصلاحی نے اپنے مضمون ''برتھ ڈے کی حرمت''۔(جنوری۔مارچ ۲۰۰۱ء) میں قرآن وسنت کے حوالہ سے تحقیق کی ہے کہ یوم ولادت منانا اپنی اصل کے اعتبار سے ناجائز اور حرام ہے پھر اس میں کچھ اور حرام چیزوں کی آمیزش اسے ظلمات بعضها فوق بعض (النور:۴۰) کا درجہ دیدیتی ہے۔یہ قبیح رسم تشبہ کی زمرہ میں آتی ہے۔اس میں بے پناہ اسراف ہوتا ہے اور بے جا نمود و نمائش ہوتی ہے پھر اس پر مستزاد نوید کی رسم ہے جو اس کی حرمت کو بڑھا دیتی ہے۔

ڈاکٹر اقبال احمد بسکوہری اپنے مضمون ''صحیحین کا مقام اور اسکے اسباب'' میں امام بخاری کی "الجامع الصحيح" اور امام مسلم کی "المسند الصحيح" کو مدلل انداز میں صحیحین قرار دیتے ہیں۔جن کی جملہ احادیث متصل السند ہیں اور انکی صحت پر علمائے امت کا اجماع ہے۔وہ مخالفین کے اعتراضات کا کافی وشافی جواب دیتے ہیں۔(الفرقان اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۴ء، ص/۱۸۔۲۶) مولانا کفایت اللہ مدنی چار قسطوں پر مشتمل اپنے مضمون ''شروح مشکوۃ پر فقہی مذاہب کے اثرات'' میں ملا علی قاری کی مایہ ناز تصنیف ''**مرقاة المفاتيح**'' اور شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی مبارکپوری کی معرکہ آرا کتاب ''**مرعاة المصابيح**'' کا موازنہ کرتے ہیں۔

مشکوۃ المصابیح کی ان دونوں شرحوں میں جو فقہی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں ان کا مضمون نگار نے علمی محاکمہ کیا ہے۔ ان کا نتیجہ فکر یہ ہے کہ صاحب مرعاۃ کے یہاں فکری آزادی، حق گوئی و بے باکی کا عنصر ہے۔ ان کے قلم میں روانی اور افکار میں بلندی ہے۔ اور فقہائے کرام کے اقوال اور دلائل و براہین پر ان کے تبصرے غیر جانبدارانہ اور مبنی برحق ہیں۔ (الفرقان اپریل۔جون ۲۰۰۱ء، ص/۱۳)

پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی نے (الفرقان اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۳ء ص/۷۔۱۸) اپنی تحقیق انیق میں ثابت کیا ہے کہ عبدالمطلب ہاشمی کا اصل نام عامر بن ہاشم تھا حالانکہ مصادر کا عام اتفاق ہیکہ اصل نام شیبہ تھا۔ فاضل محقق نے مشہور نام کی مختلف توجیہات بھی بیان کی ہیں۔ انہوں نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ علمائے مقتدمین میں سب سے پہلے ابن قتیبہ دینوری نے اس نام کی صراحت کی ہے اور جدید سیرت نگاروں میں قاضی محمد سلیمان منصور پوری نے وضاحت سے ان کے نام ولقب کو بیان کیا ہے۔

پروفیسر عبدالعلی اپنے مضمون (الفرقان اپریل۔جون ۲۰۰۲ء، ص/۲۲۔۲۹) میں امراض چشم کے میدان میں مسلم طبیبوں کی خدمات سے بحث کرتے ہیں اور علی بن عیسی (۹۲۴۔۱۰۱۰ء)، عمار بن علی الموصلی (م ۱۰۱۰ء)، ابن الہیثم (۹۶۵۔۱۰۶۸ء)، خلیفہ ابن ابی المحاسن (۱۲۵۶ء کے آس پاس اسے عروج حاصل ہوا)، ابن النفیس (۱۲۱۰۔۱۲۸۸ء)، ابن الاکفانی (۱۲۱۰۔۱۲۸۸ء)، زکریا الرازی (۸۵۰۔۹۳۲ء)، ابن سعید التمیمی (م ۱۰۰۰ء)، ابن اسلم الغافقی (م ۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء)، ابن الناقد (م ۱۱۸۸ء) اور فتح الدین احمد اور صلاح الدین بن یوسف کی طبی تحقیقات و تصانیف کو متعارف کراتے ہیں۔

شیخ غازی عزیز اپنے مضمون (الفرقان جنوری ۔ مارچ ۲۰۰۱ء، ص ۱۰/ ۲۹) میں فضائل قربانی سے متعلق مشہور نو حدیثوں کا علمی جائزہ پیش کرتے ہیں۔ انکی تحقیق کے مطابق قربانی کی تاکید، اہمیت اور شرعی حیثیت اپنی جگہ مسلم ہے مگر اس کی فضیلت میں وارد کوئی ایک حدیث بھی صحت کے درجہ کو نہیں پہونچتی، کچھ روایات بہت زیادہ ضعیف ہیں، کچھ منکر ہیں اور کچھ بے اصل اور بعض موضوع ہیں۔ اس باب کی بہتر سے بہتر روایت ضعیف راویوں سے خالی نہیں۔ اسی وجہ سے جامع ترمذی کے مشہور شارح علامہ ابن العربیؒ کہنا پڑا کہ قربانی کی فضیلت میں کوئی صحیح حدیث وارد نہیں۔ مثال کے طور پر مشہور حدیث ہے۔

ماعمل آدمی من عمل یوم النحر، احب الی الله من اهراق الدم انه لیاتی یوم القیامة بقرونها واشعارها واظلافها وان الدم لیقع من الله بمکان قبل ان یقع من الارض فطیبوا بها نفساً

(قربانی کے دن کسی آدمی کا کوئی عمل اللہ کو خون بہانے سے زیادہ پیارا نہیں۔ یادرکھو قیامت کے دن قربانی کا جانور اپنے سینگوں، بالوں اور کھروں سمیت آئے گا اور خون زمین پر گرنے سے قبل اللہ کے یہاں قبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ لہذا قربانی خوشی خوشی کیا کرو)

اس حدیث کی روایت امام ترمذی نے اپنی جامع میں، امام ابن ماجہ نے اپنی السنن میں، امام حاکم نے مستدرک میں، امام بغوی نے شرح السنہ میں کی ہے۔ فاضل مضمون نگار نے جرح وتعدیل کے ذریعہ اس روایت کی کمزوری واضح کی ہے۔ اور

علامہ ناصر الدین البانی کی سلسلة الاحادیث الضعیفہ و الموضوعة سے اس روایت کے ضعیف ہونیکا حکم نقل کیا ہے۔ اوراس بات پر حیرت ظاہر کی ہے کہ مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی ولی حسن ٹونکی، مولانا طارق محمود مدنی، مولانا سعید احمد جلال پوری، پروفیسر عبدالمجید، مولانا عبدالرشید، مولانا منظور احمد نعمانی اور مولانا عبدالروٴف ظفر نے کس طرح اس سے استدلال کیا ہے۔ (ص ۱۴)

الفرقان کی ایک خصوصیت خاتون قلم کاروں کا تعاون حاصل کرنا ہے۔ عام طور پر مرکز الدعوة الاسلامیة سے وابستہ کلیة الطیبات کی معلمات و طالبات اس فہرست میں شامل ہیں۔ تاہم باہر کی خواتین کی نگارشات بھی رسالہ کی زینت بنتی رہی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسالہ نے اہل قلم خواتین کی کھیپ تیار کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ ذیل کے چند مضامین کی فہرست دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

انجم زہراوی: (۱) احکام ومسائل (عبداللہ بن منیع کی عربی تحریر کا ترجمہ) الفرقان جولائی۔ستمبر ۲۰۰۰ء

(۲) اسقاط حمل کا شرعی حکم (سماحة الشیخ ابن باز کی تحریر کا ترجمہ) الفرقان جولائی ستمبر ۲۰۰۱ء

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہر جگہ حاضر نہ عالم الغیب (سماحة الشیخ ابن باز کی تحریر کا ترجمہ) الفرقان اپریل۔جون ۲۰۰۱ء

فرزانہ رفعت اللہ: (۱) حج کے تعلق سے چند مسائل، الفرقان جنوری۔مارچ ۲۰۰۱ء

(۲) دنیا کی سب سے مہنگے مہر والی عورت، الفرقان جولائی۔ستمبر ۲۰۰۱ء

مہ جبین طیباتی: بچے کی نصیحت نے بڑے کی زندگی بدل دی، الفرقان جولائی ستمبر ۲۰۰۴ء

ثریا محبوب: عورتیں رمضان میں اپنے اوقات کیسے گذاریں، الفرقان جولائی۔ ستمبر ۲۰۰۴ء

شہناز عبدالکریم: مریض کیسے طہارت حاصل کرے، الفرقان اپریل۔جون ۲۰۰۲ء

انجم آرا فلاحی: اعجاز قرآن اور اسکے ادبی مظاہر۔ پہلی قسط الفرقان مئی۔ جون ۱۹۹۸ء، دوسری قسط جولائی۔اگست ۱۹۹۸ء

رضیہ قطب الدین: روزہ کے احکام ومسائل (ابوعبداللہ مصطفیٰ کی تحریروں کا ترجمہ) الفرقان اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۰ء

رضیہ سنبل: جلتا ہوا سماج الفرقان اپریل۔جون ۲۰۰۰ء

کبھی کبھی بعض نظمیں اور غزلیں بھی الفرقان میں شائع ہوئی ہیں۔ تابش سدھارتھ نگری، مضمر گونڈوی، سالک بستوی، ابوعفاف کیفی، مطیع اللہ مدنی، عزیز الدین سلفی، ابوفوزان مدنی، قمر رام نگری اور طیب الحسن عرشی وغیرہ شعراء اس رسالہ سے تعاون کرتے رہے ہیں۔

تبصرۂ کتب کے کالم میں بسا اوقات مدح وتوصیف کا پہلو غالب رہا جیسے ''دیار غیر میں'' سفر نامہ عبدالسلام رحمانی۔ ''خزانۂ معلومات''، ''سفر ناموں کے باب میں ایک حسین اضافہ'' قرار دیا گیا اور اس کتاب کے مؤلف وناشر دعائے خیر کے مستحق ٹھہرائے گئے۔ اور فاضل مصنف کو کرنل محمد خان کے ہم پلہ بتایا گیا۔ (الفرقان اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۰ء، ص/۶۱) اس کے برعکس ''عربوں کے علمی کارنامے'' پر تبصرہ کرتے ہوئے زبان وادب کی بعض غلطیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اور بعض

عربی الفاظ و اصطلاحات کی اردو تعبیر پر نظر ثانی کرنے کی درخواست کی گئی ہے اور کتاب کو کسی خلاصۂ بحث سے خالی قرار دیا گیا ہے۔(الفرقان اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۴ء، ص/۶۴)''مصر میں آزادیٔ نسواں کی تحریکات'' مؤلفہ ڈاکٹر سطوت ریحانہ پر تبصرہ معروضی نظر آتا ہے ایک طرف مبصر نے کتاب کو جگر کاری اور عرق ریزی کا نتیجہ قرار دیا ہے اور پوری بحث کو مصنفہ کی سطوت علمی کی غماز مانا ہے تو دوسری طرف قرآنی آیات و احادیث کو نقل کرنے میں مہارت اور دقت و بصیرت سے کام لینے کا مشورہ دیا گیا ہے، اس تبصرہ میں بعض اردو تعبیرات کو بھی محل نظر قرار دیا گیا ہے، یہاں تک کہ لفظ اسفل کے اردو میں استعمال پر بھی اشکال قائم کیا ہے۔(الفرقان اپریل۔جون ۲۰۰۱ء، ص/۵۷۔۵۹)فاضل مبصر کا یہ اشکال کہاں تک درست ہے؟ اس پر بحث ہو سکتی ہے، مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ الفرقان کے صفحات میں اس طرح کے نامانوس عربی الفاظ و اصطلاحات کا استعمال کافی ہے۔کبھی کبھی تو اردو داں طبقہ اس لفظ کا کوئی مفہوم نکالنے سے قاصر نظر آنے لگتا ہے۔جیسے

☆ نظریۂ تدریس (اپریل۔جون ۲۰۰۲ء، ص/۳)

☆ تمہید // //

☆ تطویر // ص/۴

☆ وثینت // ص/۸

☆ وسائل اعلام اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۰ء، ص/۵

☆ مصادر تلقی // ص/۴۶

☆ احتکاک جنوری۔مارچ ۲۰۰۲ء، ص/۶۷

☆ مغسول الدماغوں // ص/۱۴

☆ ماختزال // //

☆ مجلّہ حائطیہ // ص/۳۰

جنوری۔فروری ۲۰۰۴ء سے ڈومریاگنج ضلع سدھارتھ نگر کی ہی سرزمین سے شائع ہونیوالا علمی، دینی اور اصلاحی مجلّہ دوماہی ''الصفادر'' اصل ۱۹۹۲ء میں قائم کردہ صفا ایجوکیشنل اینڈ ٹیکنکل سینٹر کا بنیادی طور سے ترجمان ہے، مگر نشر واشاعت اور توسیع و تقسیم کی جدید سہولیات سے فائدہ اٹھانے کی خاطر نئی دہلی سے اسکی طباعت عمل آرہی ہے۔ جب کہ مدیر علی گڑھ سے اس کی ترتیب و ادارت کا کام دیکھتے ہیں۔ مجلّہ نے قرآنی آیت "ان الصفا و المروۃ من شعائر اللہ" (البقرہ/۱۵۸) کو اپنا طغری قرار دیا ہے۔ اس کے سرپرست مولانا عبدالواحد مدنی اور مدیر مولانا رفیق احمد رئیس سلفی ہیں۔ صفا شریعت کالج کی علمی و تدریسی سرگرمیاں بھی اس میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اب تک رسالہ کی ایک جلد مکمل ہوچکی ہے۔ اس کے مضامین و مقالات اور تبصروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زبان و ادب، تحقیق و تصنیف اور انداز و اسلوب معیاری، مثبت و معتدل اور اصلاحی و تعمیری ہے۔ ادارتی تحریروں میں بطور خاص سلاست و روانی پائی جاتی ہے۔ زبان عام فہم آسان اور سادہ ہے۔ عربی و فارسی کی بوجھل عبارتیں اور نامانوس ترکیبیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ اسلوب دلآویز اور دلکش ہے۔ انداز فکر اصلاحی و تعمیری ہے۔ اگر کہیں تنقید ہے بھی تو دلشکنی اور دل آزاری سے مبرا ہے۔ ذاتی و جماعتی اور گروہی و مسلکی تعصب کی چھاپ سے پاک ہے۔ خاص

بات یہ ہے کہ اصلاح کا آغاز گھر کے اندر سے کیا گیا ہے۔ اہل حدیث اداروں، شخصیات اور علماء کو زیادہ خطاب کیا گیا ہے کہ "قوا انفسکم و أھلیکم نارا" (التحریم: ٦) کا عمومی منشا بھی یہی ہے۔ جولائی۔اگست ۲۰۰۴ء کے شمارہ میں خدمت حدیث کے متعدد اہم پہلوؤں پر توجہ دلائی گئی ہے:

۱۔ مدارس میں جاری حدیث کے نصاب اور اسکے طریقہ تدریس پر نظر ثانی کی جائے۔اس کے لئے تمام سلفی مدارس اجتماعی شکل میں منصوبہ بنائیں۔

۲۔ تشریح و تفہیم حدیث کا زیادہ تر کام اردو زبان میں ہوا ہے۔ضرورت ہے کہ ہندی اور علاقائی زبانوں میں حدیث کے ذخیرہ کو منتقل کیا جائے۔

۳۔ مدارس میں تخصص فی الحدیث کا مضبوط مرکز قائم ہو اور اساتذہ وطلبہ کی تربیت کا مؤثر نظام فراہم ہو۔

۴۔ جدید جامعات اور دانشگاہوں میں حدیث کے مختلف موضوعات پر توسیعی محاضرات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

۵۔ حفظ متون حدیث کا ایک نصاب بنایا جائے اور عربی درجات میں اسے اس طرح نافذ کیا جائے کہ اسلام کے بنیادی عقائد و احکام سے متعلق احادیث کا معتد بہ ذخیرہ طلبہ کو یاد ہو جائے۔

٦۔ متون حدیث کے حافظہ کے بین المدارس مقابلوں کا اہتمام بھی کیا جاسکتا ہے۔

۷۔ سلفی مدارس کے مستند وجید علمائے کرام کے دروس حدیث کی فیتہ بندی کرائی

جائے تاکہ ان کے حاصل مطالعہ سے دوسرے بھی مستفید ہو سکیں۔

۸۔ حدیث کے موضوع پر سمیناروں کا اہتمام کیا جائے، جن میں سلفی علماء کے علاوہ دوسرے مکاتب فکر کے علماء کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے، تاکہ باہم تبادلۂ خیال اور افہام وتفہیم کے مواقع ہاتھ آتے رہیں اور علم کا قافلہ آگے بڑھے۔ (ص ر۳۔۱۲)

۱۴، ۱۵؍ مارچ ۲۰۰۴ء کو پاکوڑ (جھارکھنڈ) میں مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کی کانفرنس منعقد ہونے کا اعلان کیا گیا۔ تو صوبائی جمعیۃ اہل حدیث مغربی یوپی کے نائب ناظم کی حیثیت میں مدیر نے سلفیان ہند کو خطاب کرتے ہوئے مارچ۔ اپریل ۲۰۰۴ء کے الصفا میں اداریہ تحریر کیا۔ انہوں نے مولانا نذیر احمد املویؒ اور مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوریؒ کی سرپرستی مین ۱۹۶۱ء میں نوگڑھ (اترپردیش) میں منعقد اہل حدیث کانفرنس کی یاد تازہ کرائی، اور موجودہ کانفرنس کے دوررس اثرات ونتائج کی امید ظاہر کی۔ انہیں یہ بات بڑی عجیب سی لگی کہ

”جس دیار میں علمائے صادق پور کے اخلاف ذی وقار، ڈاکٹر سید عبدالحفیظؒ کا مستحکم علمی خانوادہ، ڈاکٹر محمد لقمان سلفی اور مولانا عبدالمتین سلفی کے عظیم تعلیمی ورفاہی ادارے اور مولانا عین الباری عالیاوی اور ان کی کابینہ کے سلسلہ ہائے دعوت وتدریس موجود ہوں وہاں یہ بتایا جائے کہ دینی پہلو سے اصلاح سماج کی کیا اہمیت ہے۔ اور اصلاح سماج کا کیا طریقہ کار ہو سکتا

ہے''۔انہوں نے پاکوڑ کانفرنس سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ''وہ ان معتبر و مستند شخصیات اور اداروں کو مشترکہ مقاصد کے لئے جد وجہد پر آمادہ کرے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کر کے تعمیر سماج میں اپنا منصبی کردار ادا کرے''۔(حوالہ بالا،ص ۹)

مدیر کی یہ تحریر تو نئی نسل کی بھرپور ترجمانی ہے اور وقت کی پکار بھی۔کاش مرکزی جمعیت کے ارباب کار اور علمائے اہل حدیث اس پر توجہ دیں اور اقدام کی منصوبہ بندی کریں:

''فروعی مسائل اور تقلیدی مسالک سے نوک جھونک کے موضوعات پر ہمارے پاس اب بڑا ذخیرہ موجود ہے کہ آئندہ کئی سالوں تک ان موضوعات پر لکھنے لکھانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ہمارے مخلص اور فاضل مصنفین کو نئے اور مثبت موضوعات پر طبع آزمائی کرنی چاہئے۔سائنسی مزاج کی حامل آج کی نسل دلیل و برہان کی زبان زیادہ سمجھتی ہے۔مثبت اور معروضی انداز کا لٹریچر آج اسلام کی پہلی ترجیح ہے۔مسائل حیات اور دینی زندگی کی وہ تصویر سب سے زیادہ جاذب نظر ہوتی ہے۔جسمیں رنگ نصوص کتاب وسنت سے بھرا گیا ہو۔تقلید اور آباء پرستی کے سلسلۂ نا مسعود اور ظلمات شرک وبدعت سے پریشان ہوکر اپنے منہج مستقیم سے ہٹنے کی چنداں ضرورت نہیں۔قریہ قریہ بستی بستی کتاب وسنت کی قندیلیں روشن کر دیجئے

یہ تمام تاریکیاں گلیوں ہی سے نہیں شاہ راہوں سے بھی غائب ہو جائیں گی''۔(حوالہ بالا،ص ۱۰)

کیا برجستگی ہے کتنی روانی ہے اس تحریر میں! فکر کی سلامتی اور سوچ کی پائیداری کی کتنی واضح مثال ہے یہ! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے کے جذبہ کی تپش اور قلب کا گداز قاری کے اندر اترتا جارہا ہے۔ مدتوں سے خواہش تھی، آرزو تھی کہ کوئی بندۂ خدا یہ اذان دے۔ اب اذان کی آواز آگئی ہے تو صف بندی اور امامت کے لئے کون تیار ہے؟ کاش دوسرے مکاتب فکر کے صالح اور تعمیری ذہن بھی بیانگ دہل نہ سہی، دھیمی آواز میں مگر وقار اور متانت کے ساتھ یہ آواز لگائیں أليس منكم رجل رشيد؟

مدیر نے پاکوڑ کانفرنس سے یہ امید بھی ظاہر کی کہ وہ

''بین المسلمین پائے جانے والے اختلافات کو دور کرنے کے لئے کوئی مناسب حکمت عملی وضع کرے گی۔ تحفظ سنت جیسی نام نہاد کانفرنسوں کا ردعمل کوئی صحت مند علامت نہیں ہے۔ راہ حق کے مسافر جھاڑ جھنکاڑ میں الجھ کر رہ گئے تو منزل مقصود اپنے تمام نشانات کے ساتھ معدوم ہو جائے گی۔ اپنی اور اپنے حلقہ مریدین کی ذاتی ترجیحات کو مرکزی تنظیم کی ترجیحات بنادینا ایک نامناسب اور منفی قدم ہے۔ مسلکی اختلافات کا اپنا ایک دائرہ ہے۔ اسی میں رہتے ہوئے افہام وتفہیم کا سلفی منہج اپنایا جائے۔ شخصیتوں کا احترام ہر حال میں لازم

اور مطلوب ہے"۔(حوالہ،ص ۱۱)

اہل حدیث اداروں، شخصیات اور جامعات میں پائی جانے والی رسہ کشی اور منافرات پر تشویش صالح الفطرت علماء اور دانشوروں کو کس قدر ہے، اس کی ایک جھلک اسی ادارتی تحریر میں دیکھی جاسکتی ہے۔مدیر نے احتیاط و آداب کے تمام تقاضوں کی بھرپور رعایت رکھی ہے۔مگر اپنی خلش کا اظہار بھی بڑے سلیقہ سے کردیا ہے:

"ذات برادری اور علاقائیت کی بنیاد پر تعاون اور عدم تعاون کے مکروہ سلسلے نے حسد و رقابت کی وہ آگ بھڑکائی ہے جس میں خلوص وللہیت جل کر راکھ ہوگئی ہے۔اداروں اور افراد کے درمیان رسہ کشی کا بھیانک روپ بھی ہم نے دیکھا ہے۔تنافس اور تباغض کی مسموم ہوائیں ہماری جدو جہد و مساعی کو منفی رخ دے رہی ہیں۔ذاتی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر اداروں اور شخصیات کی دینی، دعوتی، تعلیمی اور رفاہی خدمات کو تولا جارہا ہے۔ہندوستان کے دیگر مقامات کی طرح اس دیار میں بھی دینی اور علمی ادارے انتظامیہ میں اختلاف کے سبب برباد ہورہے ہیں"۔(ص ۱۲)

انہوں نے مرکزی جمعیت کو مشورہ دیا کہ سورہ حجرات کی آیت فأصلحوا بين اخويكم (۱۰) پر عمل کرے۔تمام تنازعات مین مداخلت کو اپنا فریضہ سمجھے۔وہ کسی

ایسے معاملہ میں غیر جانب دار نہ رہے جس کا تعلق مفاد عامہ سے ہو اور عدل وانصاف کا رویہ اختیار کرتے ہوئے ان تمام اداروں کو اجتماعیت کا سبق سیکھنے پر آمادہ کرے۔

نومبر۔دسمبر۲۰۰۴ء کے شمارہ کی ادارتی تحریر قرآن کریم کے تئیں اپنے طرز فکر وعمل کا احتساب کرنے کی دعوت دیتی ہے۔وہ ان دیندار حضرات سے سوال کرتے ہیں جو مسلمان کو قرآن کریم کی جگہ حکایات وفضائل کی طرف واپس لا رہے ہیں اور رجوع الی القرآن کو ان علماء تک محدود رکھنا چاہتے ہیں جو اٹھارہ علوم کے ماہر ہوں کہ اللہ نے تو قرآن کو نصیحت وہدایت کے لئے بہت آسان بنایا ہے اور آپ اسے بہت مشکل قرار دے رہے ہیں؟اور یہ کہ قرآن وحدیث باہم مل کر اسلام کی جو تصویر بناتے ہیں کیا محض فضائل سے وہ تصویر بن سکتی ہے؟مدیر ان علماء کو بھی خطاب کرتے ہیں جنھوں نے مقصد نزول کو بالائے طاق رکھ کر قرآن کو جھاڑ پھونک اور جادو منتر کی کتاب بنا دیا ہے۔وہ اس طبقۂ دانشوراں سے بھی گفتگو کرتے ہیں جو خود کو اہل قرآن کہتے ہیں اور قرآن کو حدیث سے بے نیاز قرار دیتے ہیں۔

الصفا کو ارباب علم وتحقیق کا تعاون حاصل ہے۔پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی کے اعلی درجہ کے تحقیقی مقالات اس میں برابر شائع ہو رہے ہیں۔ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کا مضمون''روایات سیرت کا تنقیدی مطالعہ'' پہلی جلد کے چوتھے شمارہ (جولائی۔اگست۲۰۰۴ء) سے قسط وار شائع ہو رہا ہے۔مضمون نگار نے شامی عالم ڈاکٹر محمد سعید رمضان البوطی کی کتاب "فقه السيرة" کا اردو میں ترجمہ کیا جو مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی سے زیر طبع ہے۔انھوں نے محدث عصر علامہ ناصر الدین

البانی (۱۹۱۴۔۱۹۹۹ء) کی اس کتاب کی تخریج احادیث کا بھی مطالعہ کیا جو مجلّہ التمدن الاسلامی دمشق میں جلد۴۲رشمارہ ۲رتک مسلسل استدراک کی صورت میں طبع ہوئی بعد میں "دفاع عن الحديث النبوی والسيرةفی الردعلی جهالات الدكتور البوطی فی كتابه فقه السيرة" کے نام سے کتابی صورت میں بھی شائع ہوئی۔ فاضل مضمون نگار نے علامہ البانی کے استدراکات کا تلخیص کے ساتھ ترجمہ کیا البتہ مضمون شائع کراتے ہوئے انہوں نے فقه السيرة کی ترتیب پیش نظر رکھی۔ یہ سلسلۂ مضامین فقہ السیر ہ کے قارئین ہی کے لئے نہیں بلکہ سیرت نبوی سے عام دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بھی مفید ہے۔اس رسالہ میں مولانا محمد ذاکر محمد عباس سلفی کے مضامین بھی علمی اور معیاری ہیں جیسے ''ایام فتن میں مسلمانوں کا موقف'' (جولائی۔اگست۲۰۰۴ء)، ''ذبیحہ پر اعتراضات کا علمی جائزہ'' (نومبر۔دسمبر۲۰۰۴ء)۔

تبصرۂ کتب کے کالم میں کہیں محض تعارف پر اکتفا کیا گیا ہے۔اور انداز تحریر بیانیہ ہے جیسے شیخ عزیز کی کتاب ''جادو کی حقیقت''، ڈاکٹر اقبال احمد بسکوہری کی کتاب ''جرح وتعدیل''، ڈاکٹر عبدالقیوم محمد شفیع بستوی کی تصنیف ''مومن کے روز وشب'' پر تبصرے (شمارہ جنوری۔فروری۲۰۰۴ء) ان تخلیقات کا بھرپور تعارف کراتے ہیں۔کہیں اس تبصرہ میں مدح سرائی کا عنصر حاوی ہے جیسے شیخ عبدالقدوس محمد نذیر السّلفی کی عربی تصنیف "احاديث الجمعه:دراسة نقدية وفقهية" پر تبصرہ (جولائی ۔اگست۲۰۰۴ء کا شمارہ) اسے ''اول درجہ کا تحقیقی و تصنیفی اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے بنیادی کام'' (ص۶۴) قرار دیتا ہے۔اسے ''تمام پہلوؤں سے مکمل'' تخلیق شمار کرتا

ہے۔اور مبصر مطالعہ کے بعد اسے ''اپنی نوعیت کی منفرد کتاب'' تصور کرتا ہے (ص ۵۸) اسی طرح ڈاکٹر وصی اللہ بن محمد عباس کی تصنیف عربی "المسجد الحرام: تاریخه واحکامه" پر تبصرہ (شمارہ نومبر۔دسمبر۲۰۰۴ء) کرتے ہوئے مصنف کی اس خصوصیت پر بطور خاص روشنی ڈالی گئی ہے کہ انہوں نے ''پوری ذمہ داری، اپنی علمی وتحقیقی بصیرت اور مکمل شرح صدر کے ساتھ تاریخی واقعات اور روایات کو بھی محدثین کے وضع کردہ اصول جرح وتعدیل پر جانچا ہے۔اور جو روایات اس میزان پر کھری اترتی ہیں انھیں اپنی کتاب میں جگہ دی ہے'' (ص ۶۴)

تبصرہ میں کہیں معروضی نقطۂ نظر کی بھی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔مصنف کی علمی وتصنیفی خصوصیات اور کتاب کی ادبی وتحقیقی قیمت پر روشنی ڈالتے ہوئے نقائص کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔جیسے مولانا محمد مستقیم سلفی کی کتاب ''جماعت اہل حدیث کی تصنیفی خدمات'' پر پہلے تو پاکستان کے نامور محقق محمد اسحٰق بھٹی کے خط کو نقل کرکے تنقید کی گئی ہے۔(شمارہ ستمبر۔اکتوبر۲۰۰۴ء، ص ۵۸۔۶۰) پھر مبصر نے اپنے مطالعہ کی روشنی میں بعض اہم ملاحظات پیش کئے ہیں اور کچھ بنیادی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔پاکستان کے نامور عالم اور مقرر علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ کی خدمات کا تذکرہ اس ضخیم تصنیف میں نہیں ہے۔خود ہندوستان کے ان معروف اہل حدیث علماء اور دانشوروں کو شریک تحقیق وتصنیف نہیں سمجھا گیا جو دوسری جماعتوں اور تحریکوں سے وابستہ یا ان سے متاثر ہیں۔

دوماہی الصفا پہلے ماہنامہ تھا اور مراسلت اور ادارتی امور کے تمام معاملات

ڈومریا گنج ہی سے انجام پاتے تھے۔ البتہ اسکی طباعت دہلی میں ہوتی تھی۔ اسکے نگراں مولانا عبدالواحد مدنی ہی تھے البتہ مدیر مولانا ابوالعاص وحیدی تھے۔ اور مجلس ادارت میں فضل الرحمان مدنی، محمد مصطفیٰ مدنی اور محمد عامر سلفی کے نام شامل تھے۔ اس کا پہلا شمارہ ستمبر ۱۹۹۹ء میں شائع ہوا۔ نامعلوم اسباب کی بناپر پانچ اشاعتوں کے بعد ہی یہ بند ہوگیا۔ پھر کئی سال کے وقفہ کے بعد موجودہ شکل میں مولانا رفیق احمد رئیس سلفی کی ادارت میں دوبارہ اسکی اشاعت عمل میں آئی۔ ماہنامہ الصفا کی اشاعتوں کا رنگ وآہنگ اوراسلوب وانداز بھی تقریباً وہی تھا جو موجودہ دوماہی الصفا کا ہے۔ پہلی جلد کے چوتھے پانچویں مشترکہ شمارہ (دسمبر ۱۹۹۹ء، جنوری ۲۰۰۰ء) میں مثال کے طور پر جو مقالات شامل ہیں وہ مثبت اور تعمیری واصلاحی ہیں البتہ تحقیق کا عنصر ان میں کم نظر آتا ہے۔

ہندونیپال کے ان سرحدی اضلاع سے شائع ہونے والے اردو رسائل وجرائد کی تعداد بہت ہے۔ بدقسمتی سے متعدد رسائل کی فائلیں دسترس میں نہیں ہیں اس لئے ان کا تجزیہ کرنا اس وقت ممکن نہیں ہے۔

۱۹۸۶ء میں محترم حمید اللہ سلفی نے پرساعماد بستی سے ماہنامہ ''انوار'' جاری کیا جوایک دینی واصلاحی رسالہ تھا۔ ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۸ء میں مولانا ابوالعاص وحیدی کی ادارت میں دوماہی ''اعتدال'' شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ دینی واصلاحی رسالہ جمعیت اہل حدیث بستی کا ترجمان تھا۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۹۰ء کا شمارہ شائع ہونے کے بعد یہ بھی موقوف ہوگیا۔ لوہرسن بازار بستی سے مولانا حامد الانصاری انجم نے چھٹی دہائی کے

ماہنامہ ''الہلال'' کا آغاز کیا جس کا مزاج دینی واصلاحی تھا۔مولانا ابوالعاص وحیدی ہی کی ادارت میں اگست۔اکتوبر ۱۹۸۹ء میں تلسی پور گونڈہ سے سہ ماہی الہلال کا پہلا شمارہ شائع ہوا جس کی نوعیت دینی وادبی تھی۔اس سہ ماہی کی ایک غایت مسلمانوں کو جہاد اور مضبوط ملی اتحاد کیلئے آمادہ کرنا تھی۔دوتین شماروں سے زیادہ یہ بھی سفر طے نہ کرسکا۔(دیکھئے یادگار مجلّہ اہل حدیث،حوالہ بالا،ص ۱۸۳)

بھیکم پور بلرام پور کے دار القلم للنشر والتوزیع نے اگست ۱۹۹۱ء سے ماہنامہ ''الفلاح'' جاری کیا جو نوید کتاب وسنت بن کر تقریباً تین سال افق صحافت پر جلوہ گر رہا۔اس کے اولین مدیر مولانا سراج الحق سلفی اور معاون مدیر عبد المنان سلفی گونڈوی تھے بعد میں مولانا ابوالعاص وحیدی نے ادارت کی باگ ڈور سنبھالی اور مدیر مسئول کی حیثیت سے عبدالمنان سلفی گونڈوی متحرک وفعال رہے۔یہ ماہنامہ تبلیغی ودعوتی مزاج کا حامل تھا جس میں المرکز الثقافی الاسلامی کی دینی وتبلیغی سرگرمیوں کی رپورٹ بھی شائع ہوتی تھی۔بعض شماروں کے ٹائٹل پر لجنۃ الفلاح الخیریۃ کا نام بھی درج ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نام سے کوئی رفاہی ادارہ بھی قائم ہوا تھا مگر اسکی تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔

ماہنامہ الفلاح بھیکم پور کے قلمی معاونین مین مقامی علمائے اہل حدیث کے علاوہ دوسرے معروف فضلاء،ادیبوں،مصنفین اور قلم کاردانش وروں کے نام ملتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جلد ہی اس رسالہ نے اہل علم اوراصحاب دانش میں مقبولیت حاصل کرلی تھی۔اس فہرست میں جید فضلاء اور بزرگ مصنفین میں سے ڈاکٹر

احتشام احمد ندوی، ڈاکٹر فضل الرحمان مدنی، مولانا عبدالسلام رحمانی، ڈاکٹر عبدالدیان، ڈاکٹر محمد یونس ارشد، شیخ غازی عزیز، مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری، مولانا کمال الدین اثری اور مولانا عبدالحفیظ رحمانی وغیرہ نمایاں ہیں۔

رسالہ میں فقہ وفتاوی کالم کے تحت دینی و مذہبی مسائل پر رہنمائی بھی فراہم کی گئی۔ تنقیح وتوضیح کے کالم میں اوہام وخرافات اور بدعات کے خلاف مضامین بھی اس رسالہ کی زینت بنے۔ پندرہویں شعبان کی رات، تحیة المسجد کے احکام، ماہ رمضان کے مسائل ودلائل (جلد اول، فروری۔مارچ کا مشترکہ شمارہ ۷۔۸) تمبا کو اور اسلام، غیر مسلم کی زمین میں تعمیر مسجد کا حکم (جلد:۱، شمارہ ۹، اپریل ۱۹۹۲ء)، دعائے استلام حجر اسود، مغرب سے قبل سنتوں کی حیثیت (جلد:۱، شمارہ ۱۰، مئی ۱۹۹۲ء)، رسول اکرمؐ کا ریش مبارک تراشنے کا افسانہ، وصیت و ہبہ کے مسائل، دسویں محرم (جلد:۱، شمارہ ۱۲، جولائی ۱۹۹۲ء)، غنا اور سماع (جلد ۲، شمارہ ۹، اپریل ۱۹۹۳ء)، رمضان سے متعلق منتخب فتاوی (جلد:۳، شمارہ ۷۔۶، جنوری وفروری ۱۹۹۴ء)، قبرستان کی خرید وفروخت (جلد ۳، شمارہ ۵، دسمبر ۱۹۹۳ء) وغیرہ مضامین ومقالات فقہی نوعیت کے ہیں جن میں قرآن واحادیث کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

بعض مضامین تنقیدی نوعیت کے ہیں۔ڈاکٹر محمد یونس ارشد (ج:۱، شمارہ ۱۲، جولائی ۱۹۹۲ء) کو شکایت ہے کہ اہل حدیث علماء اور ارباب مدارس عام طور پر تجوید وترتیل سے تساہل اور غفلت برتتے ہیں ’’بڑے بڑے مدارس، معاہد اور جامعات سے لوگ فارغ التحصیل ہوکر آجاتے ہیں لیکن انھیں قرأت قرآن کا سلیقہ نہیں

ہوتا''۔آخر میں وہ اپیل کرتے ہیں ''کیا میں علمائے کرام اور اساتذۂ مدارس سے گذارش کرسکتا ہوں کہ اگر انھیں فروعی اختلافات ونزاعات سے فرصت ملے تو اس اہم اورضروری فن کی طرف اپنی توجہات عالیہ مبذول فرمالیا کریں اوراسلامی سماج ومعاشرہ میں کتاب اللہ کوصحیح پڑھنے کی تعلیم دیں''۔(ص ۳۵)

مولانا ابوالعاص وحیدی اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں علمائے کرام کو آئینہ دکھاتے ہیں جوموجودہ دور میں بڑی آزمائش سے دوچار ہیں۔فاضل مضمون نگار کوشکوہ ہے (جلد ۳ ،شمارہ ۵،دسمبر ۱۹۹۳ء) کہ علمائے دین میں صالحیت ہے تو صلاحیت کافقدان ہےاوراگروہ صالح ومتقی ہیں تو ان میں غیرت وخودداری اور جرأت کی کمی ہے۔چنانچہ ''آج وہ اصحاب دولت وثروت کی جوتیاں سیدھی کرنے میں لگے ہوئے ہیں''۔کل ان کے ہاتھوں میں زمام قیادت تھی آج وہ ''جاہل نظمائے مدارس اوردوسرے ارباب جاہ واقتدار کی چشم وابرو کے غلام ہوگئے ہیں''۔''اسی بزدلانہ کردار کے نتیجہ میں اصحاب مدارس ان کا اس طرح سے استحصال کئے ہوئے ہیں کہ ان کے ساتھ غلاموں جیسا برتاؤ کرتے ہیں اوران کے ذہن ودماغ ،زبان وقلم اورحرکت و نشاط پرحکمرانی کرنا چاہتے ہیں''۔(ص ۱۰)

ایڈیٹرسراج الحق سلفی جرأت رندانہ سے کام لیکر (جلد ۱،شمارہ ۷۔۸،فروری۔ مارچ ۱۹۹۲ء) جمعیۃ اہل حدیث کوخوداحتسابی کی دعوت دے بیٹھتے ہیں کہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء تک آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس دین وملت کی خدمت گذاری میں مصروف رہی ،مگر ''اب تحریک کا جیتا جاگتا پیکر بےتوفیقی کی سردلاش میں تبدیل'' ہوچکا ہے۔

آج اس کے پاس ''نہ ضروری لٹریچر ہے نہ نصابی کتب''، ''نہ وسیع النظر اور وسیع المطالعہ تحریکی افراد ہیں''۔ وہ غیر مسلموں میں تبلیغ و دعوت کے وسائل سے محروم ہے۔ ''نوجوانوں کی دعوتی و ثقافتی تنظیم'' سے وہ قاصر ہے اور بس ''کاغذی پروگرام'' بنانے میں مصروف ہے۔ یہ اکابر ''خود پرستی، مفاد پرستی، جتھہ بندی اور انا کے سوالات'' حل کرنے میں مصروف ہیں۔ فاضل مدیر بڑے اخلاص، دردمندی اور سوز کے ساتھ اکابر وقائدین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ''ذاتیات'' سے بلند ہوں۔ ''مصنوعی خول'' سے باہر نکلیں اور قدم سے قدم ملا کر اقدام کریں۔ (ص ۸۔۱۱)

رسالہ کے دو مستقل کالم الکتاب اور السنۃ کے ہیں۔ اول الذکر میں قرآن کریم کی کسی آیت کی تفسیر اور آخر الذکر میں کسی حدیث کی تشریح ہوتی ہے۔ ان میں مشکل الفاظ کی لغوی تحقیق، آسان اور عام فہم ترجمہ اور مختصر مگر تعمیری و اصلاحی اور دلنشین تفہیم ہوتی ہے۔ فقہی اور قانونی تشریحات سے عام طور پر پہلوتہی ہے۔ مقصد عام مسلمانوں کو قرآن و سنت کی تعلیمات سے آگاہ کرنا ہے۔ انداز و اسلوب سادہ مگر مؤثر ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجلس ادارت کو ملی مسائل سے دلچسپی ہے، نہ ملکی و قومی فرائض کا بہت زیادہ شعور ہے۔ مئی ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں جہاد افغانستان پر ایک مضمون شامل ہے اور دسمبر ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں صوبہ اتر پردیش کے اسمبلی الیکشن کے نتائج پر ایک مختصر تبصرہ موجود ہے۔ جب کہ اسی مضمون میں مدیر کو شکایت بھی ہے کہ مسلمانوں کے مختلف مکاتب فکر کی دینی و ملی تنظیمیں اس الیکشن میں بالکل خاموش رہیں۔ (ص ر ۷) وجہ ظاہر ہے علمائے کرام اور دینی ادارے اور انکے ترجمان، رسالے اور

جرائد ملی مسائل کو محض سیاست کی کارستانی سمجھ کران سے چشم پوشی کر جاتے ہیں اور نتیجہ کے ذمہ دار سب قرار پاتے ہیں۔

اہل حدیث رسائل و جرائد کا یہ قدرے تفصیلی تجزیہ بتاتا ہے کہ ہند و نیپال کے سرحدی اضلاع سے شائع ہونیوالے سلفی جرائد و رسائل کی نوعیت، انکا مجموعی مزاج، انکے مشمولات اور انکی ادبی قدر و قیمت اور فکری حیثیت کیا ہے۔اس تجزیہ سے درج ذیل نتائج نکلتے ہیں:

> ''زبان و ادب اور فکر اسلامی کی توسیع و استحکام میں اس خطہ کا حصہ ملک کے دوسرے خطوں سے کم نہیں ہے ۔ اگر دوسرے مکاتب فکر کی خدمات بھی اس میں شامل کر لی جائیں اور مدارس و جامعات اور علماء و فضلاء کے کارناموں کو بھی شمار کر لیا جائے تو ایک دائرۃ المعارف وجود میں آجائے۔کاش کوئی باہمت ، حوصلہ مند اور صاحب علم فرد آگے بڑھے اور علاقہ کے مخیرّ حضرات اس میں تعاون کریں اور اسے فرض کفایہ سمجھ کر دلچسپی لیں تو یہ علمی و تحقیقی منصوبہ چند سالوں میں مکمل ہوسکتا ہے۔شرط ہے سلیقہ و متانت سے غیر جانبداری کا ثبوت دیکر تمام مکاتب فکر کا تعاون حاصل کرنے اور سب کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا تجزیہ کرنے کی۔

اس خطہ نے علم و تحقیق اور صحافتی معروضیت کا بھی کسی قدر

خیال رکھا ہے۔حالات کے دباؤ میں بسا اوقات نزاعی وفروعی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں، جن سے دامن بچانے کی سخت ضرورت ہے۔اور جس کا شدید احساس نئی نسل کے قلم کاروں کو ہے۔عام طور پر مثبت اور تعمیری واصلاحی طرز فکر اختیار کیا گیا ہے۔

ان علاقوں میں علم وادب اور تحقیق وتصنیف کا مزاج بنانے اور سنوارنے میں رسائل وجرائد نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ان میں سے بعض رسالوں کے خریداروں کی فہرست بتاتی ہے کہ ملک کے معتدبہ حصوں میں ان کے باذوق قارئین بکھرے ہوئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دائرہ اثر ملک کے کم وبیش تمام صوبے ہیں۔‘‘

(نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں مولانا محمد رفیق سلفی مدیر ’’الصفا‘‘ نے کافی مدد کی ہے۔بیشتر رسائل وجرائد کی فائلیں آپ ہی نے مہیا کی ہیں۔راقم اس کے لئے انکا ممنون ہے)۔

☆☆☆☆☆
☆☆☆

مولانا عبدالماجد ندوی
مظفرنگر

اردو زبان وادب کی تشکیل میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کا حصہ

زبان ثقافت کا نمائندہ ہوتی ہے، وہ اپنے اندر علوم ومعارف کا ایک بحر بیکراں رکھتی ہے، لیکن آج دنیا کا یہ عجیب المیہ ہے کہ زبان اور ادب کو لوگوں نے صرف اظہار خیال اور تفریح طبع کا ذریعہ بنالیا ہے، اور اس کے مادی پہلو کو پیش نظر رکھکر اسکی افادی اور معنوی گوشہ سے یکسر رہے، اردو زبان وادب کی تشکیل میں ہندوستان کے مختلف علاقوں نے کیا حصہ لیا ہے، اور اس سے کیا معنوی اور اندرونی گوشے نمایاں ہوتے ہیں اس پر روشنی ڈالنے کی جرأت کی جارہی ہے، تاکہ اردو ادب کو خاص طور سے تفریح طبع کا سامان نہ بناکر مثبت اور صالحہ افکار کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ

اردو زبان وادب کا اصل سرچشمہ فارسی و عربی ادب ہے۔

اردو زبان جب ہندوستان میں وجود پزیر ہوئی ۔ اس وقت اس کی ہم عصر مقامی لسانیات اور بولیوں میں کوئی بڑا ادبی سرمایہ موجود نہ تھا لیکن جہاں تک سنسکرت زبان کا تعلق ہے۔ سنسکرت زبان کے پاس، بھاری بھرکم ادبی سرمایہ ضرور موجود تھا۔ ہندوستان میں اسلامی تہذیب سے یہاں کی مقامی تہذیبیں متاثر ہوئیں اور اسلامی تہذیب نے بھی مقامی اور علاقائی تمدنی ذخیرہ کے صحت مند اجزاء کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اردو ادب کو اپنے عہد آغاز میں فکر ونظر کا یہی ذخیرہ حاصل ہوا چنانچہ سترہویں صدی، اور اٹھارہویں صدی میں، مذہبی عقائد و یقینیات کو اس نے اپنا اصل سرچشمہ تسلیم کیا، انیسویں صدی میں انگریزی اقتدار کی وجہ سے لوگوں کے نظریات میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے دہلی کالج تک ذہن و دماغ میں مختلف تغیرات رونما ہوئے، انیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو ادب نے وکٹوریا عہد کے انگلستان کی ادبی قدروں اور انداز غور وفکر کے اثرات قبول کئے۔ (پیش رفت جون ۲۰۰۴ء ص ۸)

اردو کی جائے پیدائش کے بارے میں ماہرین لسانیات کی آراء اگرچہ مختلف ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ اردو کا جنم ہندوستان ہی کی سرزمین پر ہوا ہے مختلف قوموں کے درمیان صدیوں کے آپسی میل جول کے نتیجہ میں عالم وجود میں آئی اور کئی صدی تک بلاتخصیص مذہب وملت اہل ہند کے دلوں پر حکمرانی کرتی رہی آج بھی ملک

میں رہنے بسنے والے تقریباً اسی فیصد عوام کے لئے اردو ہی اپنی مختلف شکلوں میں رابطہ کی زبان کا کام انجام دے رہی ہے۔ اردو کی اس وسعت اور عوامی مقبولیت کی وجہ سے اہل اردو پر ضمیر وطن کو جگانے زبان کی جو ذمہ داری عائد ہوتی تھی اردو کے شاعر اور صحافی جس خوبی سے اسے نباہ رہے ہیں وہ بلا شبہ تاریخ لسانیات کا ایک روشن باب ہے۔ (ہندوستان اور مسلمان سہ ماہی حرا کا خصوصی شمارہ حیدر آباد ص ۱۰۸)

داغ کا یہ شعر اپنی حقانیت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے:

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

مسلمانوں نے جس وقت ہندوستان میں قدم رکھا۔ اس وقت یہاں ہندی نام کی کوئی زبان نہیں تھی اس وقت مسلمان ہندوستان کی ہر زبان کو ہندی کہتے تھے۔ اردو زبان کو وجہی نے اپنی کتاب ''سب رس'' میں ۱۶۳۰ میں ''زبان ہندوستان'' لکھا ہے۔ ڈاکٹر گل کرائسٹ نے ۱۸۷ا ء میں ہندی کے ذو معنی سے جو زبان تیار ہوئی اس زبان کو ہندوستان کا نام دیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر گل کرائسٹ کی مراد اس سے اردو زبان ہی ہوگی۔ ہندوستانی زبان کا جو نمونہ مسٹر بیلی نے پیش کیا ہے اس سے تو غلط فہمی کی گنجائش ہی نہیں رہتی انہوں نے لکھا ہے کہ ہندوستانی زبان جس کا ذکر میرے دعوی میں ہے اس کو ہندی اردو اور ریختہ بھی کہتے ہیں، یہ عربی فارسی اور سنسکرت سے مرکب ہے، ریختہ کا لفظ اس وقت پیدا ہوا جب اردو میں ادبی

شان پیدا ہو چکی تھی پھر جب اردو زبان کی اصطلاح عام ہوگئی تو یہ لفظ متروک ہو گیا ہندوستان کی دوسو مختلف النوع زبانوں اور بولیوں میں سے جن چودہ زبانوں کو بڑی بڑی زبانوں کے طور پر قانون کے شیڈول کے تحت تسلیم کیا گیا تھا، ان میں اردو، بنگالی، گجراتی، ہندی، کنٹر، مراٹھی، اڑیا، پنجابی، تیلگو، سنسکرت، زبان کے نام شامل ہیں، چونکہ ہندی زبان کو ملک کی دفتری زبان مشتہر کر دیا گیا ہے جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے اردو زبان جو ہندوستان کی چودہ زبانوں میں سے ایک ہے، قومی سطح پر ایک معقول زبان ہے۔ بہر صورت یہ شمالی مرکزی اور مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی کے بڑے حصہ کی مادری زبان بھی ہے، ہم اس بات کو بھی صراحت کے ساتھ پیش کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ مغلیہ سلطنت کی توسیع کیساتھ اردو زبان پھیلنا شروع ہوئی، دکن اور بنگال جیسے دور دراز علاقوں میں جڑ پکڑنے لگی اردو کی اصل شکل اس کی ارتقاء کے ابتدائی مراحل غیر واضح ہے بعض ماہرین لسانیات یہ خیال کرتے ہیں کہ ۱۰۲۷ء میں محمود غزنوی کے ہاتھوں پنجاب پر تسلط کے ساتھ دہلی کے اردو بولنے والوں کا مرکز بننے سے پہلے ایک مخلوط زبان عالم وجود میں آنے لگی تھی، بہر حال حقیقت خواہ کچھ بھی ہو، وقت کے ساتھ ساتھ اردو نہ صرف عدالتی زبان بنی بلکہ اس کا شمار ہندوستان کی دوسری علاقائی زبانوں کے بالمقابل ترقی یافتہ اور کثیر آبادی میں بولی جانے والی زبانوں میں ہونے لگا اس نے اپنا ایک الگ ادبی سرمایہ پیدا کیا، اور ہیئت اور مواد دونوں اعتبار سے صحیح معنوں میں ہندوستانی زبان بن گئی، ملک کے طول وعرض میں اس

کے مختلف ادبی دبستان قائم ہوگئے جن میں دہلی لکھنؤ حیدرآباد پٹنہ اور مرشد آباد کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

دبستان لکھنؤ میں اردو

چودہویں صدی، یہ زمانہ لکھنوی تہذیب کے عروج کا تھا اور شمالی ہندوستان میں لکھنوء کا طوطی بولتا تھا اور اس میں شبہ نہیں کہ لکھنؤ والوں نے اردو کی بڑی خدمت کی ،لہذا اردو کی ٹکسال بھی لکھنؤ ہی میں قائم ہوئی ،لیکن لکھنؤ میں اردو زبان کی اصلاح اور ترقی کا باقاعدہ آغاز آصف الدولہ کے زمانے میں ہو چکا تھا ، جو اپنی فیاضی اور علمی دوستی میں ممتاز تھے ان کو اردو زبان سے بہت دلچسپی تھی ،آصف الدولہ کی والدہ بہو بیگم ایک علم دوست خاتون تھی اردو سے ان کو بھی بہت محبت تھی ،انہونے اردو زبان کی حفاظت اور ترقی کے لئے ایک ادارہ قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو محاورات کا ایک مجموعہ مرتب کر دیا جائے ،اس کے لئے باقاعدہ ایک دفتر قائم کیا گیا رجسٹر رکھے گئے جس میں متعدد محاورات درج ہوتے تھے ان کی صحت کی جانچ کی جاتی تھی پھر وہ عام استعمال کے لئے شائع کئے جاتے تھے ،اسطرح لکھنوء میں اردو زبان پروان چڑھی یہی وجہ ہے کہ آج بھی لکھنوء کی تہذیب وثقافت مشہور ہے۔(از اردو ادب کی تاریخ مرتب عظیم الحق جنیدی ،ص ۲۰۹)

یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان اپنے تشکیلی دور سے لیکر دور عروج تک اور دور عروج

سے لیکر موجودہ دور تک کسی بھی سطح پر ہندوستانی ماحول معاشرے اور مشترک مزاج اور سماج سے بے نیاز نہیں ہوئی اردو شروع ہی سے سب کے ساتھ ملکر اور سب کو ساتھ لیکر چلتی رہی ہے اس کے مزاج اور خمیر میں یہ بات شامل ہے اس کے تشکیلی عناصر ہی ہندو مسلم ہندی اور ہندوستانی ہے یہ اخوت ومحبت کی زبان ہے ،اور اتحاد واتفاق کی علامت بھی ،وطن دوستی وطن پرستی مساوات رواداری اور قومی یکجہتی کی ضمانت بھی ،اس کا ادب اس کی شاعری اس کی ترجمان ہے مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالستار دلوی لکھتے ہیں:

> ''اردو زبان ابتداء ہی سے ہندوستان کی ملی جلی تہذیبی زندگی کی آیئنہ دار رہی ہے،لسانی سطح پر ہندوستانی اور ہند ایرانی فضاء میں اس نے سانس لینا شروع کیا اور ادبی اعتبار سے بھی ہندوستانی طرز فکر اور اسلوب واصناف کیساتھ ایرانی روایات اور طرز اسلوب سے اپنے دامن کو وسیع کیا۔'' (اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات ص ۸۴۔۸۵)

چونکہ اردو ادب نے اپنی ادبی عمارت کی بنیاد ہندوستان کی سرزمین پر قائم کی ،اردو اپنی اصل روح کے اعتبار سے خالص ہندوستانی زبان ہے اس کی تعمیر وتشکیل سر زمین ہند پر ہوئی، اس نے اپنا تمام ادبی سرمایہ یہی سے حاصل کیا یہاں کی مقامی روایات، معاشرتی اقدار، ماحول، تہذیب وتمدن، مذہبی تصورات ہندو فلسفہ اور دیو مالائی کرداروں نے اردو کی لفظیات کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا، مقامی افراد نے

چاہے وہ سادھو ہوں پیر وفقیر ہوں علماء وصلحاء ہوں ان سب نے اس کی دامن کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی یہاں کی بو باس اور مقامی خصوصیات اردو کی گھٹی میں شامل ہوگئیں، اور لہو کی گردش کی طرح اردو زبان کی عمومی مقبولیت میں یہی عنصر کام کرتا رہا، اس طرح اردو کے توسط سے ہندوستانی افق پر ایک جدید تہذیب کا ظہور ہوا جس میں قدر و مشترک خود اردو تھی، اردو قومی وحدت کی علامت بنکر نمودار ہوئی۔ (اازاردو شاعری میں اسلامی تلمیحات ص ۷۹۔۸۰)

دبستان دہلی میں اردو

درحقیقت اردو دہلی و میرٹھ کی زبان ہے، اس کے لئے ثبوت کی ضرورت نہیں، مولانا محمود شیروانی کو بھی ماننا پڑا کہ اردو جس زبان سے ارتقا پاتی ہے وہ دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی زبان کا مولد وہی ہوتا ہے جہاں بلا شرکت غیرے بولی جائے پنجاب، اودھ، دکن، بہار، گجرات، ممبئی وسط ہند جہاں کہیں اردو کا سکہ چلتا ہے ، اردو کے پہلو بہ پہلو دوسری زبانیں بھی ہیں اور کہیں اردو تہذیبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔لیکن یوپی کے مغربی اضلاع میں اردو کے سوا دوسری زبان نہیں، صرف اردو ہے جو شہریوں اور دیہاتیوں میں بولی جاتی ہے یوپی کے مغربی اضلاع میں ہندو مسلم اکثر و بیشتر سب اردو بولتے ہیں، وہ ہند کی زبان بھی ہے اور مسلمانوں کی بھی، دیگر مقامات میں صرف مسلمانوں کی زبان ہے مسلمان اردو بولتے ہیں ہندو مقامی زبان استعمال کرتے ہیں مثلا تامل کے علاقہ میں مسلمانوں کے گھروں میں اردو بولی جاتی

ہے یا زار اور ہارٹ میں بدستور تامل کا سکہ چلتا ہے۔ (حوالہ داستان زبان اردو ص ۹۳۔۹۴ بحوالہ نقش ادبی معرکے ص ۲۲۲)

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بھی یہی فیصلہ صادر فرمایا ہے اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے نواح دہلی کی بولیاں اردو کا اصل منبع اور سرچشمہ ہیں اور حضرت دہلی اس کا صحیح مولد و منشاء۔ (مقدمہ تاریخ زبان ص ۳۰۶)

مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ بات بہت وضاحت سے سامنے آجاتی ہے کہ اردو کی اصل جائے پیدائش دہلی اور اس کے اطراف کا علاقہ ہے، ماہرین لسانیات اور زبان و ادب کے مورخین کے درمیان صرف حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے مسئلہ کا متفقہ حل پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور مختلف آراء و نظریات کے درمیان باہم تطبیق واشتراک کی شکل پیدا کی ہے سید سلیمان ندوی رسالہ معارف ۱۹۳۳ء میں رقمطراز ہیں:

''موجودہ معیاری اردو دہلوی زبان دوسری زبانوں سے ملکر بنی ہے آج کل بعض فاضلوں نے پنجاب میں اردو بعض اہل دکن نے دکن میں اردو اور بعض عزیزوں نے گجرات میں اردو کا نعرہ بلند کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر ممتاز صوبے کی مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے ان سب کا نام اردو رکھدیا گیا **(ماہنامہ معارف جولائی ۱۹۳۳ ص ۱۰)**

لکھنؤ کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے

ہیں، کہ دلی کے باغ میں جب خزاں آئی تو یہاں بہار کا موسم آیا اس اجڑے باغ کے مرغ خوش لحن تھے جنہوں نے اڑ اڑ کر اس چمن پر بسیرا لیا ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی نشو نما دکن میں پایا تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی لیکن تہذیب اور سلیقہ لکھنوء میں سیکھا۔ (علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت وادبی خدمات ص:۱۴۱۔ نقوش سلیمانی از سید سلیمان ندویؒ ص ۹ بحوالہ اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات ص ۶۰۔۶۱)

شاہ جہاں کے دہلی آنے کے بعد زبان دہلوی کا نشاۃ ثانیہ شروع ہوتا ہے جس کی تکمیل اورنگ زیب کے عہد میں ہوتی ہے اورنگ زیب کے آخری دور میں اورنگ آباد اور دہلی کے درمیان لسانی رشتے بہت گہرے ہو گئے تھے، اٹھارہویں صدی کے آغاز تک زبان دہلوی نے اودھی اور برج کو ٹکسال باہر کر دیا اور دوسری طرف بدیسی فارسی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دہلی شہر میں اردو کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ اس وقت ہوئی جب دکنی قافلہ جوق در جوق اپنے ادبی سرمایہ کو لیکر دہلی پہونچا، ۱۷۱۵ء میں فائز نے اپنا دیوان مرتب کیا ان کے کلام میں اس کی شہادت ملتی ہے کہ دہلی کی زبان اور انداز بیان پر ولی کا سکہ بیٹھ چکا تھا، لیکن جلد ہی دکنی زبان کے خلاف ردّ عمل شروع ہو گیا، اس تحریک کی قیادت کا سہرا مرزا جان جاناں مظہر کے سر رہا۔ (اردو ادب کی تاریخ مرتبہ عظیم الحق جنیدی ص ۲۱)

دبستان دکن میں اردو

دکن جنوبی ہند کے بڑے حصے کرناٹک آندھرا پردیش، اور مہاراشٹر، میں بولی جانے والی اردو زبان کو دکنی سے موسوم کیا جاتا ہے، اصلایہ اردو ہی ہے لیکن اپنی بعض خصوصیات تلفظ ادائیگی لہجے اور بعض قواعد میں یہ شمالی ہند کی اردو سے مختلف اور مستقل بالذات، ہے اس فرق کے اظہار کے لئے اسے باقاعدہ دکنی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر گیان چندر جین دکنی اردو کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"دکنی اردو کی ایسی بولی ہے جو زمان اور مکان دونوں کے تفاوت کی آفریدہ ہے، ادبی دکنی اور شمالی ہند کی اردو میں علاقائی بعد بھی ہے زمانی بعد بھی، دکن مقدم ہے اور شمالی اردو مؤخر اردو اور دکنی کا یہی تعلق ہے کہ دکنی اردو کی ایک پارینہ بولی ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ دکن میں اردو علاءالدین خلجی کے توسط سے پہونچی، محمد تغلق نے جب دہلی سے کوچ کیا اور دولت آباد کو پائے تخت بنایا تو دہلی کی بڑی آبادی کو وہاں منتقل کردیا ،اس کے بعد اردو زبان خوب پروان چڑھی اور تیزی سے پھیلی ،تغلق زیادہ طویل عرصہ تک یہاں ٹھہر نہ سکا اور دہلی کی طرف مراجعت اختیار کرلی ،اس کے بعد اس کی حکومت بھی زیادہ دنوں

تک قائم نہ رہ سکی اس کے ماتحت ظفر خاں نے بغاوت کر کے آزادی کا اعلان کردیا ،اس نے بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی وہ ساڑھے تین سو سال تک تقریبا قائم رہی ،اس کے دور میں اردو خوب پھلی پھولی سبز زار رہی اور مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لی دکن میں اردو کے فروغ کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ بہمنی امراء نے اردو کی یہاں تک سرپرستی کی کہ اس زبان کو دفتروں کی سرکاری زبان قرار دے دیا، اردو زبان وادب نے تقریبا تین سو سال تک جتنی ترقی دکن میں کی اس کی نظیر پورے ملک میں نہیں ملتی اس لئے دکن کے لوگ اگر یہ دعوی کرتے ہیں، کہ انہوں نے اردو کو نکھارا، سنوارا اور اس میں ادبی شان پیدا کی تو ان کا یہ دعوی غلط ثابت نہ ہوگا۔(اردو شاعری میں اسلامی تلمیحات ص ۴۷۔تا۔۵۰)

چونکہ زبان وادب ملتوں اور قوموں کی شناخت فراہم کرتے ہیں، آج کے اردو ادب کو اگر جدید عہد کے سائنسی مزاج کا لب ولہجہ ملے، تعقل اور سنجیدگی کا وقار ملے ،گونا گوں تجربوں کی شرکت کا رنگ وآہنگ ملے، زمین کی خوشبو اور لوک کلچر کا رنگ اور عالمی کلچر کی پرواز میسر ہو، تبھی وہ صحیح معنوں میں آج کا ادب ہو سکے گا، اور اس کے الفاظ وتراکیب ادبی اسالیب اور طرز بیان پر سے وہ مصنوعی تہیں اتر سکے گی، جو محض چند گزرے ہوئے ادوار کی خوشگوار یادو کی نشانی ہیں، یا پھر مخصوص طبقوں سے وابستگی کا

ثبوت، یہ اردو ادب سے محض آج کا مزاج اور آج کے دور سے ہم آہنگ ہونے کا مطالبہ ہوگا، جس کے بغیر خطرہ ہے۔ کہ ہم زمانہ کے ہمرکاب نہ رہ سکے، اور ماضی کی یاد بن کر رہ جائیں۔ (اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ از پروفیسر محمد حسن ص۔۴۰)

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، کہ ہندوستان میں اردو زبان مسلمانوں ہی کے وجود سے ہے، تو اس کو دوسرا زاویہ دینا اور اسکی اسلامیت سے سرمو انحراف کرنا سراسر عدم انصاف پر مبنی ہے، الحمدللہ عالمی رابطہ ادب اسلامی نے اس سلسلہ میں جو پیش رفت کی ہے، ہمیں اس عظم کو سامنے رکھتے ہوئے قدر کی نگاہ سے دیکھنی چاہئے اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے۔